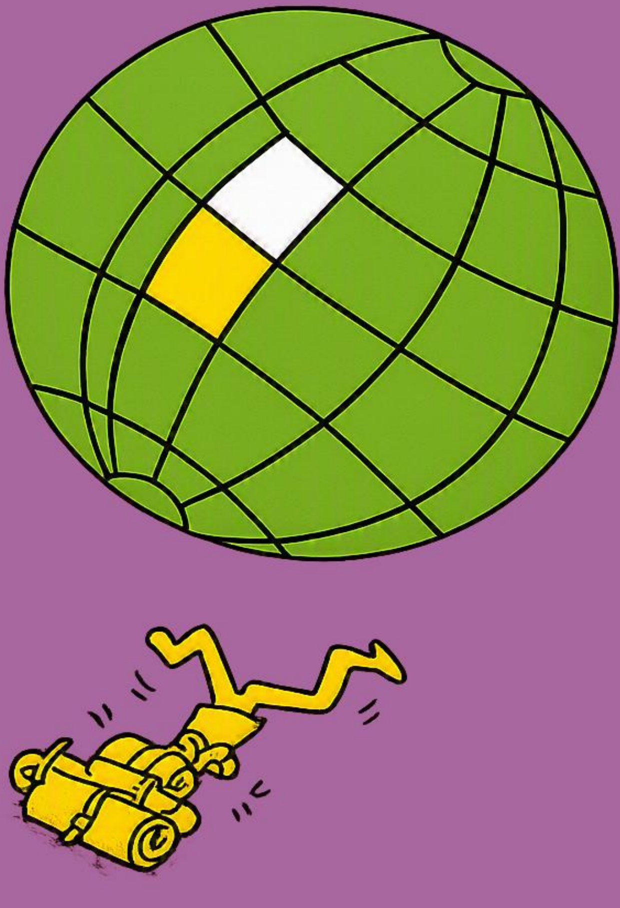
دنیا گول ہے

سفرنامہ

ابن انشا





جمشید انصاری کے کارٹونوں کے ساتھ

دنیا گول ہے

زیدی کے کارٹونوں کے ساتھ

ابنِ انشا

لاہور اکیڈمی

چوک اُردو بازار لاہور

طبع اوّل : جون ۱۹۷۲

طبع دوم : اپریل ۱۹۷۴

طبع سوم : مارچ ۱۹۷۶

طبع چہارم : جنوری ۱۹۷۸

طبع پنجم : نومبر ۱۹۷۸

طبع ششم : مئی ۱۹۸۰

طبع ہفتم : جولائی ۱۹۸۱

طبع ششم : نومبر ۱۹۸۶

فہرست

آوارہ ترِ بادا

ہماری آوارہ گرد کی ڈائری ہماری اپنی ذات کے بر عکس خاصی مقبول ثابت ہوئی۔ پانچ مہینے میں پہلا ایڈیشن نکل گیا اِس کا اثر مُختلف لوگوں پر مُختلف ہوا۔ بعضوں نے اِسے پڑھتے ہی رختِ سفر باندھا، ٹکٹ کٹایا، بیوی بچّوں کی بلائیں لیں اور آنسو پی کر یورپ روانہ ہوگئے کہ ادوائن کی رسّی سے کھُلنے والے ہوٹلوں اور اُن کے حمام باد گرد غُسل خانوں کی زیارت کریں۔ بعضوں نے کہا کہ تھوڑے دِل والے تھے اور مُہم آزمائی کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اپنا لپٹا ہوا بستر گول کر دیا کہ اگر پردیس میں یہی کُچھ ہوتا ہے تو ہم سیاحت سے بھر پائے۔ حتّٰی کہ بعض ٹریول ایجنسیوں کے کاروبار پر زد بھی پڑی اور اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ اِس کتاب پر پابندی لگائی جائے۔ بیرونی ممالک میں جِن ہوٹلوں اور شہروں کا ازالہ حیثیت عُرفی ہمارے قلم سے ہوا اُنہوں نے بھی احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ مصنّف کو کوئی اور سزا نہیں دی جاتی تو کم از کم اتنا کیا جائے کہ اِس کتاب کا کسی مہذّب یعنی یورپ کی کسی زبان میں ترجمہ نہ چلنے دیا

جائے۔ چونکہ یُوں بھی کوئی مترجم اِسے کسی زبان میں ترجمہ کرنے اور کوئی پبلشر اِسے چھانے کو تیّار نہ ہو رہا تھا لہٰذا ہمیں یہ مطالبہ ماننے میں زیادہ دقّت نہ ہوئی۔ خود ہم نے اپنی تمام کتابوں کے حقوق ترجمہ جو اپنے حق میں محفوظ رکھے ہیں اور کسی کو ترجمہ کرنے یا چھاپنے کی اجازت نہیں دیتے تو اِس میں بھی ایک حکمت تھی۔ ہمارے چین کے سفر نامے کی شہرت سُن کر خان صاحب یعنی ہمارے وفد کے لیڈر پرنسپل ابراہیم خان ڈھاکے سے فرمائش ہی کرتے رہ گئے کہ ہمیں بھی دکھاؤ تُم نے ہمارے بارے میں کیا لکھا ہے۔ چونکہ دیرینہ اور مُخلصانہ تعلّقات کو ختم کرنا مقصود نہ تھا لہٰذا ہم نے انہیں بتایا کہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا۔ آئندہ ایڈیشن کی سب سے پہلی جلد آپ کی نذر کی جائے گی۔ پوچھئے تو ہم بین اللّسانی ترجموں کے اصولی طور پر خلاف ہیں۔ خود پرنسپل ابراہیم خان نے جو اِسی سفر کا سفر نامہ بنگلہ میں لکھا تھا اُس ایک حصّہ ہم نے پڑھوا کر سنا۔ ہمارے اخلاق اور شرافت اور عالی دماغی کی بہت تعریف کی گئی تھی اور آخر میں لکھا تھا کہ ابن انشا صاحب کی تحریر بڑی پُرلُطف ہوتی ہے۔ اِن کو بلاشُبہ اُردُو کا مُلّا دوپیازہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ زرّیں رائے کسی اُردُو والے کے ہاتھ لگ جاتی تو۔۔۔۔

جب ہم دُنیا کے گِرد سفر پر روانہ ہوئے تو ہمیں معلوم تھا کہ دُنیا گول ہے اِس لئے

ہمارے سر ورق کے آرٹسٹ کی طرح ہمیں بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اپنے بستر اور سوٹ کیس سمیت اُلٹے خلا میں نہ گِر جائیں۔ ہمیں اپنی فکر تو کم تھی کیونکہ ہم تو گِرتے ہی رہتے ہیں، سامان کا خیال زیادہ تھا۔ غنیمت ہے کہ سلامتی سے واپس آ گئے۔ قاعدے سے صرف اِس ایک سفر کی روداد پر بھی دُنیا گول ہے کا سرنامہ لگ سکتا تھا۔ لیکن کُچھ فالتو سفر بھی ہم نے کر رکھے تھے۔ وہ بھی اِس میں ملا دیئے ہیں تو ہماری آوارگی ہمارے ۱۹۶۱ء کے سفر یورپ سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۶۳ء میں ہم ایران سے فارسی بولتے اور ۱۹۶۴ء میں لنکا سے وہاں کی ملاحت باتوں پر جان چھِڑکتے لوٹے تھے۔ لیکن ۱۹۶۶ء ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء ہمارے لئے سیاحت کے بھر پور سال تھے۔ پُورب اور پچھّم ہماری وحشت کا صحرا تھے۔ اِنہی سالوں میں ہمارے دوستوں نے بھی مشہور کیا تھا کہ پاکستان تو ہم کبھی کبھی آتے ہیں، وہ بھی صرف حجامت کرانے اور کپڑے دُھلوانے کے لئے کیونکہ دوسرے ملکوں میں اِن کاموں کی اُجرت زیادہ ہے۔

۱۹۸۸ء میں ہمارا پہلا سفر چین کا تھا۔ چین اپنی ذات سے ایک دُنیا ہے۔ اگرچہ اتنی زیادہ گول نہیں ہے اِس کی روداد سے ہم شتابی سے فارغ ہوئے بلکہ چلتے ہو تو چین کو چلیے کا چوتھا ایڈیشن حال ہی میں آیا ہے۔ اِس سفر میں تنہا نہ تھے سارسوں کے ایک

قافلے کے رُکن تھے۔ سارسوں کا لفظ تو یونہی لکھا گیا مطلب ادیبوں سے ہے۔ چین سے لوٹے تو مئی ۱۹۶۶ء میں جاپان روانہ ہو گئے۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ بس ایک ہفتے کا فصل میں رہا ہو گا۔ جاپان یونیسکو کے مہمان تھے۔ اِس سفر کا ٹوکیو کا باب تو اِس سفر نامے میں شامل نہیں لیکن ہانگ کانگ کا احوال ضرور شامل ہے۔

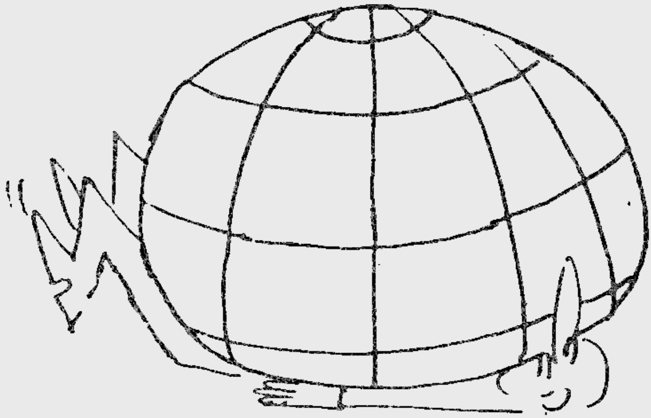
۱۹۹۷ء ہی کی جولائی میں ہم نے انقرہ کی ایک کانفرنس میں مُلک کی طرف سے شرکت کی اور اِسی سال کے ستمبر میں ہمارا تین ماہ کا تربیتی دورہ ہمیں یورپ اور مشرق وسطیٰ لے گیا جس کی روداد "آوارہ گرد کی ڈائری" میں آئی ہے۔ ۱۹۶۸ء کے اپریل میں ہم کوالالمپور میں دیکھے گئے۔ ستمبر میں یونیسکو کے ایک جلسے کے لئے سنگاپور میں تھے اور نومبر میں سچ مُچ دُنیا کی گولائی ناپنے پر نکل گئے۔ اِس سفر نامے میں اُس کی داستان ادھوری ہے۔ سان فرانسسکو پر ختم ہو جاتی ہے حالانکہ اِس کے بعد کئی پڑاؤ پڑے۔ شکاگو، سینٹ لوئی، واشنگٹن اور نیویارک اور وہاں سے زقند بہ زقند سویڈن اور تُرکی۔۔۔ تُرکی میں اب کے انقرہ کے علاوہ مولانا روم کے شہر قونیہ کی زیارت کا بھی موقع ملا اور ہم نے درویشوں کا روایتی رقص بھی دیکھا۔

اس سفر کی داستان ادھوری کیوں رہی، یہ بھی سُن لیجئے۔ ہم ابھی کراچی سے چل کر

سنگا پور پُہنچے تھے کہ صدر ایّوب خاں کا راج سنگھاسن ڈانوا ڈول ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ جلسے جلوس، ہڑتالیں، مظاہرے وغیرہ۔۔۔ ہمارے امریکہ پہنچنے تک اِن میں ایک شدّت پیدا ہوئی کہ ہمارے رفیقِ سفر فضل الباری صاحب کی بھوک اُڑ گئی کہ وہ باقاعدہ صاحبِ فراش ہو گئے۔ وہ مشرقی پاکستان کے وزیرِ صحت تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ایّوب خاں نہیں رہے گا تو مُنعم خان بھی نہیں رہے گا اور مُنعم خاں نہیں رہے گا تو ہم بھی نہیں رہے گا۔ ہمارا منسٹری بھی جائے گا۔ دودھ پیتے اور فریاد کرتے تھے۔ فریاد کرتے تھے اور دودھ پیتے تھے۔ لندن پہنچنے تک اُن کا مورال اِتنا گر چُکا تھا کہ ہم سے دُعا سلام کئے بغیر ڈھاکے جانے والے جہاز میں بیٹھ گئے اور واقعی وہاں جاتے ہی گدّی سے اُتر گئے۔

سان فرانسسکو تک تو ہم لکھ لکھ چھٹّیاں درداں دیاں بھیجتے رہے۔ پھر سوچا کہ اِس غوغا آرائی میں ہمارے قصّے کون سُنے گا، کیوں سُنے گا۔ بس ہم نے بھی آہ آہ نہ کی، ہم بھی چُپ رہے۔ ہماری طبیعت کا قاعدہ یہ ہے کہ جو فی الفور لکھ لیں سو لکھ لیں۔ جس کو کل پر ٹالا وہ خود ہی پرسوں پر ٹل گیا۔ خیر میاں آزاد۔ جو بندھ گیا موتی ہے، جو رہ گیا وہ دانہ ہے۔ جو لکھا گیا وہی بہت ہے بلکہ بہت سے زیادہ ہے۔

ابن انشاء		یکم جون ۱۹۷۲ء



فلپائن

۱۹۶۷ء



منیلا میں سیّاحوں کی گت ۔۔۔ منیلا کے اخبار کا کارٹون

جانا ہمارا فلپائن اور ڈرنا بات بات پر

اگر کسی مسافر کی کوئی نقدی یا کوئی قیمتی چیز یا دستاویزات وغیرہ ہوٹل کے کمرے سے گُم ہو جائیں تو ہوٹل ہذا قطعی ذمّہ دار نہ ہو گا۔ مہمانانِ عزیز کو خبر دار کیا جاتا ہے کہ خواہ چند لمحے کے لئے بھی کمرے سے باہر جائیں کمرے میں کوئی قیمتی چیز نہ چھوڑیں اور دروازہ مقفّل کر کے باہر نکلیں۔ رات کو کمرے میں سوتے وقت دروازے کی دوہری چٹخنیاں بھی ضرور چڑھالیں۔

ہوٹل ہذا کسی مسافر کے کمرے میں صنفِ مخالف کے کسی رُکن کا آنا مستحسن نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی معزّز مہمان کمرے کے بیرے یا ہوٹل کے اسٹاف کے کسی اور رُکن سے مل ملا کر کُچھ

کرے تو ہوٹل خود کو بری الزمہ سمجھے گا۔

ہم اپنے مہمانِ عزیز کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اُس کی ایسی
خدمت کریں گے کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا۔

یہ اس ہوٹل کے کمرے میں لٹکے ہوئے نوٹس کی نقل مطابق اصل ہے۔ ہر چند کہ یہ ہوٹل یہاں کے قابلِ اعتبار ترین اور معزّز ہوٹلوں میں گنا جاتا ہے تاہم مہمان کے جان ومال سلامتی کی گارنٹی دینا دُور اندیشی کے خلاف سمجھتا ہے۔ لہٰذا اِس وقت بھی جب کہ رات کے ۱۱ بجے ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں، کمرے کی نہ صرف دونوں چٹخنیاں لگی ہوئی ہیں بلکہ لکھنے کی میز دروازے سے بھڑا کر اپنا سوٹ کیس اُس پر رکھ دیا ہے۔ شام کے جھٹ پٹے کے وقت کھڑکی کے پیچھے ایک چہرہ نظر آیا تھا۔ ہم نے کھڑکی کھول کر موصوف سے کہا کہ اے جانِ قیس تیرا ارادہ کِدھر ہے آج؟ بولا آپ کی کھڑکی کے شیشے صاف کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے کہا کرلو لیکن صرف شیشے صاف کرنا۔ بولا مُجھے نہیں معلوم تھا آپ کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ پھر کسی وقت آ کر کرلوں گا۔ روم بوائے سے ہم نے ۹ بجے ہی کہہ دیا تھا کہ کھانا کھا چُکے، چائے ہم پی چُکے، اب ہم آرام کریں گے۔ تُم بھی آرام کرو۔ پھر بھی دوبارہ دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھ چُکا ہے کہ اور کوئی خدمت؟ سوچنے کی بات ہے منیلا کے ہوٹل والے غریب الوطن

مسافروں کے آرام و آسائش کے بارے میں کتنے فکر مند رہتے ہیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ کابل کے ہوٹل کا روم بوائے تو ایسا استغنا کا مارا ہوا تھا کہ آواز دینے پر بھی نہ آتا تھا۔ اُس نے پوچھ لیا تھا کہ صاحب کب اور کس روز جائے گا۔ بس اُس روز وقت نکال کر بخشش لینے ضرور آ گیا تھا۔

جب بھی ہم کہیں سفر کا اختیار کرتے ہیں لوگ طرح طرح کے بہانوں سے ہمیں باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کابل کے معاملے میں ہمیں سردی سے ڈرایا گیا تھا۔ منیلا کے بارے میں سردی کا عُذر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ یہاں بارہ مہینے گرمی رہتی ہے لہٰذا چوری چکاری کا ذکر لے بیٹھے۔ کراچی میں ہمارے ایک جرمن دوست ہیں، اکثر سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے اُن سے آشیر واد چاہی تو بولے۔ ”منیلا۔۔۔ میاں اخبار پڑھا ہے اِس وقت جرائم کے معاملے میں سب سے آگے نکلا ہوا ہے۔ سائیگون اور نیو یارک سے بھی۔ “

”جی پڑھا ہے۔“

”پھر مت جاؤ۔ “

”جانا ضروری ہے۔“

”وہاں چوری ضرور ہوتی ہے۔ جیب ضرور کٹتی ہے۔ اپنے ساتھ کوئی رقم و قم لے کر مت جانا۔ “

”جی اچھّا۔“

” ٹیکسی والے بڑے بد معاش ہیں۔ ائیر پورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھو تو رستے میں گھما کر کسی ویران علاقے میں لے جاتے ہیں۔ مسافر کو اُٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور سوٹ کیس لے کر غائب ہو جاتے ہیں لہٰذا اپنے ساتھ سوٹ کیس نہ لے جانا۔“

”جی بہت مناسب۔“

”میرے ایک دوست کے تو اُنہوں نے کپڑے بھی اُتار لئے تھے۔“

”تو کیا کپڑے بھی نہ پہن کر جاؤں؟“

بولے۔ ”یہ میں نہیں کہتا۔ ہاں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ وہاں کسی کی آبرو محفوظ نہیں۔ اقوامِ متحدہ کے دفتر کی ایک میم صاحب وہاں تنہا گئی تھیں۔۔۔ “

ہم نے کہا۔ ”جس قوم کی آبرو کا آپ حوالہ دے رہے ہیں اُس کا ہمارے معاملے پر اطلاق نہیں ہوتا۔“

مُصِر ہو کر کہنے لگے۔ ”میں پھر کہتا ہوں مت جاؤ۔ “

”ضرور جائیں گے۔“ ہم نے کہا۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ فرنگی آدمی ہے نہیں چاہتا کہ ہم کسی ایشیائی سے شیر و شکر ہوں۔ کسی قسم کا تعلّق قائم کریں۔ جائز اور ناجائز کی بحث تو بعد میں آتی ہے۔

یہ اچھّا ہے کہ ہمارے فلپائنی دوست بینی پایو کو ہمارا خط مل گیا تھا۔ اِس لئے وہ اپنی فرلانگ لمبی کار لے کر ہمیں لینے منیلا ائیر پورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ ایک اور بزرگ بھی ایک بین الاقوامی ادارے کی طرف سے ہماری پیشوائی کو موجود تھے۔ یہ قوم کے بھارتی تھے۔ ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ بولے ”تو اچھّا اپنے دوست کے ساتھ جارہے ہیں آپ۔ ٹھیک ہے۔ فلاں ہوٹل میں آپ کا بندوبست ہے۔ تھوڑا مہنگا ہے لیکن نسبتاً محفوظ ہے۔ آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ اقوامِ متحدہ کے کام سے آئے ہیں تھوڑی سی رعایت بھی شاید کر دیں۔ “

ہم نے اپنے پر کرفیو لگا لیا

بنی پایو ٹوکیو کی کانفرنس میں ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں اُن کا بہت بڑا مطبع اور نشر و اشاعت کا کارخانہ ہے۔ یہاں کی وائی ایم سی اے کے بھی نائب صدر یا سکتر وغیرہ ہیں۔ منیلا کی خوبصورت خلیج کے ساتھ عالی شان اور خوش وضع عمارتیں دیکھتے شہر کو چلے۔ روزہ ہمارا دیگر دِنوں کی طرح اتّفاق سے اُس روز بھی نہیں تھا لہٰذا خوش چہرہ اور خوش ادا حسیناؤں کے چہروں پر بھی اُچٹتی اور غیر اُچٹتی نظریں ڈالتے جارہے تھے تاکہ کفرانِ نعمت نہ ہو۔ ہمارا ہاتھ بے خیالی میں تھوڑا کار کی کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ مُمکن ہے کسی کی مُسکراہٹ کے جواب میں ہمارے سلام کرنے کی کوشش میں ایسا ہو گیا ہو۔ بہر حال بنی پایو صاحب نے فوراً ڈانٹا کہ ہاتھ اندر کرو۔

ہم نے کہا۔ ”غَلَطی ہو گئی۔ واقعی ایکسیڈنٹ ہونے اور ہاتھ کو گزند پہنچنے کا اندیشہ

ہے۔ کراچی میں ایک شخص نے اِسی طرح بس کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا تھا۔۔۔۔‘‘

بولے۔’’اِس قسم کے حادثے کی بات نہیں کر رہا۔ یہاں کے باکمال ہاتھ مار کر گھڑی اُتار لیتے ہیں۔‘‘

’’چلتی کار میں جاتے مسافر کی بھی۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘

ہم نے اُس کو بتایا کہ کراچی میں ایک جرمن ایشیائیوں سے ہمارے تعلّقات خراب کرنے کے لئے یہی کہہ رہا تھا۔

بولے۔’’ٹھیک کہہ رہا تھا اور دیکھو شام کو چہل قدمی کا شوق ہے تو اُسے کراچی واپس جا کر پورا کرنا۔ تمہارے ہوٹل کے آس پاس جو باغ ہے آب و ہوا تو اُس کی اچھّی ہے لیکن اگر اُس میں کوئی تُم سے بات کرنے کی کوشش کرے، سگرٹ جلانے کے لئے ماچس مانگے یا دعوتِ گناہ و ثواب دے تو اپنا پڑھا لکھا وچار لینا۔ وہاں تمہیں ایسے شوخ اور طنّاز حسین بھی نظر آئیں گے کہ تمہارا جی لوٹ جائے۔ لیکن اُن سے میں

سے بیشتر لڑکے ہیں۔ لڑکیوں کا بھیس بنائے ہوئے ہیں۔ ٹورسٹ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر سب کُچھ لوٹ کر دھکّا دے دیتے ہیں۔ “

ہم نے کہا۔ ”پولیس تو ہو گی لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے۔“

ہم بے راہ روی کے لئے احتیاطاً تھوڑی سی گنجائش رکھنا چاہتے تھے۔

ہنس کر بولے۔ ”وہ اِن لوگوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔“

”تو گویا جہاں جائے آدمی اکیلا نہ جائے۔ کسی فلپائنی دوست کے ساتھ جائے۔ “

فرمایا۔ ”ایسا فلپائنی دوست کہاں ملے گا جو ہمہ وقت آپ کی مصاحبت کرے۔ پھر بعض علاقوں میں تو شام کے بعد ہماری جانے کی ہمّت نہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”تُم نے نے تو ہمیں ڈرا دیا۔ ہم پیدل چلیں گے ہی نہیں۔ ہمیشہ ٹیکسی میں جائیں گے۔ “

بولے۔ ”ٹیکسی والے ہیں تو اِن جرائم پیشہ گروہوں کے ایجنٹ ہیں۔۔۔ یہی تو مسافروں کو گھیر گھار کر لے جاتے ہیں۔“



لہٰذا خواتین و حضرات ہر چند کہ ہمارا ایک ہفتہ اور یہاں قیام ہے لیکن ہمارا منیلا کا سفر نامہ اِس سے آگے چلتا نظر نہیں آتا۔ جب ہم اپنے پر کرفیو لگا کر ہوٹل کے کمرے میں مقید ہو بیٹھیں گے تو لکھیں گے کس بات پر۔ اِتنی استطاعت نہیں کہ اپنے ساتھ مسلح گارد رکھیں۔ آج پبلک لائبریری کے نیچے برتنوں اور ریفریجریٹروں وغیرہ کی ایک نمائش میں جانے کا اتّفاق ہوا۔ دیکھا کہ وہاں بھی ہر اسٹال پر محافظ اسٹین گن لئے کھڑے ہیں۔ شام کو ایک پاکستانی دوست نے فون پر ہمیں یاد فرمایا۔ ہم نے کہا۔ جناب آپ خود تشریف لا کر ہمیں ہوٹل سے اپنے ساتھ لے جائیں تو بندے کو عُذر نہیں۔ چنانچہ وہ لے گئے۔ اچھّی خاطر عاطر کی لیکن وہاں بھی اُنہوں نے اور اُن کی بیگم نے جو خاصے دِنوں سے یہاں ہیں، ایسے قصّے سُنائے کہ ہماری گھگی جو اب تک نہ بندھی تھی بندھ گئی۔۔۔ اُنہوں نے کُچھ معزّز پاکستانیوں کا قصّہ سُنایا کہ ٹوکیو جاتے ہوئے ایک شب کو منیلا میں ٹھہر گئے تھے۔ لمبے تگڑے جوان تھے۔ شام کو شہر کی سیر کو نکل پڑے۔ ایک بار نظر آئی۔ اُس میں گھُس گئے۔ بار میں رومانی فضا

پیدا کرنے کے لئے نیم تاریکی کا انتظام رہتا ہے اور پھر مسافر نوازی کے دیگر انتظامات بھی ہوتے ہیں۔ ایک دو پیگ کے بعد اُٹھنے لگے تو ساقی دوشیزائیں گلے کا ہار ہو گئیں کہ صاحبو ابھی سے کہاں جاتے ہو۔

روئے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شُد

پھر کُچھ ٹھہر گئے اور تماشے اہلِ کرم دیکھا۔ آخر جب گیارہ بجے بر آمد ہوئے اور تھوڑی دور جا کر سود و زیاں کا حساب لگانے کے لئے جیبوں میں ہاتھ ڈالے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بٹوے۔۔۔

جی نہیں قارئین کرام آپ کا اندازہ غَلَط ہے۔ بٹوے غائب نہیں فقط اُن میں سے رقمیں غائب تھیں۔ کسی کے سو پونڈ گئے، کسی کے دو سو پونڈ۔ ہمیں خبر ملی تو چندہ کر کے اُن کو زادِ راہ کے لئے چند ڈالر دیے گئے۔

یہ ہمارے دوست کُچھ عرصے پیکنگ میں بھی رہتے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہاں ہماری عادتیں خراب ہو گئی تھیں۔ نہ کبھی سوٹ کیس بند کیے نہ گھر کو تالا کیا، یعنی کُنڈی لگائی۔ جب چاہو جہاں چاہو گھوم آؤ۔ نہ سامان کی فکر، نہ بچّوں کے متعلّق کوئی اندیشہ۔ یہاں چند ہی دِن میں پے در پے نقصان اُٹھانے کے بعد احساس ہوا کہ ہم

کمیونسٹ معاشرے میں نہیں، آزاد دُنیا میں ہیں اور فلپائن تو خیر سے اخلاق کے علاوہ سیاسی طور پر بھی ایک آزاد دُنیا ہے کہ اِن کے مائی باوا امریکہ نے تو فقط چین ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ فلپائن نے روس کو بھی اب تک تسلیم نہیں کیا اور روس کے علاوہ چیکوسلوواکیہ، پولینڈ، ہنگری، رومانیہ، یوگوسلاویہ وغیرہ کو بھی نہیں۔ تاکہ اِن میں سے کسی سے ضبط کی آلائش سے آزادی کو گُزند نہ پُہنچے۔

ہمارے احباب جانتے ہیں کہ ہم نے قُدرت کی طرف سے ایسا نرم اور گُداز دِل پایا ہے کہ رات کو بھُوت پریت کا کوئی قصّہ سُن لیں یا کہانی پڑھ لیں تو بعض ضروری حاجات کے لئے بھی بستر سے باہر نہیں نکل پاتے۔ یہ تو پھر چوروں اور گرہ کٹوں اور بد معاشوں کے قصّے تھے۔ بھُوت پریت تو فقط ڈراتے ہیں، وہ بھی ڈرنے والوں کو۔ چاقو خنجر اور آتشیں اسلحہ کا استعمال نہیں کرتے۔ لہٰذا قدرتی تھا کہ ہمارے دوست یہ سارے قصّے بیان کرنے کے بعد ہم سے کہتے کہ اچھّا اب اپنے ہوٹل جاؤ تو ہم جانے سے انکار کر دیتے۔ ہم نے کہا۔

”میاں خُدا کا خوف کرو اس اندھیرے میں ہمیں تنہا بھیجتے ہو۔“

بولے۔ ”حوصلہ کرو۔“

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لب اُوست

ہم نے کہا۔ ”یہ وہ خوف نہیں جو اقبال کے شعروں سے دور ہو جائے، لیکن خیر۔ “

ہم نے غَلَطی کی کہ ٹیکسی ڈرائیور کا تن و توش نہ دیکھا۔ ٹیکسی میں تھوڑی دور جانے پر غور کیا تو چہرے پر جُرم اور سیہ کاری کی لکیریں صاف نظر آئیں۔ ٹیکسی نکالی بھی اُس ویران راستے سے اور ہونٹوں پر بھی اُس کے شیطنت آمیز مُسکراہٹ تھی۔ ہم نے جتنی دُعائیں یاد تھیں پڑھنی شروع کیں لیکن ایک بھی پوری نہ پڑھی گئی۔ اضطراب کے باعث بیچ ہی میں بھول جاتی تھی۔ آخر جب اپنے ہوٹل کا چہرہ نظر آیا تو ہم نے حیاتِ تازہ پائی۔ میٹر میں ۵۵ سنتادو ہوئے تھے ہم نے ایک پیسو اُسے دیا اور باقی ۳۵ سنتادو کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ وہ ستم گر بولا۔ ”کیا مطلب؟ ٹِپ نہیں دو گے۔ “

ہم نے سیر چشمی سے کہا۔ ”ہاں ہاں ہم بھول ہی گئے تھے۔ بخشیش ہے بخشیش۔ رکھ لو۔ “

جیب کٹوانے کے لئے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

پہلے ہی روز ہم نے بیرے کو صُبح صُبح بُلایا اور کہا کہ ناشتہ لاؤ۔ چائے مکّھن توس اور انڈے، دیکھو یہ جو تُم لوگ انڈوں کے ساتھ سؤر کے گوشت کے قتلے وغیرہ رکھ دیتے ہو ہمیں نہیں چاہیئے۔ سمجھے؟"

بولا۔ "فرائیڈے؟"

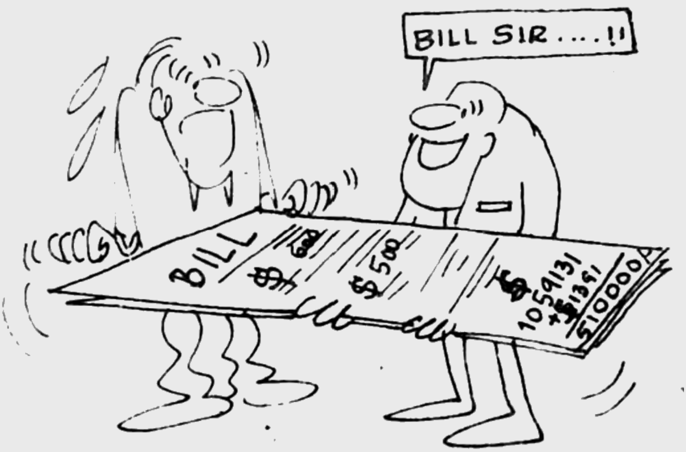
ہم نے کہا: "فرائیڈے کی تخصیص نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ یہ حرام چیز کسی دِن بھی نہیں کھاتے۔ خالی انڈے لانا سمجھے؟ "

وہ پھر بولا: "فرائیڈے۔"

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ ہم نے کہا۔ ”ہاں ہاں فرائیڈ بھاگ جاؤ۔۔۔ جلدی لاؤ۔۔۔“

وہ لایا۔ انڈے بے شک دو تھے۔ پیالیاں دو سے کُچھ کم اور توس ایک کے دو کئے گئے تھے اور مکھّن۔۔۔؟ اِتنا کم کہ توس تو بڑی چیز ہے کسی آدمی کو بھی لگائیں تو خوش نہ ہو۔ البتّہ بِل میں اُس کنجوسی کی کسر نکالی گئی تھی۔ ساڑھے پانچ روپے۔ خیر ہم نے اپنا زر کھایا۔ چائے کم پی۔ خُون کے گھونٹ زیادہ پیئے اور کام پر نکل گئے۔ عجب عشق کیا ہے صبر بھی کر۔ اِس میں تو یہی کُچھ ہوتا ہے لیکن اپنے معیارِ زندگی کا اِتنا بُلند ہو جانا ہمیں کُچھ پسند نہ آیا۔ دوسرے روز یہ سوچ کر کہ شاید کمرے میں ناشتہ منگوانے سے فرق پڑا ہو گا۔ ہم نے نیچے ڈائیننگ ہال میں جا کر اچھّی چیزوں۔۔۔ کا آرڈر دیا۔ بل آیا تو آٹھ روپے۔ ہم نے کہا۔ ”برادر یہ کس چیز کا بِل ہے؟ بلاؤ میجر کو۔ ہمیں الگ الگ بتاؤ کہ چائے کتنے کی ہے۔ انڈے کتنے کے ہیں اور اِس توس کے کیا دام ہیں کہ ذرا پنکھا تیز چلے تو اُڑ جائے۔“

فرداً فرداً تو اِن کی قیمتیں اُن بھلے مانسوں نے ہمیں پھر بھی نہ بتائیں۔ یہ اُن کا تجارتی راز ہو گا ہاں بل کو کم کر کے چار روپے کر دیا۔ ہم نے گرج کر کہا۔ ”پہلے آٹھ روپے کیوں لگائے تھے؟“



بولے۔ ”حساب جوڑنے میں غَلَطی ہو گئی۔“

غَلَطی تو انسان کا خاصہ ہے۔ جو غَلَطی نہیں کرتا وہ انسان نہیں لیکن معلوم ہوا کہ اِن لوگوں کو اِن معنوں میں انسانیت کُچھ زیادہ ہی عطا ہوئی ہے۔ شام کو ہم نے احتیاطاً پوچھا کہ ہمارے کمرے کا کیا کرایہ ہے۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر جو نرخ نامہ لگا تھا اُس کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا۔ اور ہمیں اقوامِ متحدہ کے نام پر جو ہمیں فیصدی رعایت کی بشارت دی گئی تھی وہ لگا کر چونتیس روپے سے بھی کم ہونے چاہئیں تھے۔ اِس میں ناشتہ شامل نہیں لیکن ہوٹل کے مینجر نے خندہ پیشانی سے کہا کہ جناب آپ سے کوئی زیادہ تھوڑا ہی لیں گے پچاس روپے ہے۔



”پچاس روپے؟ اور بیس فیصدی کی رعایت کیا ہوئی؟“

بولے: ”وہ نکال کر ہی تو پچاس روپے بنتے ہیں ورنہ تو باٹھ روپے تھے۔“

”لیکن تُم نے نرخ نامے میں تو کُچھ اور لکھا ہے۔“

”جی ہاں! لیکن آپ کے کمرے میں ٹیلی ویژن بھی تو ہے۔“

”تو یہ پندرہ سولہ روپے گویا ٹیلی ویژن دیکھنے یا نہ دیکھنے کا جرمانہ ہے۔ کیونکہ ہمیں تو اِس کی فُرصت ہی نہیں ہے۔ تُم نے ہمیں پہلے کیوں مطلع نہ کیا۔“

بولے: ”بہر حال پچاس روپے ہوں گے۔“

ہم نے کہا۔ ”فوراً ہمیں کوئی اور کمرہ دو یا ٹیلی ویژن اُٹھالو۔“

معلوم ہوا کہ لُٹنے یا جیب کٹوانے کے لئے یہاں ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام ہوٹل میں بھی ہوتا ہے اور دشنہ و خنجر کے بغیر۔ اِس کا حتمی ثبوت یوں ملا کہ ہم ایک خط گھر پوسٹ کرنا چاہتے تھے۔ کاؤنٹر پر کہا کہ ہمیں اِس کے اسٹامپ دیجئے۔ مینجر نے کہا۔ ”جس آدمی کے پاس اسٹامپ ہیں وہ تو اِس وقت نہیں ہے آپ ہمیں دے دیجئے ہم پوسٹ کرادیں گے اور پیسے آپ کے بِل میں لگادیں گے۔ “

ہم نے کہا۔ ”ٹھیک۔ “

کل جو ہم نے قارئین جنگ کے نام منیلا سے پہلا خط پوسٹ کرنا چاہا تو پھر کاؤنٹر پر دیا۔ پاکستان کو خط پچاس سنتادو یعنی آدھے پیسو میں جاتا ہے۔ بارہ آنے سمجھئے، چونکہ کئی صفحے کا خط تھا لہٰذا ہم نے کہا کہ اِس کا وزن کر کے بتاؤ کہ کتنے پیسے لگیں گے۔ اُس شخص نے کہا۔ ”اِس کا وزن چار ریٹ ہے۔ پچپن سنتادو فی ریٹ کے حساب سے دو پیسو بیس سنتادو ہوئے۔ ہمیں حیرت تو ہوئی لیکن خیر اُن سے کہا کہ اِس کے ٹکٹ دیجئے۔

وہ پھر کہنے لگا: ”اِس وقت ٹکٹ والا کلرک نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم پوسٹ کر دیں گئے۔ “

خط تو اُنہیں دے دیا اور ساتھ پیسے بھی دے دیئے۔ ایک پوسٹ کارڈ ہانگ کانگ بھیجا تھا اُس کے اُنہوں نے ۳۵ سنتا دو بتائے۔ وہ بھی نذر کئے۔ لیکن اب ہمارے دِل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ جانے یہ لوگ پوسٹ کرتے بھی ہیں یا نہیں۔ پیسوں کی بات نہیں لیکن اتنا لمبا خط ہم سے دوبارہ نہ لکھا جاتا لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ بڑے ڈاک خانے میں جا کر خود پوسٹ کریں گے۔

بڑے ڈاک خانے والوں نے وزن کیا تو کہا۔ ”دو ریٹ وزن ہے جناب۔ ایک پیسو لگے گا۔ “

ہم نے کہا۔ ”پھر وزن کیجئے۔ چار ریٹ تو نہیں ہے۔ “

اُنہوں نے کہا۔ ”جی نہیں۔ دو ہے۔ ایک پیسو ہی لگے گا۔ “

”اور کارڈ؟“

”کارڈ پر تیس سنتا دو۔ “

ہوٹل نہ ہوا مسافروں کی مومیائی نکالنے کا کارخانہ ہو گیا۔ یہ سچ ہے کہ مسافروں کی جیبیں کراچی کے ہوٹلوں میں بھی کاٹی جاتی ہیں۔ سُنا ہے ایک ہوٹل میں تو کوکا کولا کا

ڈیڑھ روپیہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن تو نہ ہو گا کہ ایک ہی چیز کا آج کُچھ دام لگایا ہے کل کُچھ اور۔ نہ خطوں کے ٹکٹوں وغیرہ کے سِلسِلے میں یوں بے ایمانی کی جاتی ہو گی۔ ریڈرز ڈائجسٹ نے جنوری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں بے شک لکھا ہے کہ بے ایمانی منیلا والوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ بلیک مارکیٹ قومی خاصہ ہے اور دوسری جنگ کے بعد سے چوری چکاری قتل وغارت وغیرہ ان کا لازمۂ زندگی بن گئے ہیں۔"

لیکن ایسا کہنا زیادتی ہو گا۔ پوری فلپائنی قوم کو جرائم پیشہ کہنے کی جسارت صرف ریڈرز ڈائجسٹ ہی کر سکتا ہے۔ اگر کسی قسم کی اخلاقی گراوٹ وغیرہ ملتی ہے تو امریکیوں ہی کی دین ہے۔ فقط منیلا کی بات نہیں سائیگون، بنکاک، بلکہ ہر جگہ کا جہاں جہاں امریکیوں کا پڑاؤ ہے یا رہا ہے یہی حال ہے۔

منیلا میں پاکستانی سفارت خانے کے محمد علی خان صاحب کی وجہ سے بڑا سہارا رہا۔ ایک دو وقت اُن کی روٹیاں بھی توڑیں۔ وہ اور اُن کی بیگم کرم فرماتے تو ہم وشنو بھوجن کھاتے اور رام رام کرتے گھر لوٹتے۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ فلپائن والے حرام شے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ ہمارا مطلب رشوت سے قطع نظر اِس وقت سؤر سے ہے۔ اب رہ گئی مچھلی تو اٹھارہ سال ساحلِ سمندر پر گزارنے کے باوجود ہمیں اِس سے رغبتِ تام پیدا نہ ہو سکی۔ تیسری چیز بیف ہے یعنی بڑا گوشت۔

یہ بھی ہم حتیّٰ الوسع نہیں کھاتے۔ لیکن یہاں کھانا پڑا تو کُچھ زیادہ ہی بڑا معلوم ہوا۔ اِس کا بھید بھی آخر کھُلا۔

ایک روز جو ہم محمد علی خان صاحب کے دولت خانے پر گئے تو دیکھا کہ دو بکریاں لان میں چر رہی ہیں۔ ہم نے کہا۔ ”کیوں حضرات کیا آپ کو کوئی غم نہیں جو بکریاں خریدی ہیں۔ “

تب اُنہوں نے بتایا کہ کیا کِیا جائے۔ یہاں جو بیف ملتا ہے وہ موٹے دانے کی بھینس یا بھینسے کا ہوتا ہے۔ ہماری طبیعت اُس پر آتی ہے پر نہیں آتی۔ مضافات سے کسی آتے جاتے سے بکریاں منگوا لیتے ہیں اور ایک کو ذبح کر کے ریفریجریٹر میں رکھ کر دس دِن کھاتے ہیں۔ خیر ہم مسافر یہ اہتمام ہر روز کہاں سے کرتے، کوشش ہی کی کہ کوئی گھاس پات کھانے کو مل جائے۔ مٹر ہوں یا بین (Bean) ہوں وغیرہ۔ مُرغ سے ہمارا جی یوں اُٹھ گیا کہ ایک روز چاول اور مُرغ کی کری یعنی شوربے دار سالن کا آرڈر دے دیا تھا۔ آج تک اُس کی زود رنگت اور لجلجے پن کو یاد کر کے جی متلاتا ہے۔ تفریح کے شوق میں ایک روز مقامی اسٹائل کے کیفے میں بھی چلے گئے جہاں آئینے کے اُوپر ہر چیز کی قیمت لکھی رہتی ہے۔ عین ایرانی ہوٹل کا سا نقشہ ہے اور میرے پانی کا گلاس انگلیاں ڈبو کر لاتے ہیں اور لوگ کھانا کھا کر ہڈّیاں فرش پر

پھینکتے ہیں۔ شکل بھی ہوٹل والے کی ایرانی کی سی ہے۔ بنیان پہنے کھڑا تھا۔ ہم نے کوکا کولا تو وہاں ضرور پیا اور کسی چیز کو جی نہ چاہا۔ نیم تاریک ریستورانوں میں تنہا جاتے جی گھبراتا ہے۔ ایک سے دو آدمی ہوں تو ہر طرح کے کھانے کے تجربے میں بھی مضائقہ نہیں۔ محمد علی خان اور ہمارے فلپائنی دوست کہاں تک ساتھ دیتے۔ ہمیں تو گھومنے اور سیر کرنے کا ہوکا ہے۔ اِن میں سے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ایک دِن پیدل گھومے۔ ٹیکسی حسبِ ضرورت لیتے رہے لیکن بعد میں جیپنی پر آ گئے۔

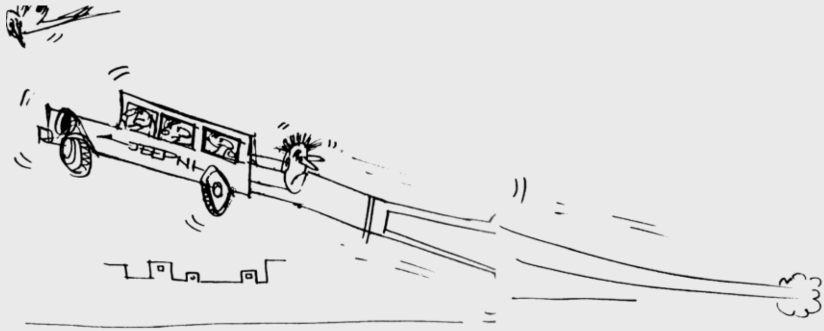
ذکر جیپنی کی سواری کا

آج ہم نے اپنے آپ کو ہمّت اور غیرت دِلائی اور شہر منیلا کا نقشہ اور جان دونوں کو ہتھیلی پر رکھ کر پرانے شہر کا رُخ کیا۔ اِس کے لئے ہمیں حضرت دِل سے خاصی جِرح کرنی پڑی۔ اُسے اسلام کے مجاہدوں اور سر فروشوں کے حوالے دے کر گرمایا۔ دبے لفظوں میں اپنے اسلاف کا حوالہ بھی دیا جن کا پیشہ کسی مجبوری ہی کی وجہ سے سہی، تھا تو سپہ گری۔ دِل صاحب ہمارے سنت فتح سنگھ جی سے کُچھ کم نہیں۔ خُود کُشی اور جاں سپاری کی باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو اِن کو کوئی اور ضروری کام یاد آ جاتا ہے اور سنترے کا رس پی لیتے ہیں۔ دلیلیں تو ہماری یہاں بھی کام نہ آئیں لیکن جب ہم نے کہا کہ بے شک راہ کٹھن اور مصائب بے شمار ہیں لیکن مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی تو دِل صاحب بہت بھنائے اور بولے۔ آخر اُتر آئے نہ اوچھی حرکتوں پر۔۔۔ تمہارا کیا تمہاری ساری قوم کا یہ حال ہے کہ جُونہی

لاجواب ہوئے اقبال کے شعر پڑھنے شروع کر دیئے۔ مردِ مومن تو تُم جیسے ہو میں جانتا ہوں لیکن خیر چلو میاں چلو۔

معلوم نہیں اِس علاقے کا کیا نام ہے جہاں ہم رہتے ہیں لیکن رونق اِس کی دیدنی ہے۔ خوبصورت اسٹور، کیفے، سُپر مارکیٹ، ہوٹل، بنگلوں کی عمارات، بینک یہاں اتنے ہیں کہ شمار کرنے مُشکل ہیں۔ بزنس بہت ہے۔ بینکوں کی عمارتیں چودہ چودہ منزل اونچی چلی گئی ہیں۔ آگے پارک کو پار کر کے پُرانے شہر کی طرف تو چلو تو وہ آثار نظر آتے ہیں اصل جن کی پُر تگیزی ہے پھر وہ دریا ہے کہ ظُلمات کا دریا کہیئے۔ اصل رنگ کُچھ اور رہا ہو گا لیکن سارے شہر کے کیچڑ نے اُسے دلدل بنا رکھا ہے۔ اسے پار کیجئے اور اپنی جیب پاکٹ سے ہوشیار۔۔۔ اُنہوں نے جس راستے میں جانے سے منع کیا تھا قدم خود بخود اُدھر ہی کو اُٹھ گئے۔ ٹیڑھے ٹیڑھے خستہ خراب مکان۔۔۔ رزال یہاں کے قومی ہیرو ہیں جن کی قبر ہمارے پڑوس کے پارک میں ہے اور جس پر اُردُو کے سوا ہر زبان میں کلماتِ عقیدت ثبت ہیں۔ لیکن یہ ٹیڑھے میڑھے پرانے شہر کے مکانات بھی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ تختی دیکھئے۔ یہ ڈھنڈار مکان رزال کی کمین گاہ رہا ہے یہ گلی۔۔۔ وہ گلی۔۔۔ آباد گلی۔۔۔ ویران گلی۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے صدر کے گو آن علاقے میں آ گئے ہیں۔ کونے کے ایک

ریستوران پر ٹھیکی لی۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک آدمی نے یہ لمبا چاقو اُٹھایا اور ہماری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ ہم نے بھی اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا کیونکہ اِس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ اِس پر وہ اُس چاقو سے ڈبل روٹی کاٹنے لگا۔



منیلا میں سواریاں تو بھانت کی ہیں۔ ٹرام تو نہیں لیکن بس ہے۔ ایک ٹانگا بلکہ ٹنگیا سی بھی پرانے شہر میں چلتی ہیں۔ یوں جانئے کہ جیسے سائیکل رکشا کو تانگے کے پہیّے لگا دیے جائیں اور آگے گھوڑا جوت دیا جائے۔ پرانے شہر میں سائیکل رکشا بھی نظر آیا لیکن اگر یہاں راج کسی سواری کا ہے تو جیپنی کا ہے۔ انجن اور سامنے کا رُخ اُس کا جیپ ہی کا ہوتا ہے لیکن پیچھے توسیع کر کے چار سیٹیں ایک طرف اور چار سیٹیں دوسری طرف بنائی گئی ہیں۔ جیسے ہمارے چار سواریوں والے موٹر رکشا ہیں اور ڈرائیور کے ساتھ دو آدمی سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جیپنی کو جہاں بھی چاہے ہاتھ کھڑا کر کے یا آواز دے کر روک لیجئے اور لپک کر بیٹھ جایئے۔ شہر میں جہاں بھی اُترنا ہے

وہاں دس سنتادو دے کر اُتر جایئے۔ سفر چھوٹا ہو یا بڑا اُس کا کرایہ مقرّر رہے۔ اتوار کا روز ہم نے اِسی شُغل میں گزارا کہ جہاں جی چاہا اُتر گئے اور دوسری میں سوار ہو گئے۔ اِس کو بھی کہیں رُکوا کر اُتر لئے اور تھوڑی دیر پیدل چلتے رہے۔ پھر کسی اور میں بیٹھ گئے۔ یہ آخری جیپنی جب مضافات کے قصبے ''کیسوں سٹی'' میں داخل ہوئی تب ہمیں پتہ چلا کہ کسی اور نگر میں آ گئے ہیں۔ وہاں سے جیپنی لی اور چونکہ راستے کا کوئی عِلم نہ تھا، نے ہاتھ باگ پر تھا نہ پا تھا رکاب میں۔ لہٰذا آخر میں ٹیکسی لی اور کہا چلو مابوئے ہوٹل۔

ایک روز ہمارا جی فِلم دیکھنے کو چاہا۔ یہاں ''بائیبل'' نام کی ایک فلم لگی ہوئی ہے۔ ہم تو خیر خُدا کو پیکر محسوس میں دیکھنا پسند نہیں کرتے لہٰذا کسی فلم میں خُدا ہو تو مظاہرے اور شکایتیں کر کے اُسے پہلے سے بند کرا دیتے ہیں۔ لیکن اِس فِلم میں خُدا چادر کی بکل مارے اور ہاتھ میں ایک لمبی سی لاٹھی لئے آتا ہے اور حضرات ابراہیمؑ سے کلام کرتا ہے۔ اپنے اللہ تعالیٰ سے تو جسماً ملاقات کا کوئی امکان نہیں عیسائیوں کے خُدا کی زیارت کا شوق ہمیں کشاں کشاں لے گیا۔ بائیبل کے نام سے اُنہوں نے عہد نامۂ قدیم کے کُچھ واقعات کو فلما رکھا ہے۔ آدم اور حوا، باغِ عدن، ہابیل و قابیل، کشتی نوح، منارۂ بابل اور ابراہیم علیہ السّلام۔ اِن میں باب پیدائش کی منظر کشی تو خاصی

اُکتا دینے والی ہے۔ آدم اور حوا بھی کُچھ جچے نہیں۔ صاف امریکی ایکٹر معلوم ہوتے ہیں۔ باغِ عدن کا نقشہ بھی یونہی سا ہے۔ اِس سے تو گاندھی گارڈن اچھّا۔ بہکانے والا سانپ تو ہمیں نظر نہیں آیا۔ امّاں حوا نے خود ہی بہک کر سیب توڑا اور مزے سے کھالیا۔ دانۂ گندم کی روایت شاید ہمارے ہاں کی ہے اور جو توجیہہ اِس قصّے کی کی جاتی ہے اِس کے لحاظ سے یہی بر محل ہے۔ ہابیل اور قابیل کی اداکاری بھی ایسی ہے کہ معلوم ہوا کوئی پاکستانی فلم دیکھ رہے ہیں۔ ہاں اِن سب کی تلافی کشتی نوح والے حصّے میں ہو گئی۔ کشتی بنانا، اُس میں جانوروں کا آنا اور پھر بابا نوح کی شخصیت بہت ہی با کمال ایکٹر (جان ہٹن) اور اس وقت جو روپ دھار رکھا تھا اُس میں بالکل ہمارے مخدوم مطلبی فرید آبادی نظر آتے تھے۔ منارۂ بابُل کی تباہی کا نقشہ بھی اچھّا ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کا قصّہ ہمیں اتنا پسند نہیں آیا۔ یاد رہے کہ ہم تو حضرت اسمعیلؑ کو ذبیح مانتے ہیں لیکن عیسائی حضرت اسحاقؑ کو اِس کہانی میں یہ مقام دیتے ہیں۔ بہر حال اتنا اچھّا نہیں تو بُرا بھی نہیں تھا۔ ہاں حضرت ابراہیمؑ کی بی بی ایوا گارڈنر اپنے کو چھپانے میں بالکل کامیاب نہیں رہیں۔

یہاں ولایت کی طرح فلم مُسلسل چلتی رہتی ہے۔ کسی بھی وقت چلے جایئے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آخری نصف حصّہ پہلے اور پہلا حصّہ بعد میں۔ ہمارے ساتھ بھی

یہی ہوا۔ ہم جب سینما میں داخل ہوئے تو حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم ملا تھا اور وہ لکڑیاں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ دُنیا کو پیدا ہوتے ہم نے اِس کے بعد دیکھا۔

خیر ذکر فلم کا نہیں، سواریوں کا تھا۔ ہم گلیکسی سینما فلم دیکھ کر نکلے تو ساڑھے چھ بجے کا عالم تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ کہاں کِس طرف کو ہے۔ کِدھر ہے۔ ایک صاحب اپنی کار میں چھوڑ گئے تھے۔ اپنی عقل حیرانی سے سِمت کا اندازہ کر کے ٹیکسی کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن ٹیکسی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اتنے میں ابر بھی گھِر آیا اور ترشح بھی ہونے لگا۔ ہمارے فلم دیکھنے کے دوران میں شاید بارش ہو چکی تھی کیونکہ سڑک پر پانی کھڑا تھا اور بڑا عُمدہ کیچڑ کا گھان تیّار تھا۔ وہاں ٹیکسی نہ ملی۔ دس قدم اور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر چوک پر جا رُکے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر سوچا کہ ہم کہاں تک تِرے پہلو سے سِرکتے جائیں۔ ٹیکسی نہیں تو جیپنی سہی۔ اُن میں بھی اُس وقت رش تھا لیکن خیر ایک میں سوار ہو گئے۔ ایک جگہ سب سواریاں اُتر گئیں، ہم بیٹھے رہ گئے۔ ڈرائیور نے کہا کیوں صاحب کیا واپس جایئے گا؟ ہم نے کہا۔ کیا مطلب؟ بولے: یہ گاڑی تو اب اُدھر ہی کو واپس جائے گی۔ ہم دس سنتا دو دے کر اُتر گئے اور ایک دوسری میں سوار ہو گئے۔ بہت دور جا کر ہم نے ساتھ والے مسافر سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اُس نے مُسکرا کر کہا تُم خود ہی بتاؤ۔

ہم نے کہا ہمارا عزم تو ہوٹل مابوہائے کا ہے۔ وہ بولے کہ اے اعرابی یہ راہ تو ترکستان کو جاتی ہے۔ تُم تو اُلٹی طرف کئی میل آ چکے۔ اب سڑک کے دوسری طرف کھڑے ہو کر جیپنی پکڑو۔ یہ تیسری جیپنی کوئی پانچ منٹ کے بعد اُسی سینما کے سامنے سے گُزری جہاں سے ہم فلم دیکھ کر چلے تھے لیکن ایک جگہ اُس سے بھی ہمیں اُترنا پڑا کیونکہ اُس کا راستہ کُچھ اور تھا۔ ایک مسافر نے از راہِ مہربانی اِشارہ سے کہا کہ اُس میں بیٹھ جاؤ وہ تمہارے ہوٹل کی طرف جائے گی۔ وہ موصوفہ جِن کی طرف اشارہ کیا گیا تھا ایسی جلد باز تھیں کہ ہمارا انتظار کئے بغیر چل نکلیں۔ یہاں کے لوگ جیپنی کے بہت خلاف ہیں کیونکہ اُن کو شِکوہ ہے کہ اِس کے ڈرائیور اِسے جیٹ ہوائی جہاز تصوّر کر کے اِسی حساب سے اُڑتے ہیں اور ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ کر از راہِ رقیق قلبی آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ خلقِ خُدا کا خُون ہو بھی تو کم از کم وہ نہ دیکھیں۔ اُس روز ہمیں معلوم ہوا کہ ہم جیپنی سے زیادہ تیز دوڑ سکتے ہیں کیونکہ ہم نے اُس بھاگتے بھُوت کو جا لیا اور آخر صحیح سلامت منزلِ مقصود پر پہنچ ہی گئے۔

ایک بھارتی پروفیسر ہمارے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ جیپنی کا نام سُن کر بہت ہنستے تھے۔ کہتے تھے کہ جیپ سے جیپنی یوں بنایا گیا ہے جیسے بھُوت سے

بھو تنی۔۔۔لوگ کچھ بھی کہیں۔۔ ہم تو جیپنی میں بیٹھ کر بہت خوش ہوئے۔ منیلا میں یہی ایک چیز دیکھنے کی پائی۔

متفرقاتِ منیلا

”اوتار سنگھ۔بچتر سنگھ۔بختاور سنگھ۔گور بخش سنگھ۔گور بچن سنگھ۔راجہ سنگھ۔رتن سنگھ۔شیر سنگھ۔سروپ سنگھ۔“

یہ سارے نام ہم نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے لئے ہیں۔امر تسر یا چندی گڑھ کی ڈائریکٹری سے نہیں نہ کابل شہر کی ڈائریکٹری سے۔منیلا کی ڈائریکٹری سے۔بہر کُجا کہ رسید یم آسماں پید است۔ایک دو نام اور بھی سنگھ کے ساتھ ہیں۔کارمن سنگھ اور پبلا سنگھ۔یہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ہمارے جذبۂ حب الوطنی نے جوش مارا تو ہم نے پاکستانیوں کے نام تلاش کرنے شروع کئے۔بعض ناموں کے ساتھ احمد ہوتا ہے۔ڈائریکٹری میں ایسا کوئی نام نہ ملا۔نہ محمد کا لاحقہ ملا نہ علی کا۔البتّہ علی کا لاحقہ تلاش کرتے دو سندھی اور ہندوؤں کے نام ضرور مل گئے۔آئل مَل خاص سندھی

نام ہے۔ آخر ہم نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی خان ضرور ہو گا۔ آخر ایک نام ملا جو سے خان (Jose Khan) جو سے بھی کُچھ سمجھ میں نہ آیا ہاں جوزے یا جوزہ ہو سکتا ہے۔ جو نجوم والوں کے نزدیک آسمان کا ایک بُرج ہے۔ ہمارے پٹھّان بھائیوں کے بعض نام ہماری سمجھ سے باہر بھی تو ہوتے ہیں۔ پشتو میں بھی تو رکھے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے یہ فرض کیا کہ کِسی پشاوری بزرگ نے یہاں کشمکش اور بادام کی دُکان کھول رکھی ہے۔ نمبر ملایا۔ اُدھر سے کسی نے اُٹھایا۔ ہم نے کہا خان صاحب سلاما لیکم مزاج شریف !

اُدھر سے کسی نے انگریزی میں پوچھا "وہاٹ ؟ "

ہم نے پھر کہا ہم ہیں آپ کے ایک ہم وطن سلاما لیم بلکہ تڑے ماشے بھی کہا۔

پھر وہی جواب آیا۔ "وہاٹ نان سنس ؟" اب ہم سمجھ گئے کہ کوئی اور ہے مسلمانوں کا سا نام رکھ چھوڑا ہے ہمیں دھوکا دینے کے لئے۔

سندھی ہندوؤں اور سکھوں کی یہاں متعدد دُکانیں ہیں۔ سُنا ہے کہ سال بھر کا پرمٹ ملتا ہے۔ اِس کے بعد چندہ کر کے رشوت دے کر اس میں توسیع کرا لیتے ہیں۔

اخبار تو یہاں کئی ایک ہیں، منیلا کرانیل ہے، منیلا بلیٹن ہے، فلپائن ہیرالڈ ہے اور شام کو مرر اور نیو ایونگ نیوز ہیں۔ لیکن سب سے بڑا اخبار منیلا ٹائمز ہے اور ۲۴ یا ۲۸ صفحے تو اُس کے ہر روز ہوتے ہیں۔ اتوار کو ۱۱۲ صفحے تھے۔ اتوار کو دوسرے اخبار بھی ہم نے لئے۔ اِس سے تو کم تھے لیکن ہمارے سنڈے ایڈیشنوں سے دُگنے تِگنے پھر بھی تھے۔ یہی حال شام کے اخباروں کے سیٹر ڈے ایڈیشنوں کا ہے۔ کرانیکل نے ہفتے کے روز ۸۴ صفحے دیئے۔ اِس کے باوجود ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے کیونکہ سب سے زیادہ تو اِن میں اشتہارات ہوتے ہیں۔ اِن سے جو جگہ بچّے تو اُن میں مختلف کالم نگاروں کے کالم۔ دس دس کالم جیسے ریس میں گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ ایڈیٹوریل اس پر مستزاد۔ کُچھ صفحے کارٹونوں کے نکل گئے، قسمت کا حال اور بازار کے بھاؤ بھی ضروری ہیں۔ ان کے بعد منیلا اور فلپائن کی خبریں اور سکینڈل۔ کوئی جگہ پھر بھی بچ گئی تو ہاں دو چار خبریں باہر کی دُنیا کی دے دیں۔ کئی بار تو لوگوں کے کالم پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ فلاں واردات ہوئی ہے۔ نہ ہوتی تو کالم میں ذکر کیسے آتا۔

اخبار کے یہاں آزاد ہیں اور کالم نگار تو جو جی میں آتا ہے لکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو کہتے پایا کہ ایسی آزادی بھی کیا۔ بعضوں کے متعلّق تو لوگوں نے انگشت نمائی بھی کہ

کیسے رئیسانہ ٹھاٹھ کالم نگاری کے پیسے تو تھوڑا ہی ہیں۔ دستِ غیب کا طفیل ہے۔ جو لوگ اِن کالموں میں اپنا ذکر نہیں چاہتے تا کہ اِن کی خوش اعمالیوں پر پردہ پڑا رہے وہ اِن کی دامے ورمے خدمت کر کے اِن کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو بینک بنا لیا ہے۔ دوسرے کے ٹھاٹھ راجاؤں اور مہاراجاؤں کے سے سُنے۔ اکثر کا یہی حال ہے۔ حکومت بھی اِن کو راضی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک نامہ نگار کو فلم سنسر بورڈ کا صدر بنا دیا ہے۔ دوسرے کو ایک بڑا عہدہ دے کر رام کر رکھا ہے۔ اور ایک کو تو ائیر پورٹ کا منیجر بنا رکھا ہے حالانکہ ائیر پورٹ کے امور میں ان کا تجربہ اتنا ہی ہے کہ کئی بار ہوائی سفر کر چُکے ہیں۔ سو یہ ہم بھی کر چُکے ہیں۔ ایک صاحب نے پوچھا کیا تمہارے ملک میں تمہیں ائیر پورٹ منیجر بنا دیں گے؟ ہم نے کہا ہر گز نہیں۔ ہمیں تو ائیر پورٹ کے اندر جانے کے لئے بھی پاس لینا پڑتا ہے۔

لیکن سب کالم نگاروں کے متعلّق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ جے وی کروز ہی کو لے لیجئے۔ نہ حکومتِ وقت کی پروا کرتے ہیں نہ امریکہ کی۔ امریکی پالیسیوں، امریکی اڈّوں اور امریکیوں کی ایسی کھنچائی کرتے رہتے ہیں کہ کسی اور امریکہ نواز مُلک میں ہوں تو جان سے ورنہ آزادی سے ضرور جائیں۔ دوسرے جہانیاں جہاں گشت میکسیمو

سولیون ہیں۔ نوجوان ہیں اور بہت تیکھا لکھتے ہیں۔ ہم اِن سے ملے تو جمیل الدّین عالی کی بات کرنے لگے کہ ہمیں بہت پسند ہے۔ ہماری طرح مُنہ پھٹ ہے۔ اِدھر بات جی میں آئی اور زبان پر آگئی۔ ہم نے اتّفاقِ رائے کیا اور کہا کہ بعض اوقات تو جی میں بعد میں آتی ہے زبان پر پہلے۔۔۔ عالی صاحب سے ان کہ ملاقات ہارورڈ کے سیمینار میں ہوئی تھی۔ ایک بار پاکستان بھی آچکے ہیں غالباً ۱۹۶۳ء میں۔ پھر آنے کا کہہ رہے تھے۔ دو سال ہوئے عوامی چین بھی گئے تھے۔ حکومت نے اِن کا پاسپورٹ ضبط کر لیا۔ بہت لڑ جھگڑ کر اُنھوں نے دوسرا حاصل کیا ہے۔ اِن کی لائبریری دیکھی۔ ہر مُلک کے متعلّق اتنی کتابیں اور تازہ سے تازہ کہ جی للچائے۔ ایک سیکرٹری بھی رکھ چھوڑی ہے۔ بہت رشک آتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ کیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ۔ ہم نے پوچھ ہی لیا کہ میاں میکس! کیا کالم سے اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ یہ طرزِ زندگی نبھاؤ۔ اُس نے کہا بہت ملتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ٹیلی ویژن کی آمدنی بھی تو ہے۔ یہ دیانت دار آدمی ہیں اور غریب سَگنے جاتے ہیں۔



میکسیمو سولیون

ٹیلی ویژن کا سنئے۔ ایک نہیں یہاں پانچ ہیں۔ ہر اخبار

کا اپنا ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے اور اپنا ریڈیو ہے۔ پروگرام صُبح سے شروع ہو تو آدھی رات تک مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ کمائی اشتہاروں کی ہے. منیلا ٹائمز ہر ہر چند سب سے بڑا اخبار ہے عام دِنوں میں دولاکھ سترہ ہزار اور اتوار کو دو لاکھ تیس ہزار چھپتا ہے تاہم زیادہ یافت اِس ادارے کو ٹیلی ویژن اور ریڈیو ہی سے ہوتی ہے۔ پانچ چینل سے زیادہ تو یورپ اور امریکہ کے کسی شہر میں بھی نہیں۔ نیویارک میں بھی نہیں۔ کہتے ہیں سینما ہال بھی یہاں نیویارک سے زیادہ ہیں۔

آج کل منیلا کے اخباروں میں موضوعِ بحث دو باتیں ہیں۔ ایک خوردہ فروشی کو قومیانے کا مسئلہ۔ دوسرے منیلا شہر کی گندگی۔ صدرِ مملکت مارکوس صاحب اور منیلا کے میئر ولیگاس صاحب میں بھی اِس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے ٹھنی ہوئی ہے۔ فلپائن میں خوردہ فروشی کے کاروبار پر بھی غیر مُلکی قابض رہے ہیں۔ زیادہ تر امریکی، کُچھ ہندوستانی اور چینی بھی۔ فلپائن کی کانگریس نے قانون پاس کیا کہ اِن کو بے دخل کر کے یہ کاروبار فلپائنی لوگوں کو دیا جائے۔ ولیگاس صاحب زور دے رہے ہیں کہ اِس قانون پر فوراً عمل در آمد ہونا چاہئے۔ اُدھر مارکوس صاحب نرم روی سے کام لینا چاہتے ہیں اور لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ وہ امریکی کی ناخوشی کے خوف سے ایسا کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں ولیگاس صاحب کہ دلیلوں کو تو وہ کیا رد

کرتے کیونکہ لوگوں کے دِل کی آواز یہی ہے۔ اُنہوں نے بحث یہ اُٹھادی ہے کہ یہ کیسا میئر ہے۔ شہر میں گندگی کے ڈھیر پڑے ہیں اُن کو تو اُٹھاتا نہیں اور قومی معاملوں میں دخل دیتا ہے۔ اخبار نویسوں نے دونوں معاملوں کو اچھالنا شروع کیا۔ غیر مُلکیوں کی بے دخلی کو بھی منیلا کی گندگی کو بھی۔ یہ دونوں چیزیں اہلِ فلپائن کے لئے نئ نہیں ہیں۔ لوگ اِن کے عادی ہیں اور غالباً اُنہیں بُرا نہیں سمجھتے لیکن اخباروں کے لکھنے سے عوام کو بھی غیر مُلکی لوگ اور کُوڑے کے ڈھیر نظر آنے لگے ہیں۔ ایک صلح کُل کالم نگار نے لکھا ہے کہ بھائی ہم غیر مُلکیوں کی بے دخلی تو چاہتے ہیں لیکن ایسے منیلا شہر میں جو کوڑے کرکٹ سے پاک ہو۔

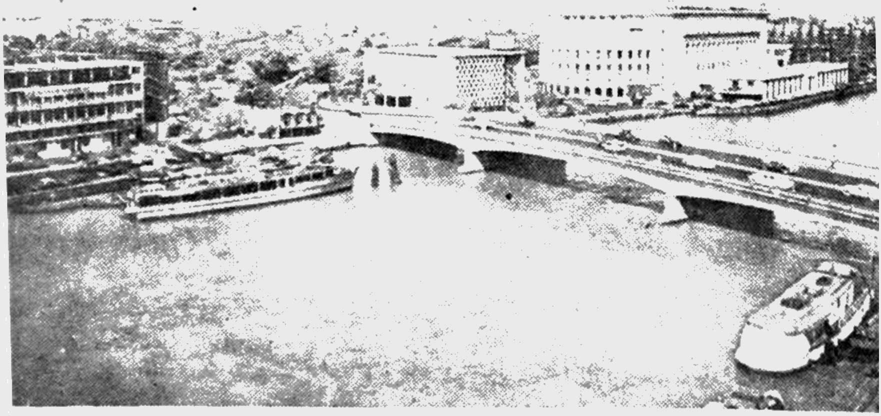
دیکھا جائے تو ایک دِن میں اِن دونوں چیزوں کا صفایا مُمکن نہیں۔ نہ غیر مُلکیوں کا، نہ کوڑے کرکٹ کا۔ بلکہ دونوں کے لئے یہ باتیں مُشکل ہیں۔ صدرِ مملکت کے لئے بھی میئر صاحب کے لئے بھی۔ لٰہذا بعض مبصرین کے نزدیک قابلِ عمل اور آسان حل یہ ہے کہ میئر صاحب امریکیوں کی بے دخلی پر اصرار چھوڑ دیں اور صدر صاحب گندگی کے ڈھیروں سے چشم پوشی کرلیں۔ لیکن دونوں حضرات بیان بازی نہ نہ کریں۔ نتیجہ یہ ہو گا اخبار بھی چُپ ہو جائیں گے اور کوئی دِن عوام بھی بھول جائیں گے کہ اِس شہر میں غیر مُلکی بھی ہیں یا گندگی بھی ہے۔ میکسیمو سولیوان سے

بات ہوئی تو اُس نے بھی کہا کہ ہاں باہمی چشم پوشی ہی بہترین حل ہے لیکن گندگی کا تعلّق توناک سے بھی ہے۔

ایک نامی گرامی کالم نگار الیہار ندوردسیز، نے جو میکاپال کی کابینہ میں وزیرِ تعلیم بھی رہ چکے ہیں اور منیلا کرانیکل میں لکھتے ہیں، حکومت پر طنز کرنے کے لئے ایک روز یہ پیرایہ اختیار کیا کہ میکسیکو کی داستان چھیڑ دی کہ وہاں بعض جرنیل ''اُنگلی جرنیل'' کہلاتے تھے۔ وہ لوگ تھے جن کے سر پر حاکمِ وقت اپنی خوشنودی کا طوطا بٹھا دیتا تھا۔ وہ یُوں کہ جہاں کسی شخص سے خوش ہوئے اُس کی طرف اُنگلی سے اشارہ کر کے کہا ''آج سے تُم جرنیل یا آج سے تُم وزیرِ صحت۔'' ہمارے ہاں بھی فلپائن کے ایک صدر صاحب یہی کرتے رہے ہیں کہ اکاؤنٹنٹ جنرل کی اسامی خالی ہوئی تو حاضر باشوں سے کہا کہ صاحب تُم میں سے کوئی اکاؤنٹنٹ جنرل بننے کا شوق رکھتا ہے تو ہاتھ کھڑا کرے۔

روسیز کے اِس کام کو پڑھ کر ہمیں ریاست پٹیالہ یاد آئی جہاں آج اگر کوئی شخص انسپکٹر تعلیمات ہے تو دوسرے روز سپرنٹنڈنٹ پولیس بنا دیا جاتا تھا بلکہ ایک بزرگ کا تقرّر تو بطور لیڈی ڈاکٹر بھی کیا گیا تھا کیونکہ اُس وقت اتّفاق سے یہی جگہ خالی تھی۔

روسیز صاحب شاید اشارے کنائے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہاں بھی یہی ہوتا ہے۔ واقعی ہمیں یہ بتایا گیا کہ جس روز مُلک کا صدر بدلے مختلف محکموں کے افسر اور اہلکار خود کو برطرف سمجھ لیتے ہیں۔ اب یہ اُس کی مہربانی ہے کہ کسی پُرانے کو رکھ لے ورنہ نئے آدمیوں کو لائے گا جنھوں نے الیکشن کے کڑے وقت میں اُس کی مدد کی ہو۔ ایک بڑے عہدے دار ہمیں ابھی ملے۔ اُنہوں نے بتایا کہ جب میرے تقرّر کا پروانہ آیا تو سب سے زیادہ حیرت مُجھے ہوئی۔ میں فلسفے کا پروفیسر تھا نہ میں نے اس قسم کا کام کبھی کیا تھا نہ اِس عُہدے کے لئے اُمّید وار تھا۔ ہاں صدر صاحب کی انتخابی مُہم میں دو تین تقریریں ضرور اُن کے لئے لکھی تھیں۔ بادشاہ آدمی ہیں جانے کیا سوچ کے مُجھے جنگلات کا ڈائریکٹر بنادیا ہے۔



دریائے پیسج۔۔۔ یہ ایسا صاف نہیں جیسا نظر آتا ہے

انڈونیشیا

۱۹۶۷ء



کِدھر گیا سمندر؟

ایروفلوٹ کی سواری

منیلا سے واپسی پر ہم نے ڈبل ریٹ پر میلے کپڑے دھلوائے، بال کٹوائے اور اپنے پاسپورٹ پر کچھ نئی مُہریں لگوا کر انڈونیشیا کا عزم کیا تو دوست احباب دامن گیر ہوئے کہ اپنی جان اور عافیت کو عزیز رکھو اور مت جاؤ انڈونیشیا۔ آج کل آتش فشاں کے دھانے پر ہے۔ مظاہروں کا زور ہے۔ جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ لاکھوں قتلام ہو چکے اور آگے کے لئے بھی راوی چین نہیں لکھتا۔ ٹینک راستے روکے کھڑے ہیں۔ ناکوں پر مشین گنیں نصب ہیں۔ خاردار تار بچھے ہیں اور صدر سوئیکارنو کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ صبح گیا یا شام گیا۔ آگ اور خُون کے سیلاب میں تمہاری ٹیّاں سی ہستی کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ کیوں خُودکُشی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

ہم موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا خودکشی سے کیونکہ یہ امر قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے۔ تعزیرات کا غالباً واحد جُرم ہے کہ کامیابی سے اِس کا ارتکاب کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں۔ ہاں کوئی اناڑی پن سے ناکام رہ جائے تو جیل ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنے دِل سے مشورہ کیا کہ حضرت! واں جائیں یا نہ جائیں۔ نہ جائیں کہ جائیں ہم۔ دِل ناداں نے کہا جانِ برادر۔ مزا تو آج کل جانے میں ہی ہے۔ امن و عافیت کے دنوں میں گئے تو کیا گئے۔ چڑھ جا بچّہ سولی، رام بھلی کرے گا۔

سولی پر تو ہمارے آباؤاجداد کبھی نہ چڑھے، ہم کیا چڑھتے، ہاں جنوری کی ۲۸ کو کولمبو جانے والے طیّارے میں سوار ہو گئے اور پٹّی باندھ کر سگریٹ بُجھا دیا۔ جاکرتا بنکاک کے راستے بھی جاتے ہیں لیکن ایک راستہ کولمبو کی طرف سے بھی ہے اور کولمبو میں ہمارے بہت سے دوست ہیں جو مُصِر تھے کہ چند روز یہاں ٹھیکی لے کر آگے جانا۔ سیلون ہم تین برس پہلے بھی گئے تھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس تھی لیکن ہوائی جہازوں کی پروازوں کا حساب کُچھ ایسا تھا کہ بس ایک رات اور آدھا دِن ملتا تھا۔ ہم نے اِسے غنیمت جانا۔ راستہ ایسا لمبا نہیں، راولپنڈی نہ گئے کولمبو جا اُترے۔ یہاں لمبے اور گھنے بالوں اور سانولے سلونے، نقوش والی وہ سنگھالی لڑکی ہمارے انتظار میں پہلے کھڑی تھی جس کا نام مانل ہے۔ ساتھ اُس کے والد صاحب بھی تھے۔

۱۹۶۴ء میں جو صاحب ہمیں ہوائی اڈّے پر لینے آئے جب گھنٹہ بھر اپنی کار دوڑا چُکے اور ہم نے آبادی کا نشان نہ پایا تو ہم نے اُن سے عرض کیا کہ جزیرے کی سیر ہم بعد میں کریں گے پہلے کولمبو شہر چلو۔ اُنہوں نے فرمایا ہم کولمبو ہی تو جارہے ہیں۔ شہر سے ہوائی اڈّہ اکّیس میل کی مسافت ہے اور تنگ پُر پیچ راستوں میں پوراسوا گھنٹا لگتا ہے۔ آج بھی یہی ہوا۔ پہلے مضافات ختم ہونے میں نہ آتے تھے پھر شہر کی گلیاں لمبی ہو گئیں۔ آخر خُدا خُدا کر کے گال فیس ہوٹل کی صورت نظر آئی۔ پُرانی وضع کا کولونیل طرز کا بڑے بڑے کمروں اور لمبی وسیع غُلام گردشوں والا یہ ہوٹل عین سمندر کے تٹ پر واقع ہے۔ پانی اُس کی دیواروں کو تھپیڑے مارتا گزرتا ہے۔ ننگے پاؤں والے دھوتی پوش بیروں نے ہمیں اور ہمارے سامان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مینیجر نے کہا اہلاً و سہلاً گُڈ آفٹر نون۔ فلاں نمبر کے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں چلے جایئے۔

ہم چونکہ سمندر کے عاشق ہیں اور دوئی کا پردہ درمیان میں نہیں چاہتے لہٰذا ہم نے مینیجر سے کہا اے بھدر پُرش ہمیں ائیر کنڈیشنڈ نہیں چاہیئے، ہمیں ایسا کمرہ دو جس کی کھڑکیاں سمندر پر کھلتی ہوں۔ اُس نے کہا اچھّی بات ہے۔ بے شک اُس نے جو کمرہ دیا وہ سمندر پر کھلتا تھا لیکن اِس طور کہ آدھے دھڑ کو کھڑکی کے باہر لٹکا کر دہنی طرف کو گردن موڑیں تو سمندر نظر آتا ہے۔ ہم نے مینیجر سے کہا میاں سمندر تو ہم

نے دیکھ لیا لیکن ہماری گردن میں موچ آ گئی ہے کوئی اور کمرہ دو۔ بولا اِس وقت نہیں ہے۔ آپ اگلی بار تشریف لائیں گے تو عین سِرے والا کمرہ کھول دوں گا۔

۱۹۹۴ء میں جب ہمیں گال فیس ہوٹل میں جگہ نہ ملی تو سی ویو کلب میں ٹھہرے۔ اِس کا نام سُن کر ہماری باچھیں کِھل گئیں لیکن پھر جلد ہی اصل جگہ پر واپس آ گئیں کیونکہ اِسے سی ویو یعنی نظّارۂ بحر کلب کا نام اِس لئے دیا گیا تھا کہ جس آدھ میل لمبی گلی کے سِرے پر یہ واقع تھا اُسے لے کر بڑی سڑک پر آئیں اور دو فرلانگ اُس پر چل کر بائیں ہاتھ کو مُڑیں تب سمندر کی جھلک نظر آتی ہے۔

کولمبو میں آدھا دِن اور آدھی رات دوستوں کے جلسے میں گزری۔ اگلی صبح علی الصبح ہمیں روسی ہوائی کمپنی ایرو فلاٹ کا جہاز لینا تھا اور ائیر پورٹ کا راستہ لمبا ہونے کے باعث ہمیں صبح تین بجے اُٹھا دیا گیا۔ کولمبو سے اُس جہاز پر سوار ہونے والے ہم یکہ و تنہا مسافر تھے لہٰذا خاص ہمارے لئے کمپنی کی گاڑی آئی۔ ائیر کمپنی والوں نے دفتر کھولا، کسٹم والے ڈیوٹی پر پُہنچے اور امیگریشن والے آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اُٹھے۔ فجر کی اِس ساعت میں سارا شہر خاموش تھا۔ فقط ملباری ہوٹل جا بجا کھُلے تھے۔ لوگ باگ چائے کی چُسکی لگا رہے تھے۔

ہوائی اڈّے پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایروفلاٹ کا جہاز اپنی مرضی سے آتا ہے، مرضی سے جاتا ہے اور جیٹ جہاز نہیں ہے۔ سوپانچ بجے کا جہاز چھ بجے آتا ہے۔ اِس میں زیادہ تر روسی تھے اور تین چار انڈونیشی جو ماسکو یا کراچی سے سوار ہوئے ہوں گے۔ آدھے سے زیادہ جہاز خالی تھا۔ ہم نے آج تک روس کی کمپنی سے سفر نہیں کیا تھا۔ سامنے کی پاکٹ میں سے کتابچے نکال کر پڑھنے شروع کیے تو معلوم ہوا کہ

”ایروفلاٹ دُنیا بھر میں اپنی نوعیت کی سب سے بڑی کمپنی ہے۔“

”مسافروں اور ہوائی جہازوں کی تعداد کے اعتبار سے دُنیا کی کوئی ہوائی کمپنی اِس کا مُقابلہ نہیں کر سکتی۔“

”ماسکو سے طہران سے دشتِ لوط پار کر کے آپ کراچی پہنچتے ہیں جو پاکستان کا دارالحکومت ہے تو۔۔۔“

ہم نے چونک کر کتابچے کی تاریخِ اشاعت دیکھی۔ لکھا تھا کہ اِس میں معلومات یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء تک کی ہیں۔ خلا میں معرکے مارنے والوں کی معلومات اگر زمین کے بارے میں کُچھ پیچھے رہ جائیں تو قابلِ معافی ہے۔

چھ سے سات بجے اور سات سے آٹھ۔ جب سوئی نو پر پہنچی جو جاکرتا کے وقت کے مطابق گیارہ بجے دِن کا عمل تھا تو ہمارے معدے نے ہم سے تعاون کرنے سے اِنکار کر دیا۔ ہم اب تک مغربی دُنیا کی ایئر لائنوں میں سفر کرنے کے عادی تھے جہاں ائیر ہوسٹسیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد مسافروں کے درمیان سے تبسّم کی بجلیاں گراتی گزرتی ہیں اور کار لائقہ پوچھتی رہتی ہیں۔ یہاں کسی نے اِن تین گھنٹوں میں بات بھی نہ پوچھی۔

آخر ہم خود اُٹھ کر باورچی خانے میں گئے۔ وہاں بقول کسے رواں نہ دھواں۔ ایک صاحبہ بیٹھی ناول پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے کہا کامریڈ ہم تو بھوکے مر گئے۔ کیا ناشتہ نہیں ملے گا۔

بولیں۔ ”ناشتہ، کیسا ناشتہ؟ ابھی تو سات بجے کا عمل ہے۔“

”سات بجے؟“ ہم نے کہا۔ ”بی بی خُدا کا خوف کرو۔ اِس وقت کولمبو میں نو بجے ہیں اور جاکرتا میں گیارہ۔ ہم آدھے راستے میں ہیں لہٰذا دس بجے سمجھو۔“

پھر گھڑی دکھا کر بولیں۔ ”یہ دیکھئے، سات بجے ہیں۔“

”کہاں کا ٹائم ہے؟“

”ماسکو کا۔“

”تو گویا مشرقِ بعید میں بھی ناشتہ ماسکو کے وقت کے حساب سے ملے گا؟“

بولیں: ”جی ہاں۔“

ہم اس عزیزہ اور ہوائی کمپنی والوں کی حُبّ الوطنی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے کہ گھر سے ہزاروں میل دور بھی اُس کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔

ہم نے کہا۔ ”بی بی ہم خود سوشلسٹ ہیں لیکن ہمارا معدہ سوشلسٹ نہیں ہے۔ مصفی اور مہربانی کرو اور ہمیں کُچھ کھانے کو دو۔“

اُن کا جی پسیجا۔ بولیں۔ ”اچھّا آدھے گھنٹے بعد آپ کو ناشتہ مل جائے گا۔“

ہم نے کہا۔ ”اِس وقت کُچھ ملے گا؟“

فرمایا۔ ”کولڈ ڈرنک مل جائے گی۔“

”کون سی؟“

جواب ملا۔ ”کوکا کولا“

”کوکا کولا۔۔۔ سوشلسٹ مُلک کے ہوائی جہاز میں؟“

فرمایا۔ ”جی ہاں۔“

اس پر ہمیں چینیوں کی باتوں پر تھوڑا یقین آنے لگا کیونکہ ہمارے نزدیک سوشلسٹ معاشرے کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہاں کوکا کولا نہیں ہوتا۔ خیر بعد میں معلوم ہوا کہ روس میں فی الحال کوکا کولا نہیں ہوتا۔ یہ رسد اُنہوں نے کراچی سے لی تھی۔

ناشتہ ملا اور خاصا بھاری کیونکہ ہر چند کہ ہمارا جہاز ڈھائی بجے جا کر پہنچنا تھا ہمیں بتایا گیا تھا کہ لنچ کی اُمّید نہ رکھیں۔ سفر آرام دہ تھا۔ روس کے جہازوں کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اتنا ہم نے سوچ لیا کہ آئندہ ایروفلوٹ سے سفر کرنا ہوا تو گھر سے پراٹھے بندھوا کر ساتھ لے لیا کریں گے۔

ہم نے بارہ سو روپے کا کھانا کھایا

انڈونیشیا جانے کے دو روز پہلے اسٹیٹ بنک میں بیگم صبیحہ حسن سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگیں۔ ”ضرور کہیں کا عزم ہے۔ کہاں کا ہے؟ آپ نے تو حد کر دی۔“

ہم نے طعنے تشنے کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا کہ اب جا کر تا جا رہے ہیں۔ بس چند روز کے لئے۔

فرمایا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کروڑ پتی ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمیں تو اب بھی معلوم نہیں۔ واللہ بتائیے کہاں ہے ہماری دولت۔“

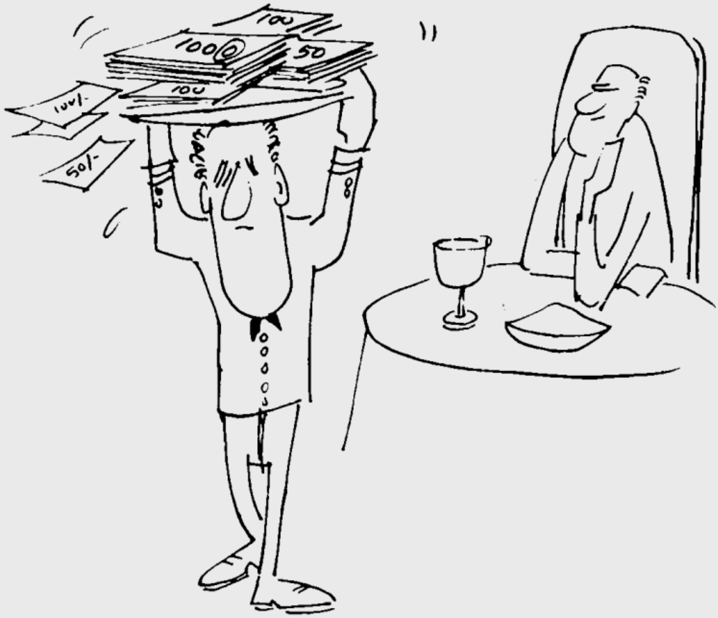
بولیں۔ ”اس کا اندازہ میں نے اِس امر سے کیا کہ آپ نہ صرف انڈونیشیا جانے کا بلکہ وہاں چند روز قیام کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ اِس خاکسارہ نے ایک روز جا کر تا کے

ایک ریستوران میں لنچ کھایا تو بیرا بارہ لاکھ روپے کا بل لایا۔“

”وہ سمجھا ہو گا کہ آپ ریستوران خرید رہی ہیں۔“

”یہ بات نہیں۔“

”آپ پر اُسے سر آغا خان مرحوم کا دھوکا ہوا ہو گا۔“



”یہ بات نہیں۔ کیا میری شکل سر آغا خان سے ملتی ہے؟“

”پھر آپ نے ہیرے جواہرات کھائے ہوں گے۔ بندہ تو دال روٹی کھاتا ہے۔“

فرمانے لگیں۔ ”ہم نے بھی دال روٹی بلکہ دال بھات ہی کھائی تھی۔ خیر تفصیل کی حاجت نہیں۔ آپ جا رہے ہیں خود دیکھ لیں گے۔“

صبیحہ بیگم کا مُقابلہ تو ہم نہ کر سکے لیکن بارہ سو روپے کا کھانا تو ہم نے ایک وقت میں کھایا۔ آج کل ایک امریکی ڈالر کا بھاؤ انڈونیشیا میں سو روپے ہے۔ مارکیٹ اور بلیک مارکیٹ میں اِس سے زیادہ ایک سو تیس روپے تک سمجھئے لیکن صبیحہ حسن جس زمانے میں گئیں اِس سے ہزار گناہ زیادہ تھا یعنی ایک امریکی ڈالر برابر تھا ایک لاکھ انڈونیشی روپے کے۔ جس کو سبزی خریدنی ہوتی تھی روپوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس لے کر چلتا تھا۔ دس ہزار بیس ہزار روپے تو بخشیش میں اُٹھ جاتے تھے۔ مشینیں دھڑا دھڑ نوٹ چھاپے جا رہی تھیں۔ حکومت نے ڈیڑھ سال پہلے سو روپے سے اُوپر کے تمام نوٹ منسوخ کر دیئے۔ اُن کی ایک کوڑی بھی قیمت نہ رہی۔ چھوٹے نوٹوں میں سے ایک روپیہ پُرانے ایک ہزار روپے کے برابر قرار پایا۔ مُلک میں اِس سے جو ابتری پھیلی ہو گی اُس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔



اِس وقت بھی صورتِ حال یہ ہے کہ ہوٹل انڈونیشیا میں اگر ٹھہریے کہ یہی ایک انٹر نیشنل ہوٹل وہاں ہے تو وہ ادائیگی انڈونیشی روپوں میں نہیں بلکہ امریکی ڈالروں یا برطانوی پاؤنڈ کی صورت میں قبول کریں گے۔ انڈونیشی ائیر لائن گیر دوا سے سفر ہے تو وہ بھی کرایہ ڈالروں اور پاؤنڈوں میں مانگتی ہیں۔ انڈونیشی روپے کا لین دین نہیں کرتیں۔ بندھی ٹکی تنخواہ والوں کا یہ حال ہے کہ ایک اعلیٰ افسر نے بتایا کہ میں

پندرہ سو روپے مہینہ پاتا ہوں اور میری بیوی کہتی ہے کہ اِس سے فقط دو دِن کا خرچ چلتا ہے۔ پندرہ سو روپے پندرہ امریکی ڈالر کے برابر ہوئے لیکن ہمارے ہاں کے ساٹھ ستّر روپے۔ جس کے پاس ڈالر ہیں وہ تو خیر بادشاہ ہے لیکن انڈونیشی کسان کو انڈونیشی روپیہ کمانے میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہم نے پوچھا کہ پھر کیسے گزارہ

چلتا ہے؟

پتہ چلا کہ قدرت مہربان ہے۔ اگر یہ لوگ کُچھ بھی نہ کریں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، تب بھی خوردہ غلّہ، پھل بہت۔ بھوکا مرنا ناممُکن، اب رہا کپڑا، تو سارا سال گرمی رہتی ہے۔ لنگوٹ اور انگُوچھے میں بھی گُزر ہو سکتی ہے۔ مکان کے لئے بانس کے درخت ہیں۔ تاڑ کے درخت اور پتّے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انہی سہولتوں نے تو پوری قوم کو تن آسان اور عیش کوش بنا دیا ہے۔ دیہی معیشت میں تبادلۂ اشیا کا اصول چلتا ہے۔ الف نے ب کو کپڑا دیا۔ ب نے الف کو جوتا دیا۔ حساب برابر۔

قیمتیں پوچھیں تو معلوم ہوا کہ انڈا چار روپے کا ہے اور ماچس ڈھائی روپے کی۔ ہم نے کہا ایک روپے میں کیا خریدا جا سکتا ہے۔ جواب ملا مُمکن ہے سوئی یا بٹن وغیرہ مل جاتا ہو یا پھل بہت سستے ہیں۔ ایک روپے کے چند رمبوتان مل جائیں گے۔ ہم نے پوچھا، ایک روپے سے کم کے سِکّے بھی ہیں؟ معلوم ہوا کہ ہاں پچاس سنٹ ہے۔ پچیس سنٹ ہے وغیرہ۔

ہم نے دریافت کیا اِن سے کیا خریدا جا سکتا ہے؟ پتہ چلا کہ کُچھ بھی نہیں سوائے

پٹرول کے۔

انڈونیشیا میں اگر کوئی چیز سستی دیکھی تو وہ پٹرول ہی تھا۔ ہمارے ہاں کے ڈیڑھ آنے یا دس نئے پیسے کا ایک گیلن بھر۔ دو نئے پاکستانی پیسوں کا ایک لیٹر۔ سِتم کی بات یہ ہے کہ یہی ایک چیز غریبوں کے مصروف کی نہیں۔ حکومت نے خصوصی امداد یعنی subsidy سے پٹرول کو سستا رکھا ہے۔ اِن دنوں یہ بات ہو رہی تھی کی قیمتیں بڑھنے والی ہیں۔ واپسی کے بعد اخبار میں دیکھا کہ بڑھ گئی ہیں۔ آٹھ گُنا ہو گئی ہیں۔ لیکن اب ایک گیلن پٹرول بارہ چودہ آنے کا ہو گیا ہے۔ کتابوں کا حال یہ ہے کہ ہر ہفتے عشرے کے بعد قیمت کی نئی چیپی لگائی جاتی ہے۔ جو کتاب آج پانچ روپے کی ہے، وہ کل پندرہ روپے کی ہوتی ہے اور اگلے ہفتے پچاس روپے جانیے۔ ایک کتاب دیکھی کہ ۱۹۵۲ء کی چھپی ہوئی تھی۔ اُس وقت اِس کی قیمت ساڑھے سات روپے تھی۔ آج وہی ڈھائی سو روپے کی ہے۔ کتابیں نیوز پرنٹ پر غیر مجلّد چھپتی ہیں۔ اب تو وہ بھی نہیں کیونکہ متعدّد کاغذ ساز فیکٹریاں ہونے کے باوجود کاغذ کا کال ہے۔ حکومت نے نیوز پرنٹ کی قیمت ایک سو بیس روپے فی رِم رکھی ہے۔ بازار میں تین سو روپے سے کم نہیں ملتا۔

انڈونیشیا کی سیاست کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، اِس کا اندازہ لگانے کے لئے کسی کو

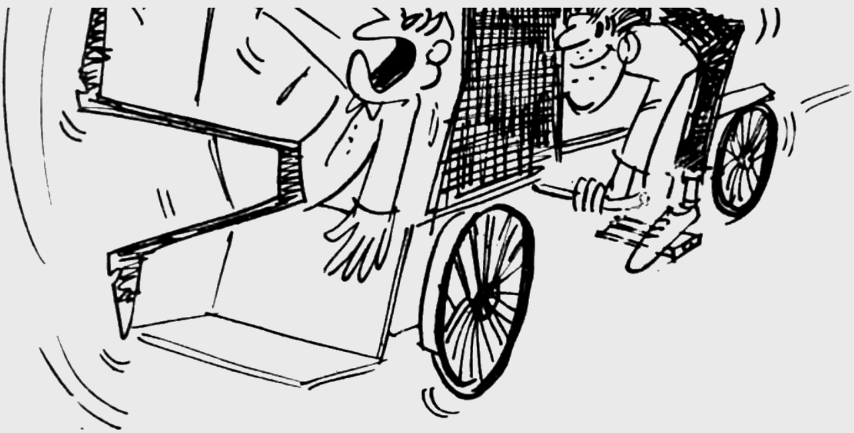
انڈونیشیا جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر نئی صُبح نیا ہنگامہ ہوتا ہے اور دُنیا کے اخباروں سے اِس کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ ہمارے دورانِ قیام کی بعض خبریں تو ہمیں واپسی پر غیر مُلکی اخباروں سے ملیں۔ عین ایسے ہی جیسے منیلا میں ہمارے ہونے پر زلزلہ آیا لیکن ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ واپس آن کر ڈان میں دو کالمی سُرخی دیکھی تو ڈر کے مارے کپکپی طاری ہو گئی۔ سیاست کی شطرنج وہاں کُچھ جماعتوں اور عقیدوں کے اعتبار سے ہے اور کُچھ علاقائی پاسداریوں کے حساب سے۔ دارالحکومت میں طالبِ علموں کا راج دیکھا۔ مظاہرے کرنے کی پوری آزادی ہے۔ بشرطیکہ وہ صدر سوئیکارنو کے حق میں نہ ہوں۔، اخباروں پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ صدر موصوف کے خلاف لکھنے کی سوئیکارنو کے حامی اخبارات پہلے ہی بند کئے جا چُکے ہیں اور جماعتوں پر پابندی لگائی جا چکی ہے۔ لڑکوں میں مظاہروں کا شوق اور نہ پڑھنے کا ذوق پیدا ہو جائے تو انڈونیشیا ہو یا پاکستان تعلیم و تعلم کا خُدا حافظ ہوتا ہے۔ سونے پر سہاگہ اِس بات سے ہوا کہ کاغذ نہ ہونے کے باعث کتابیں ناموجود اور مشرقی جاوا میں تو اسکول ہیں لیکن اُستاد نہیں کیونکہ ہزاروں اساتذہ اِس شُعبہ میں تہ تیغ کر دیے گئے کہ کمیونسٹوں کے خیالات رکھتے تھے۔ طالبِ علم مظاہرین کا وقت محضر تیّار کرنے اور پیش کرنے میں صرف ہوتا ہے اور جب چاہتے ہیں سڑکیں بند کر دیتے

ہیں۔ طالبِ علم جماعت کامی کے اخبار کے ایڈیٹر مکارم کراچی آئے تھے تو ملاقات ہوئی تھی۔ جاکرتا میں اُن سے ملاقات کے لئے جب فون کیا۔ پتہ چلا کہ کیسی ملاقات، وہ مظاہرین کے ہجوم میں شامل ہیں۔ اخبار بھی کھڑے کھڑے چھُٹّی منا لیتے ہیں۔ ایک اخبار میں محض اتنا نوٹس تھا کہ بعض مصروفیتوں کے باعث دو تین روز تک اخبار ہٰذا نہیں نکلے گا۔ چار صفحے کے مُختصر اخبار کی قیمت چار روپے ہے۔

ہم نے پہلے دِن کا کھانا بھی جاوا ریستوران میں کھایا اور واپسی کی شب کا بھی۔ مشہور جگہ ہے اور ہم نے دیکھا کہ کھانے والوں میں غیر مُلکیوں، بالخصوص یورپیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بہت چلتا ہے لیکن ظاہری حالت اُس کی خستہ اور زدہ دیکھی۔ ہم نے کہا یہ شخص اِس کی حالت ٹھیک نہیں کرتا یا فرنیچر کیوں نہیں لاتا۔ باہر سفیدی کیوں نہیں کراتا اور اِن کی گھاس کیوں نہیں کٹواتا۔ ہمارے میزبان نے مُسکرا کر کہا۔ سمجھ دار آدمی ہے۔ آج سفیدی کرے کل دُگنا ٹیکس لگ جائے گا۔ یہاں جو تُم عمارتوں کا ظاہر پرانا دھرانا کائی زدہ دیکھتے ہو تو اِس میں استطاعت کی عِلّت نہیں ہے۔ اللہ کا دیا سب کُچھ ہے۔ بس ٹیکس سے لوگ ڈرتے ہیں۔

دوسری بات جس پر ہمیں حیرت ہوئی قیلولہ تھی۔ قیلولہ ہم بھی کرتے ہیں لیکن فقط روزِ ابر و شبِ مہتاب میں۔ ایران میں دیکھا کہ لوگ دوپہر کو دفتر بند کر دیتے ہیں

اور پھر شام کو چھ بجے دوبارہ چلے آ رہے ہیں۔ بیچ میں کھانا کھا کر سوتے ہیں لیکن جو تقدس قیلولہ کو انڈونیشیا میں حاصل ہے کہیں نہ ہو گا۔ ایک بجا اور دفتر بند۔ سرکاری، غیر سرکاری کی تخصیص نہیں۔ ہمیں اپنے ٹکٹ پر روانگی کا وقت بدلوانا تھا۔ ائیر کمپنی والوں نے کہا اب تو ہم دفتر بند کر رہے ہیں، باقی کل۔ دُکانیں بھی بند۔ کھانا کھایا اور انٹا غفیل ہوئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ سائیکل رکشا والا بھی مسافر کو لے جا رہا ہو اور ایک بج جائے تو سواری سے کہتا ہے کہ یہیں اُتر جایئے صاحب۔۔۔ اب پیدل چلیے۔ بندے کے سونے کا وقت ہے۔ شانِ قلندری کا مظاہرہ رکشا والا ایک بجے سے پہلے بھی کر سکتا ہے اگر اُس کے پاس اُس روز کے کھانے جوگ پیسے ہو جائیں۔ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔۔۔ ان لوگوں کا اصول معلوم ہوتا ہے۔



سائیکل رکشا کو یہاں بیچا کہتے ہیں۔ ہمارے بچّوں کے ڈرانے کی چیز ہوتی ہے لیکن ڈرنے کی اصل چیز انڈونیشی ہے۔ ہمارے ہاں رکشا کھنچا جاتا ہے، وہاں دھکیلا جاتا ہے۔ جیسے کراچی کی سڑکوں پر آئس کریم یا چائے کے ڈبّے بیچنے والے کرتے ہیں۔ گاڑی آگے اور گھوڑا پیچھے کی مثال سمجھ لیجئے۔ فائدہ اِس میں یہ ہے کہ ٹکّر اگر لگتی ہے تو مسافر کو لگتی ہے۔ ڈرائیور تو مزے میں پیچھے ہوتا ہے۔ یہ اختیار بھی ڈرائیور کو حاصل ہے کہ بیچا دوڑاتے ہوئے یک لخت بریک لگالے اور مسافر اپنے حال میں بیٹھا ہوا اُچھل کر سڑک کے بیچ جا گِرے۔ اِس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں کے رکشا والے بھی مشاق ہیں۔ مسافر کو سامنے کی سواری سے ٹکرانے یا چاروں شانے چِت زمین پر گِرانے کا ہُنر جانتے ہیں لیکن کہیں ہمارے ہاں بھی ایسے بیچا چلنے لگیں تو اِن کا کام اور آسان ہو جائے۔ ہم ایک بار اِس میں سوار ضرور ہوئے لیکن پھر فوراً یاد آیا کہ ہمارا تو زندگی کا بیمہ بھی نہیں ہے اور ہوتا بھی تو سُنا ہے خودکشی کرنے والے کو نہیں ملتا۔ تھوڑی دور جا کر اُتر گئے اور رکشا سے جان کی امان پائی۔

ایک دن بندونگ میں

جاکرتا میں پہلی ہی شب کسی نے پوچھا کہ ”اے مہمانِ عزیز بندونگ جاؤ گے۔“

ہم نے کہا۔ ”جی جان سے جائیں گے۔ سر کے بل جائیں گے۔ بندونگ جائیں گے۔ بالی جائیں گے۔ سماترا جائیں گے۔ جہاں جی چاہے لے جایئے۔ ہم آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔۔۔“

باقی گفتگو کو غیر متعلّق تصوّر کر کے میزبانوں نے کہا۔ ”اچھا تو جایئے بندونگ ضرور جایئے۔“

ایک بار ایک سِتم ظریف نے صدر میں ایک وکٹوریا والے کو روک کر پوچھا تھا۔ ”کلفٹن جاؤ گے؟“

وکٹوریاوالا بولا۔ ''ضرور جاؤں گا حضور۔''

''تو پھر جاؤ۔''اُس شخص نے نہایت سر چشمی سے کہا۔

ہم یہی سمجھے کہ ہمارے میزبان بھی ایسی ہی بے تعلّقانہ رواداری کا اظہار کر رہے ہیں۔ ٹھٹک کر رہ گئے اور پوچھا۔ کتنا راستہ ہے؟ کیا کرایہ لگتا ہے؟

''چار پانچ گھنٹے کا ہے۔ ریل بھی جاتی ہے لیکن آپ کو تو مادام سمترو اپنے ساتھ اپنی کار میں لے کر جائیں گی۔''

ہم نے کہا۔ ''چیڑی اور دودو۔''

''نہیں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔'' ہمارے میزبان نے ہمارے اِن کلمات کو شکریہ تصوّر کیا۔ ایک لحاظ سے تھا بھی۔

اگلے روز ہماری سواری باد بہاری سہ پہر کو جاکرتا سے روانہ ہوئی۔ مادام کے پاس تین کاریں ہیں۔ ہفتے میں دو بار بندونگ آتی جاتی ہیں کیونکہ گھر اُن کا بندونگ میں ہے۔ کتابیں چھاپنے کا کاروبار البتّہ بندونگ اور جاکرتا دونوں جگہ بٹا ہوا تھا۔

لنکا دیکھنا ہو تو کولمبو سے باہر جایئے۔ کینڈی تک سفر کیجئے۔ انڈونیشیا کی جھلکیاں

مطلوب ہوں تو جاکرتا سے نکلیں۔ انڈونیشیا کی ہریالی اور دیہاتیت جاکرتا کے مضافات سے نکلتے ہی شروع ہوگئی۔ پھلوں کی دُکانوں میں ایک پھل ہمیں عجیب اور دلکش معلوم ہوا۔ اُس کے گچھّے بندھے ہوئے بِک رہے تھے۔ جہاں کار ٹھہری، بہت سے لوگ گرد جمع ہوگئے۔ ہم نے بادام سے کہا۔

"کیا ہے یہ؟"



عورتیں باتیک بنا رہیں ہیں

بولیں۔ "رمبوتان ہے۔۔۔ کھاؤ گے؟" پھر ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر چار پانچ گچھّے رکھوائے۔ سو سوا سو پھل ہوں گے۔ سائز رمبوتان کا آڑو کے برابر ہوتا ہے۔ جلد سُرخ۔ اُس پر کانٹے سے کھڑے۔ چھیلا تو اندر سے شفاف لیچی کی طرح، مزہ اور خوشبو دِل نواز۔ رستہ بھر ٹھونگتے گئے۔ عُمر بھر کا کوٹا ایک ہی روز کھالیا۔

بندونگ کی شہرت اُس افرو ایشیائی کانفرنس کی وجہ سے ہوئی جو ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوئی تھی۔ پاکستان بھی اِس میں شریک ہوا تھا حالانکہ یہ زمانہ محمد علی بوگرہ مرحوم کا تھا اور اُس وقت تک ہم آٹھواں گانٹھ افرو ایشیائی نہ ہوئے تھے۔ کانفرنس کے اعلانوں اور اصولوں کا بعد میں کیا ہوا، سبھی جانتے ہیں۔ آں دفتر را گاؤ خورد وآں گاؤ را قصاب بُرد۔ بھارت اہتمام کرنے والوں میں آگے آگے تھا لیکن جب کشمیر کی بات چلی تو پنڈت جی نے کہا۔ پنچوں کا کہا سر آنکھوں پر، لیکن پرنالا وہیں رہے گا۔ خیر بندونگ کا جذبہ اور اعلان غتربود ہوئے لیکن بندونگ تو موجود ہی تھا۔ ہم نے کہا۔ اِن درودیوار کو تو دیکھیں جہاں افریقہ اور ایشیا کے آزادی پسند زعما جمع ہوئے تھے اور اِس اجتماع نے مغربیوں کے قصرِ استعماریت کو لرزا دیا تھا۔

لیکن بندونگ ابھی دور تھا۔ البتّہ بوگور آگیا تھا جہاں وہ مشہور قصرِ صدارت ہے جس میں صدر سوئیکانو اپنے اختیارات سے دست کش ہو کر جا ٹکے ہیں۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا

دُعا دیتا ہوں رہزن کو۔ جا کرتا کے قصرِ مردیگا اور بوگور کے محل آنے جانے کے لئے صدر موصوف ہیلی کاپٹر استعمال کرتے ہیں۔ جب سے اُن کی ہوا بگڑی ہے اُس وقت سے تو بالخصوص یہ محل جس کے ہم نے فقط بند پھاٹک دیکھے اور دور سے اِس کی پرانی ساخت کی لیکن پُر شکوہ عمارت کا نظّارہ کیا، اپنے اسبابِ فاخرہ کے لئے مشہور ہے۔

صدر سوئیکانو نے کہ شوقین آدمی ہیں، اِسے مُلک مُلک کی تصویروں، قالینوں، شیشہ آلات اور دوسرے نوادر سے سجایا ہے۔ اِس محل کی پُشت پر بوگور کا مشہور نباتاتی باغ ہے۔ اِسے دیکھنا بھی ہمارے پروگرام میں شامل تھا لیکن دیکھا کہ پھاٹک بند ہے۔ سوچا سہ پہر ہو چکی اِس لئے بند ہو گا لیکن واپسی ہماری صُبح دم ہوئی تب بھی بند ملا۔ آخر ہم نے باغ کے داروغہ سے ملاقات کی اور اقوامِ متحدہ کا نام درمیان میں لائے تو بطورِ خاص اجازت ملی۔ معلوم ہوا کہ آج کل اِسے احتیاطاً بند رکھا جاتا ہے کیونکہ صدارتی محل کے عین پچھواڑے واقع ہے۔ وہ حصّہ جو صدارتی محل کے ساتھ لگتا ہے وہاں جانے پر تُو خاص طور پر قدغن ہے۔ لیکن ہم تو وہاں بھی گئے۔ استوائی خطّہ کے بُلند قامت اور نادر الوجود درختوں پیڑوں اور پھولوں کی سیر کی لیکن یہاں ہم اِس سیر کو تھوڑا ہی آئے تھے۔ اِس کی ویرانی بھی ہمیں عبرت کا تماشا

نظر آئی۔

ہے بہارِ باغ دُنیا چند روز
یعنی ہر شے کا تماشا چند روز

راستے کے ہر دو جانب جنگل تھے اور اُن کے پیچھے پہاڑ تھے۔ ابر سے ڈھکے ہوئے ہمارے بندونگ پہنچنے تک در و دیوار پر تاریکی کا پہرا لگ چُکا تھا۔ یہاں کی فضا کھُلی اور خوشگوار تھی۔ جاکرتا میں تو بیزار کرنے والی گرمی تھی لیکن یہاں خُنکی کا راج تھا۔ مکان بھی نیچی ڈھلوان چھتّوں والے۔ لگتا تھا ہالینڈ کے دیہات ہیں۔ انگریز ہمارے مُلک میں آئے تو اُنہوں نے یہاں کوٹھیاں اور بنگلے انگریزی طرز کے بنائے۔ ڈچوں نے بھی ہالینڈ کے طرزِ تعمیر کو رواج دے کر وطن کی یاد کو تازہ کیا۔ قلبِ شہر سے بازار شروع ہوا۔ کُچھ دُکانیں کھُلی تھیں لیکن اکثر بند۔ ہاں ریڑھیوں اور خوانچہ والے کھڑے بیٹھے ہانکیں لگا رہے تھے۔ دہنی طرف کو ایک میدان سا نظر آیا جس کے گرد گرد بیچا یعنی سائیکل رکشہ والے کھڑے تھے۔ بائیں ہاتھ کو ایک خاصی وسیع عمارت دکھائی دی۔ مادام ستمرو نے کہا یہاں ہوئی تھی بندونگ کانفرنس۔ صدر دروازے کی سلاخوں کے پیچھے فوجی پہرہ بھی نظر آیا۔ اِس سے چند قدم دہنے ہاتھ ہمارا ہوٹل تھا۔ ہوٹل سیوائے ہومان۔

ہوٹل سیوائے ہومان ایک بہت وسیع و عریض عمارت ہے۔ کئی سو کمرے ہوں گے۔ مُمکن ہے کسی ولندیزی بزُرگ نے بنایا ہو۔ کیونکہ اندر کا ناک نقشہ مغربی طرزِ معاشرت کا ہے۔ جدید تو بالکل نہیں ہے لیکن آرام دہ ہے۔ کمرے بڑے بڑے۔ غُسل خانوں کے ٹب ٹوٹے ہوئے۔ شیشے اندھے یا نیم اندھے۔ ہمارا کمرہ بھی خواب گاہ اور نشست گاہ، دو حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ صوفے گرد آلود اور بھاری۔ فون پرانی وضع کے۔ ہوٹل پہلی جنگِ عظیم کے لگ بھگ کی فضا میں سانس لے رہا تھا لیکن ہمارا کمرہ حسنِ اتّفاق سے سامنے کے رُخ تھا۔ آگے آگے کُچھ بر آمد بھی تھا۔ سامنے بہت سے آہنی پول کھڑے تھے۔ یہاں بندونگ کانفرنس کے زمانے میں مختلف مُلکوں کے جھنڈے لہراتے ہوں گے۔ کیوں کہ کانفرنس کے زیادہ تر مندوب اِسی ہوٹل میں فروکش تھے۔

ہمارے اِس کمرے میں جانے کون ٹھہرا ہو گا۔

راستے میں رمبوتان اتنے کھائے تھے کہ اب ڈنر کی جگہ نہ تھی تاہم چند نوالے اپنا جی رکھنے کو کھائے۔ ڈائیننگ ہال میں کوئی نہ تھا بس ہم تھے۔ اِس وقت تو باجے والوں نے جو بیٹھے جمائیاں لے رہے تھے اور سر کھُجا رہے تھے ہماری تالیفِ قلب کے لئے تھوڑا انگریزی باجا بھی بجایا۔

اب دلِ آوارہ نے قصد باہر کی سیر کا کیا۔ جدِھر رونق نظر آئی اُدھر کو نکل گئے۔ فُٹ پاتھوں پر کُچھ لوگ اخبار، پلاسٹک کی چھوٹی موٹی چیزیں اور سگریٹ لیے بیٹھے تھے۔ آگے کُلچوں اور کبابوں والوں کی ریڑھیاں تھیں۔ ایک لمبا چکّر کاٹ کر اور بندونگ کانفرنس کی عمارت کے چَو طرفہ گھوم کر ہم پھر اپنے ہوٹل کی سڑک کی طرف آئے۔ یہاں فٹ پاتھ پر ایک بھلے مانس نے ہمارا راستہ روکا اور پوچھا۔

”ٹیکسی؟“

ہم نے کہا۔ ”نو۔ ہمارا ہوٹل قریب ہی ہے۔“

ہماری کُند ذہنی کو بھانپ کر کھنکار کر وضاحت کی ”ٹیکسی گرل۔“

ہم نے کہا۔ ”نو نو۔“

”ڈچ گرل، انڈونیشین گرل، بیوٹی فل۔“

ہم نے کہا۔ ”نو۔ نو۔ نو۔ نو۔“

ہمیں حقارت سے دیکھتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔ آدھی رات کو ہم نے بالکونی میں سے دیکھا اب بھی وہ سامنے چوراہے میں چکّر کاٹ رہا تھا۔ یہ ہوٹل سیّاحوں کا مرکز

ہے لیکن اس روز کا کاروبار مندا ہی معلوم ہوتا تھا۔

دوسرے روز ہم نے کُچھ تو اپنا کارِ منصبی بھگتایا کُچھ بندونگ کے سرسبز و شاداب کوچوں کی سیر کی۔ واقعی سکون کی دُنیا ہے۔ جنّت کا نقشہ ہے۔ خُدا جانے اِس شہر کو چھوڑ کر لوگ جاکرتا میں رہتے کیوں ہیں۔ ویسے بندونگ بھی خاصا شہر ہے۔ مغربی جاوا کے صوبے کا دارالحکومت ہے۔ گورنر بہادر یہیں رہتے ہیں۔ سُنڈا والوں کا گڑھ یہی ہے جو اہلِ جاوا کے زیادہ محبّ و مشتاق نہیں۔ واپسی کے سفر میں مادام سمترو نے پوچھا۔ ”صدر سوئیکارنو کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“

فرمایا۔ ”پہلے آپ۔“

آخر ہم کہا۔ ”ہماری روئے تو بُری نہیں ہے“

تیوری چڑھا کر چُپ ہو گئیں۔ تھوڑا آگے چل کر ایک سوال کیا۔

”ناسی کورنگ کے متعلّق آپ کی کیا رائے ہے؟ پسند آیا؟“

ہم نے ذہن پر بہت زور دیا کُچھ یاد نہ آیا۔ آخر پوچھا۔ ”یہ کون بزرگ ہیں؟ کوئی

جرنیل ہیں؟ صدر سوئیکارنو کے حامی ہیں یا خلاف ہیں؟“

کھلِکھلِا کر ہنسیں۔ کہا۔ ”یہ کسی آدمی کا نام تھوڑا ہی ہے۔ میں تو ناسی کورنگ کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

اب ہم پر کھُلا کہ اُس پُر فضا گاؤں کی طرف اشارہ ہے جس میں سے ہم گُزر رہے تھے۔

ہم نے کہا۔ ”اچھّا ہے۔ کھُلی فضا ہے۔ آبادی کم معلوم ہوتی ہے۔“

اپنی چاندی کی گھنٹیوں والی آواز میں پھر ہنسیں۔ عُمر تو اِن کی ایسی کم نہیں لیکن ہنستے اور باتیں کرتے میں بچّہ لگتی ہیں۔ آخر بولیں۔ ”بابا! میں رات کے کھانے کی بات کر رہی ہوں۔ رات کے مسالہ دار بھونے ہوئے چاولوں کی طرف اشارہ ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمارے ہاں معمّے بجھواتے وقت یہ وضاحت کر دی جاتی ہے کہ شے مذکورہ کا تعلّق نباتات سے یا حیوانات سے ہے یا جمادات سے۔ آئندہ آپ کسی چیز کے متعلّق پوچھیں تو وضاحت کر دیا کیجئے کہ رمبوتان کسی جرنیل کا نام ہے یا درخت کا میوہ ہے۔ یا عمارت ہے۔ پرندہ ہے یا دودھ والا جانور۔“

اجنبی مُلکوں میں ناموں کے ساتھ مسافر کو اِس قسم کے تجربے ہوا ہی کرتے ہیں۔ اگر مادام سمترو ہمارے ہاں چند دِن رہیں اور تھوڑی بہت شُد بُد بھی یہاں کے ناموں کے متعلّق حاصل کر لیں تب بھی اِس امر کا امکان ہے کہ پوچھیں کھارا در کے متعلّق کیا رائے ہے۔"

اور وہ فرمائیں۔ "اچھّا ہے لیکن اِس میں مرچیں زیادہ تھیں۔۔۔"

ہم پوچھیں۔ "روغن جوش کو آپ نے کیسا پایا۔"

اور وہ جواب دیں کہ "بڑا شاعر ہے لیکن زبان مُشکل لکھتا ہے۔" اور چند دِن کے قیام میں تو جوش اور روغن کا پتہ نہیں چلتا خصوصاً جبکہ مرغّن دونوں ہوں۔

باتیں اس کی یاد رہیں

اب جو ذکر اُس بطلِ جلیل کا آیا ہے تو کُچھ باتیں اُس کی سُنئیے۔ اس کی یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سُنئیے گا۔

صدر سوئیکارنو نے دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں سے تعاون کیا تھا کیونکہ ولندیزوں سے اور اُن کے واسطے سے اتحادیوں سے سوئیکارنو اور اُن کے حریّت پسند ساتھی خوش نہ تھے۔ جاپانیوں سے تعاون کیا لیکن اُن کے سو فیصد پٹھّو یہ بھی نہ ہوئے۔ اپنی قوم کو مضبُوط اور مسلح کرتے رہے۔ جاپانیوں نے اِن سے آزادی کا وعدہ کیا تھا۔ جاپانی شکست نہ کھاتے تو یہ کہنا مُشکل ہے کہ اِس وعدے کا ایفا کہاں تک ہوتا۔ خیر اُدھر جاپان کی طاقت ٹوٹی۔ اِدھر اتحاد کی دوبارہ قبضہ کرنے اور ہالینڈ کو مسلّط کرنے کے لئے آموجود ہوئے۔ لیکن انڈونیشی قوم نے اپنی آزادی کا اعلان

کیا۔ جمہوریہ بنالی اور پھر مل کر بیٹھ کر سوئیکار نو کو اپنا صدر مقرّر کیا۔

یہ سب کُچھ بڑی بے سروسامانی میں ہوا۔ بس پنچائیت بیٹھی اور ایک بات کہہ دی۔ اِن کی بی بی فاطمہ وتی نے ایک کپڑا لال لیا اور دوسرا سفید اور دونوں کو سی کر پرچم بنا لیا۔ زمین میں ایک بانس گڑا تھا اُسے اکھاڑ کر یہ پرچم اُس سے لٹکا دیا۔ یہ بانس کُچھ ایسا لمبا بھی نہ تھا لیکن اُس وقت بس یہی میسّر تھا۔ باجے بھی نہ بجے اعلان آزادی بھی جو ساڑھے تین سو سال کی غُلامی کا جوا اُتار پھینکنے پر پڑھا گیا۔ آبِ زر سے کسی خریطے پر رقم نہ کیا گیا تھا بلکہ سوئیکار نو فرماتے ہیں کہ ایک بچّے کی اسکول کی کاپی سے لکیر دار کاغذ کا ایک ورق پھاڑ کر میں نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا اور میرے ساتھ ڈاکٹر حتیٰ نے اُس پر دستخط کر دیے تھے۔ یہ سب کُچھ تو ہوا لیکن ہالینڈ والوں کو تو اپنی سلطنت کا گم گشتہ نگیں انڈونیشیا بازیاب کرنے کی فکر تھی۔ اُن کے ساتھ جمعیت تھی اور ہتھیار ڈالتے وقت جاپانیوں کو بھی یہ وعدہ کرنا پڑا تھا کہ ہم سلطنت اور نظامِ سلطنت آپ کے حوالے کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے نئی جمہوریہ کو مع اُس کے صدر کے جو کھدیڑا تو اُنہیں جاکرتا سے بھاگ کر جوگجاکرتا میں پناہ لینی پڑی۔

جب قوم نے ڈاکٹر سوئیکار نو کو اپنا صدر بنایا۔ امیرِ مملکت نامزد کیا تو سوئیکار نو کہتے ہیں کہ نہ مُجھے پر رقّت طاری ہوئی، نہ میں نے کوئی جذباتی تقریر کی۔ یہ سارا کھیل معلوم

ہوتا تھا۔ لوگوں نے کہا آپ صدر بن جائیں۔ میں نے کہا۔ اچھّا بھئی۔۔ او۔ کے۔ اس مقامِ بُلند پر فائز ہونے کے بعد بھی شام کو مُجھے پیدل ہی گھر آنا پڑا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ راستے میں ایک تکّے کباب بیچنے والا ننگے پاؤں بیٹھا انگیٹھی سُلگاتے نظر آیا۔



ہز ایکسیلنسی صدر جمہوریہ انڈونیشیا وہیں اپنے پائنچے اُونچے کر کے زمین پر بیٹھ گئے

اور کہا بنانا تو میاں پچاس ایک سیخیں۔ وہ بناتا گیا اور ہم کھاتے گئے۔ یہ تھی جشنِ آزادی کی دعوت۔"

لیکن اب وہ مرحلہ تھا کہ ولندیزوں نے اس آزادی پر کمپا مار کر صاحبِ صدر اور اُن کی حکومت کو جو جاکر تا بھگا دیا تھا۔ یہ بات ۴ جولائی ۱۹۴۶ء کی ہے۔ ہمارے ہاں بھی آزادی کی آمد آمد کا غلغلہ تھا اور انڈونیشیا کی جمہوریہ ہمارے قومی اخباروں کی سُرخیوں میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ لیکن اب آیئے صدر سوئیکارنو کی زبانی سنیئے۔

"ہم حکومت سے زیادہ چوروں کا ٹولہ معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے پاس کُچھ بھی تو نہ تھا۔ نہ ٹائپ رائٹر، نہ کاغذ۔ نہ ہوائی جہاز۔ کُچھ سامان ٹوٹا پھوٹا ریڈیو کا تھا وہ بھی ۱۹۳۵ء کا پرانا۔ خزانہ عامرہ میں کُچھ بھی نہ تھا۔ جاپانی سِکّے کی بھی قیمت نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر سوہارتو (یہ اور سوہارتو ہوں گے) ہمارے خازن یا وزیرِ خزانہ تھے۔ ان کے پاس نوٹوں کے گننے کا وقت نہ تھا۔ بس ڈھیر کے ڈھیر تول کر سیروں کے حساب بھیج دیتے تھے۔ البتّہ مرکزی جاوا پہنچ کر ہم نے اپنی کرنسی خود تیّار کرنی شروع کر دی۔ لیکن اِسے کوئی بھی قبول نہ کرتا تھا۔ ہمارے پاس اِس کرنسی کی پُشتی بانی کے لئے کیا تھا؟ سوائے اس ہینڈ پریس کے جس پر ہم نوٹ چھاپتے تھے۔ سونے چاندی کا تو نام نہ لیجئے۔

ہمارا کام چلتا تھا اسمگلنگ سے۔ ہر شخص اسمگل کرتا تھا۔ آج کل (۱۹۶۴ء) جو ہمارا سفیر ہے وہ شکّر اسمگل کرتا تھا۔ امریکہ میں ہمارا سابق سفیر افیم کا اسمگلر تھا۔ اسمگلروں کے چار مشہور اڈّے تھے۔ سنگاپور۔ بنکاک۔ ہانگ کانگ۔ اور منیلا۔ ہمارے آدمی چاروں جگہ کام کر رہے تھے۔

سنگاپور تو ہمارے لیے سونے کی کان تھی۔ وہاں کے گوداموں میں جتنا کپڑا تھا وہ ہم اُٹھوا لائے تھے۔ پھر انکشاف ہوا کہ انگریزوں کو رشوت دینا بھی مُشکل نہیں۔ یہ بزرگ ہم سے افیم لیتے اور فوجی اسٹور سے فوجی وردیوں کے گٹھڑ اُٹھا کر ہمارے ہمارے حوالے کر دیتے۔ بعد ازاں اِس بات پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اسٹور کو آگ لگا دیتے تھے۔ اِن دِنوں ہر روز سنگاپور کے فوجی اسٹور میں کئی جگہ آگ لگتی تھی۔

ہمارے فوجی جوانوں کی سج دھج بھی دیکھنے کی ہوتی تھی۔ ایک رجمنٹ کو دیکھا کہ کینیڈین ٹوپیاں پہنے ہوئے ہے۔ دوسری رجمنٹ انگریزی بلاؤز زیبِ تن کئے ہوئے تھی۔ ایک صاحب نے مجھے ایک روز مجھے ایک پیکٹ تحفے میں لا کر دیا۔ یہ آسٹریلیا کی زنانہ فوجی کور کا اسکرٹ ہے۔ لانے والا بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بہت عُمدہ مال ہے اور بالکل نیا نکور۔ سکرٹ پہنتا تو میں کیا بھلا معلوم ہوتا۔ میں نے اُس کی دو نیکریں بنوا لیں اور کئی سال تک پہنیں۔



میری کابینہ کے ایک عالی مقام رکن نے سماترا سے نو سیر سونا اور ۳۰ سیر چاندی اسمگل کی اور اس سے ہم نے بیس ہزار وردیوں کی قیمت چکائی۔ یہ صاحب جن کا نام میاں غنی تھا، ہالینڈ والے انہیں چھٹے ہوئے بد معاش کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن ہماری کابینہ میں اِن کا لقب وزیرِ اقتصادیات تھا۔ پیسے لے کر کام کرنے والے غیر ملکی طالع آزماؤں کے علاوہ کُچھ دلی ہمدردی بھی تھے۔ ایک روز ایک لڑکا سا آیا بولا میرا نام باب فریبرگ ہے میں امریکن ہوں اور پائلٹ ہوں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں۔

ان دونوں ہانگ کانگ پرانے سیکنڈ ہینڈ ہوائی جہازوں کی منڈی بنا ہوا تھا۔ ہانگ کانگ میں کیا نہیں مل سکتا۔ گِرہ میں دام ہونے چاہیں۔ ہم نے دو پرانے ڈکوٹا جہاز خریدے اور باب فریبرگ مُجھے جگہ جگہ اُڑائے لیے پھرا۔ افسوس کہ ۱۹۴۷ء میں جب وہ سماترا کے چھاپے ماروں کے لیے روپیہ لے کر جا رہا تھا اُس کا جہاز گر کر تباہ ہو گیا۔

ہندوستانیوں نے بھی ہماری مدد کی۔ (یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے) سورابایا کی لڑائی میں چھ سو ہندوستانی بھاگ کر ہم سے آ ملے۔ یہ لوگ پیدائشی اسمگلر ہیں۔ ہندوستان میں اِن دِنوں قحط پڑ رہا تھا۔ یہاں سے یہ لوگ چاول لے گئے اور جواباً ایک

ہوائی جہاز ہمارے لیے اسمگل کر لائے۔ یہ جہاز آدھی رات کو منیلا روانہ ہوتا تھا۔ کافی اور کونین لے کر اور واپسی پر دوائیں، مشینی پُرزوں اور گولہ بارود سے بھرا آتا تھا۔

یاد رہے کہ ہالینڈ والوں نے انڈونیشیا کی مکمّل ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن وہ اپنی ضرورت سے خود اسمگل کراتے تھے۔ وہ یُوں کہ اُنہیں ٹین اور ربڑ کی سخت ضرورت تھی۔ یہ شے انڈونیشیا سے خریدتے اور انگریزوں سے ڈچ لیتے تھے۔ بے خبر اس کاروبار سے کوئی بھی نہ تھا۔

پھر جب ولندیزوں کو مجبور ہو کر مصالحت کے لیے مذاکرات کرنے پڑے تو سوئیکارنو صاحب کے وفد میں ایک دیہاتی ڈاکٹر لیمینا نامی شامل تھے۔ یہ صاحب بعد ازاں نائب وزیرِ اعظم بھی بنے۔ مذہباً عیسائی تھے۔ وفد میں تو شامل ہو گئے لیکن کپڑوں کے نام سے اِن کے پاس فقط دو نیکریں تھیں اور دو قمیصیں۔ ایک پہنتے تھے ایک دھوتے تھے۔ سرکاری دعوتوں میں جانے کے لیے ایک دوست سے مانگ کر ٹائی بھی پہن لیتے تھے۔ سوئیکارنو نے کہا کپڑوں کا کیا کرو گے؟ لیمینا صاحب بولے۔ ”فکر مت کرو۔ میں اپنے کمرے میں جن صاحب کے ساتھ رہتا ہوں اُن کا قد کاٹھ مُجھی سا ہے۔ اُس کے کپڑے مُجھے پورے فِٹ نہیں آتے لیکن کام چل سکتا ہے۔

ایک دو دِن کی تو بات ہے۔ میں نے اُن کا سوٹ ادھار مانگ لیا ہے۔

انڈونیشی ڈیلیگیشن میں کُچھ اور لوگ بھی ایسے ہی تھے بلکہ بعضوں نے تو جوتے مانگے کے پہنے تھے۔ اِدھر ہالینڈ کے ڈپلومیٹ پورے کروفر کے ساتھ چرمی بریف کیس لیے بے داغ سوٹ اور ریشمی جیکٹ میں بنے ٹھنے آتے تھے۔ انگریز جو غیر جانبدار فریق کے طور پر شریک تھے سبھی کے سبھی یا تو سَر تھے یا لارڈ۔ وہ جب ہمارے آدمیوں کو یوئر ایکسی لینسی کہہ کر خطاب کرتے تو ہمیں بہت مزا آتا تھا۔

صدر سوئیکارنو آزادی کے مزے بیان کرتے ہوئے اپنی رام کہانی میں فرماتے ہیں:

"اب ہم نے بین الاقوامی دُنیا میں بھی پر پُرزے نکالے اور سب سے پہلے عرب لیگ ہندوستان، برما، افغانستان، چین، امریکہ، برطانیہ اور چیکوسلوواکیہ سے اپنے سفارتی تعلّقات قائم کئے۔ فلپائن میں ہمارے پہلے ہز ایکسی لینسی سفیر کی تنخواہ چھ ڈالر (تیس روپے) فی ہفتہ تھی۔ سفارت خانہ ایک حجام کے گھر میں واقع تھا اور وہیں سفیر صاحب اور اُن کی بیگم کھانا بھی کھاتے تھے۔ ایک روز صدر فلپائن نے یاد فرمایا تو یہ اُسی نائی کا کوٹ ادھار مانگ کر پہن کر گئے۔ ایک روز سفیر صاحب کی کُل پونجی بیس سینٹ یعنی سوا روپے کے لگ بھگ رہ گئی تو میاں بی بی نے بازار سے تین سیب

خریدے اور اُن کو پانی کے ساتھ کھا کر دو دِن گزار دیئے۔



ہمارا پہلا مہمان فلپائن کے صدر رومولو صاحب تھے۔ مشروبات کے نام سے اُن کو ہمارے ساتھ پانی پینا پڑا۔ شراب کہاں سے لاتے؟

جب ہندوستان اور چین نے اپنے قونصل خانے جاکرتا میں کھولے تو میں نے اُن کو سرکاری ضیافت دینا مناسب خیال کیا۔ برتنوں کے نام سے میرے پاس پلاسٹک کی چند ہری پیالیاں اور پرچیں تھیں۔ آخر میرا آدمی مطہّر بھاگا بھاگا بازار گیا اور ایک چینی ریستوران سے پلیٹیں اور چھری کانٹے مانگ کر لایا۔ دستر خوان وغیرہ پڑوس

کے گھروں سے اکٹھے کیئے۔

ہر ملک کے صدر کا ایک فوجی افسر ایڈی کانگ بھی ہوتا ہے۔ اُس کے بغیر کروفر پورا نہیں ہو سکتا۔ ایک لڑکا مُجھے پسند تھا میں نے اُس سے کہا۔ "دیکھو میاں آج سے تُم لیفٹیننٹ۔۔۔ سمجھے۔"

وہ بہت خوش ہوا اور مُجھے سلام کیا۔ لیکن اُس کے بعد میرے ایک مشیر نے کہا۔ یہ آپ نے کیا کیا؟ ہالینڈ کی ملکہ جولیانا فقط ایک کروڑ باشندوں پر حکمران ہے لیکن اُس کا ایڈی کانگ محض ایک کرنل ہے۔ سات کروڑ کے حکمران صدر جمہوریہ انڈونیشیا کا ایڈی کانگ محض ایک لیفٹیننٹ۔

"کہتے تو تُم ٹھیک ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کب سے لیفٹیننٹ ہو۔"

"جناب کوئی ڈیڑھ گھنٹے سے ہیں۔" اُس نے سلوٹ مار کر کہا۔

"خیر ہم ایک نوجوان قوم ہیں اور تیزی سے ترّقی کرنا چاہتے ہیں۔ آج سہ پہر سے تُم میجر۔"

اُن دِنوں میں جب بھی چاہتا جوگجاکرتا کی گلیوں میں نِکل جاتا۔ کبھی بچّوں کے ساتھ

گیند کھیلتا۔ کبھی کسی گھر میں داخل ہو کر گرم گرم سبزیوں کا ذائقہ چکھتا۔ کسانوں سے اُن کا احوال پوچھتا۔۔۔ ”کیسے ہو؟ بال بچّے راضی۔۔“

لوگوں نے بھی آزادی کا مطلب جو چاہا سمجھا۔ ٹرام میں کسی نے کرایہ مانگا تو ٹکہ سا جواب دیتے۔ ”کیسے پیسے۔ اب ہم آزاد نہیں کیا۔“

ہماری افواج کی پہلی سالگرہ پر مناسب سمجھا گیا کہ گھوڑے پر بیٹھ کر جائزہ لوں۔ مُشکل یہ تھی کہ مُجھے گھوڑے کی سواری نہ آتی تھی۔

”کیا کرو گے؟“ فاطمہ وتی نے پوچھا۔

”سیکھوں گا کسی سے؟“ میں نے کہا۔

”لیکن پریڈ تو کل ہے۔“

”پھر تو ایک دِن میں سیکھنا ہو گا۔“

آخر میں نے ایک افسر سے کہا۔ ”بھائی میرے لئے کوئی بہت مسکین، ضعیف، سال خوردہ، نیم مُردہ گھوڑا ڈھونڈ کے لاؤ۔ رسم ہی تو پوری کرنی ہے۔“ لیکن افسر نے کہا۔ ”نہیں، جی نہیں۔ صدر کی سواری کوئی مذاق نہیں ہے۔ جوان درشنی گھوڑا آئے

گا۔"

میں اُس پر سوار تو ہو گیا لیکن باجے گاجے بجے تو بِدک کر بھاگا۔ میری جان نکلی جا رہی تھی لیکن اتنے لوگوں کے سامنے ہیٹی کیسے کراتا۔ تن کر سیلوٹ کے لئے ہاتھ اُٹھالیا اور سلامی لینی شروع کی۔ اِس حیوان کے جی میں بھی نیکی آئی اور اُس نے مُجھے نیچے پٹخا بھی نہیں۔"

زاں پیشتر کہ ہم انڈونیشیا سے آگے چلیں اور صدر سوئیکارنو سے اجازت لیں۔ ایک بے تکلّف ٹکڑا اُن کی سوانح میں سے اور ملاحظہ ہو۔ موقع یہ ہے کہ ہیروشیما پر بم پڑا اور جاپانیوں کو اپنا حشر سامنے دکھائی دیا تو اُنہوں نے طے کر کے کہ انڈونیشیوں کو آزاد کر دیا جائے کُچھ لیڈروں کو ہوائی جہاز میں سائیگون طلب کیا۔

واپسی پر جو جہاز ہمیں ملا وہ ایک بمبار تھا جس میں جا بجا گولیوں کے سوراخ تھے۔ اُس میں بس پائلٹ اور کو پائلٹ تھے یا ہم۔ سیٹیں بھی نہ تھیں۔ یا تو کھڑے ہو یا سارا وقت لیٹے رہو۔ اتنی بُلندی پر سردی میں یخ ہو رہے تھے۔ ٹمپریچر کنٹرول کرنے کا کوئی انتظام نہ تھا حتّٰی کہ بیت الخلا بھی نہیں تھا۔

"مُجھے تو زوروں کا پیشاب لگ رہا ہے۔" میں نے ایک ساتھی سے کہا۔ اُس نے اِدھر

اُدھر دیکھ کر کہا۔

”اور تو کوئی جگہ ہے نہیں۔ یہیں کر لو۔“

تھوڑی دیر تک تو میں نے ٹالا پھر اُٹھ کر جہاز کے عقبی حصّے میں گیا اور وہاں بیٹھ کر پیشاب کیا۔ ستم ہوا کہ اُسی لمحے گولیوں کے سوراخوں میں سے ہوا کا جھونکا آیا اور اُس نے ایک زور دار تریڑے کی کُچھ صورت سب کچھ اُلچ کر میرے پاک صاف ساتھیوں پر ڈال دیا۔ بے چارے بیٹھے بیٹھے شرابور ہو گئے۔

ایسے جہاز میں واپسی علامت تھی اس بات کی کہ اب جاپانیوں کو ہم سے توقّع اُٹھ گئی ہے۔ لیکن ہم تو اُسے بھی اُن کی شرافت ہی کہیں گے کہ واپسی کے لئے سواری دی۔ جانے کو نہیں کہا۔

متفرقاتِ انڈونیشیا

اگر آپ کو کُچھ شُد بُد ہندی کے سنسکرت الاصل لفظوں کی ہے اور کُچھ دخل عربی میں بھی ہے، الفاظ کی حد تک سہی، تو انڈونیشی زبان کے بہت سے الفاظ آپ کے لیے اجنبی نہ نکلیں گے۔ یہی بات آپ ملائشیا کے بارے میں بھی سمجھئے۔ اگرچہ رسم الخط کا فرق رہے گا۔ انڈونیشیا والے رومن رسم الخط رکھتے ہیں۔ ملائشیا میں عربی رسم الخط بھی چلتا ہے۔ پھر رومن میں ایک ہی لفظ کے ہجے انڈونیشیا والے کُچھ کریں گے ملائشیا والے کُچھ۔ وہ اِس لئے کہ انڈونیشیا ولندیزوں کے تحت تھا اور یہ مُلک انگریزی کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ انڈونیشیا میں ج کے لئے DJ لکھنا ہو گا کیونکہ خالی جے J کا تلفّظ ژ کا ہے۔ ملایا اور سنگاپور میں انگریزی کا سا تلفّظ ہے۔

مشہور جرنیل ناسوتیاں کو ہمارے ہاں بہت سے لوگ ناسوشن لکھتے ہیں یہ خیال کر

کے وہاں tion کا مطلب شن ہی ہو گا۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب انڈونیشیا کے لوگ بھی ڈچ سے دور اور انگریزی زبان سے قریب آ رہے ہیں اور اِس کا اثر تلفّظ بھی پڑے گا۔ ہجّوں کی اصلاح بھی ہو رہی ہے۔ OE کی آواز ڈچ حساب سے وہی ہے جو انگریزی میں U کی ہے۔ سوکارنو کو ہم لوگ سوئیکارنو اس لئے لکھتے ہیں کہ رومن حروف میں وہ بالعموم soekarno لکھا جاتا ہے۔ نئ کتابوں میں اِس کی بجائے U ہی ہے۔ خود سوکارنو صاحب کو دستخط کرنے ہوں تو نیچے انگریزی میں ٹائپ ہیں sukarno ہی لکھا ہو گا لیکن دستخط تو عُمر بھر کی عادت ہیں۔ اِن کا بدلنا اتنا آسان نہیں۔ ان میں وہی oe برقرار ہے۔

انڈونیشیا کے مشہور اور مرحوم سوشلسٹ رہنما کو ہمارے ہاں سُلطان شہریار لکھا جاتا ہے۔ سُلطان تو خیر وہ نہ تھے۔ سوتن تھے۔ لیکن sjahrir کو جو بعض لوگ سجاہریر پڑھتے رہے وہ بھی غَلَط تھا کیونکہ SJ کا مطلب ش ہے۔ شہریار تھے یا کُچھ اور۔۔۔۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔

انڈونیشیا میں اسلام آنے کی طرح کوئی چھ سات صدی پہلے آیا وہ پرانا نہیں۔ اس سے پہلے یہاں مقامی ہندو بادشاہتوں کے اثرات زیادہ رہے ہیں۔ بالی کے جزیرے میں تو ہندو اب بھی خاصی تعداد میں ہیں اور ہندو روایات اور اساطیر انڈونیشیا زندگی

میں رسی بسی ہیں۔ رامائن اور مہ بھارت وہاں کے تہذیبی ورثے میں شامل ہیں۔ رقص سے لے کر دیگر تفریحات کٹھ پُتلیوں اور نقابوں تک پر اِن کی چھاپ ہے۔ پرانے طرزِ تعمیر پر بھی ہندو اثرات غالب تھے۔ پھر اِن کی جگہ مغربی اثرات نے کی۔ مسجدوں کا طرزِ تعمیر بھی وہاں ہم سے الگ ہے۔ بیچ کا گُنبد تو خاصا بڑا ہوتا ہے بلکہ نصف کٹرے سے زیادہ۔ لیکن کونوں کے منارے اُونچے نہیں ہوتے۔ ویسے مسجدیں بھی ایک وضع کی نہیں، کئی وضعوں کی دیکھنے میں آئیں۔ اِس ذکر میں ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ انڈونیشیا میں قریب قریب سبھی مُسلمان شافعی مسلک کے ہیں۔ شیعیت اِن جزائر میں کبھی نہیں پُہنچی۔ احمدی حضرات البتّہ تھوڑی سی تعداد میں ہیں۔

آبادی کا نمایاں حصّہ مسلمان ہونے کے باوجود انڈونیشیا میں دوسرے مذہبوں سے رواداری برتی جارہی ہے. ایک عمارت عالی شان ہمارے ہوٹل سے کُچھ دُور اور سرینا ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے بن رہی ہے۔ معلوم ہوا یہ امورِ مذہبی کے لئے وقف ہو گی۔ ہم نے پوچھا یہاں اسلام پر ریسرچ ہو گی کیا؟ ہمارے دوستوں نے بتایا کہ نہیں یہ سبھی مذاہب کے لئے ہے۔ ویسے اسلامی اور اسلام پسند سیاسی اور غریب کی جماعتوں نہضتہ العلماوغیرہ کا اثر بھی خاصا ہے۔ نہضتہ العلماء یا مشومی جماعت سے

صدر سوئیکارنو کی کبھی نہ بنی۔ خود پُختہ عقیدے کے مسلمان ہیں۔ اسلام سے والہانہ شیفتگی رکھتے ہیں لیکن سیاست میں اُن کا نقطۂ اوّل تا آخر قومی رہا ہے۔ سارے سیاسی فلسفوں پر اُن کی نظر ہے۔

سوئیکارنو کو زیادہ لوگ نبگ کارنو کہتے ہیں۔ بنگ کا مطلب ہے بھائی۔ یعنی ساری قوم اُن کو بڑا بھائی کہہ کر خطاب کرتی تھی۔ س ہندی سنسکرت کی طرح تحسین کے معنوں میں آتا ہے جیسے پوت سے سپوت۔ دیسی سے سدیشی ہندی میں ہے۔۔۔ سُکارنو کا مطلب اچھّا کارنو یا قابلِ تحسین کارنو ہوا۔ خالی نام کارنو ٹھہرا اور اُن کے دوست اُن کو کارنو ہی کہا کرتے تھے۔ سوکارنو صاحب کی خود نوشت سوانح عمری سے معلوم ہوا کہ یہ مہابھارت کے مشہور کردار کرن کا انڈونیشی روپ ہے۔ بعد میں کسی نے اِس کے ساتھ احمد بھی لگا دیا۔ جانے کیوں؟ احمد کبھی بھی سوئیکارنو کے نام کا جزو نہیں رہا۔ عورتوں کے ناموں کے ساتھ دیوی اور وتی ہوتی وغیرہ بھی پرانے ہندو اثرات کے گواہ ہیں۔

حاصل، واحب۔ مکان۔ عمر۔ کتاب۔ عموم۔ وغیرہ اِن سب ناموں سے ہمارے کان آشنا ہیں۔ دونوں کے نام تو خالص عربی ہیں۔ پیر کو اثنین کہتے ہیں۔ منگل ثلاثہ ہے۔ بدھ رابعہ۔ جمعرات خامِس اور جمعہ کو جمعۃ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ہفتے کو سبتو

کہتے ہیں۔ اتوار کے لئے البتّہ عربی لفظ احد بھی استعمال ہوتا ہے اور مقامی لفظ منگو بھی۔ کُچھ اور الفاظ سُنئے۔ زبان۔ فقیر۔ مشاورت۔ تعلیم۔ قلم۔ تقوی۔ مسکین۔ عادۃً وغیرہ۔ ہندی اثرات کے ثبوت میں روتی (روٹی)، مریچا (مرچ) اور دُوت سفیر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ خاتمۂ کلام پر اخیر الکلام کہتے ہیں۔ یہاں مکتب بھی ہیں۔ ہماری طرح مسجدوں کے ضمیمے کے طور پر لیکن اپنے اچھے پڑھے لکھے انڈونیشی دوستوں کو دیکھا کہ عربی رسم الخط نہیں پڑھ سکتے۔ کُچھ لوگ پڑھتے بھی ہیں اور ملائشیا میں چھپی ہوئی مشترک روایات کی کتابیں عربی رسم الخط اور ملائی زبان میں لکھی ہوئی خریدتے بھی ہیں۔ لیکن اِن کی تعداد زیادہ نہیں۔ ہر طرف رومن کا چلن ہے اور اے پاکستانی بھائیو سُنو۔ خواندگی کا تناسب وہاں سو فیصد کے لگ بھگ ہے۔ سبھی پڑھے لکھے نہیں تو پڑھے تو ضرور ہیں۔

جن جن مُلکوں میں موٹریں سڑک کے داہنے ہاتھ چلتی ہیں وہاں ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ اب ٹکّر ہوئی کہ ہوئی۔ افغانستان میں بھی کہ ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے۔ یونہی اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ پشاور سے کابل جاتے ہوئے پاکستان کے علاقہ میں تو وہی ڈرائیور بائیں ہاتھ گاڑی رکھتا ہے لیکن تورخم سے سرحد کی لکیر گُزرتے ہی داہنے ہاتھ کو ہو جاتا ہے۔ فلپائن میں یہی دیکھا کیونکہ وہ ہسپانوی اثر کے تحت رہا ہے۔ ہالینڈ میں میں

بھی یہی توقّع تھی لیکن وہاں ہماری طرح بائیں ہاتھ کا رواج ہے۔ بس ایک نشانی رہ گئی ہے کہ یہاں انگریز کا عمل دخل رہا ہے یا پھر ریفلز کا نام ہے کہ انڈونیشیا ہو یا ملائشیا ہر جگہ آپ کے حسنِ سماعت سے ٹکرائے گا۔ یہ شخص کہ جاوا سماٹرا کا انگریز گورنر تھا۔ شخصے ست از شیطان مشہور تر۔ کُچھ لوگ تو یہ مشابہت اُن کی شہرت کے علاوہ اُن کے خصائل میں بھی ڈھونڈتے ہیں۔ لُطف یہ ہے کہ عہدِ اِس کا فقط چار سال رہا لیکن بوگور کا مشہور نباتاتی باغ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ریفلز نے داغ بیل ڈالی۔ میوزیم دیکھا تو معلوم ہوا اُسی نے بنایا تھا۔ سنگاپور میں تو خیر ہوٹل، باغ، سرائیں، محل بھی ریفلز کے نام پر ہیں۔ طبیعت کے لحاظ سے زر پسند اور جاہ پسند یا امپیرئلِسٹ تو تھا لیکن انڈونیشی تہذیب و ثقافت پر اُس کی گہری نظر تھی۔ اُس نے انڈونیشیا کے مقامی لوگوں کو امورِ عامہ میں حصّہ دیالا۔ ۱۸۱۶ء میں جب انڈونیشیا دوبارہ ولندیزوں کے قبضے میں گیا تو اُنہوں نے سارے طور طریقے یکسر بدل ڈالے۔ ہالینڈ والے جزائر شرق الہند کے علاوہ سنگاپور اور جزیرہ نما ملایا میں بھی در آئے تھے۔ آخر یہ بندر بانٹ ہوئی کہ انگریز انڈونیشیا سے نکلے اور ولندیزوں نے سنگاپور کا پنڈ چھوڑا۔ خیر یہاں ذکر ٹریفک کا تھا کہ ولندیز کیا جاپانی تک دھارے کا رُخ نہ بدل سکے۔

ٹریفک کے ذکر میں سنئے کہ کاروں، ٹرکوں کی ریل پیل یہاں کراچی سے بھی زیادہ

نظر آئی۔ ایسے ٹریفک جام دیکھے کہ ہمارے مُلک میں دیدہ نہ شنیدہ۔ یا یہ عالم تھا کہ جب جاپانیوں سے رستگاری کے بعد سوئیکارنو نے آزادی کا اعلان کیا تو کسی لیڈر کیا صدرِ موصوف کے پاس کوئی کار تک نہ تھی نہ اِن لوگوں میں سے کوئی گاڑی چلانا جانتا تھا۔ حتّٰی کہ سوئیکارنو صاحب بھی سائیکل کی سواری کرتے تھے۔ لیکن اتنی بڑی جمہوریہ کے صدر کے لئے گاڑی تو چاہیے ہی تھی۔ آخر کسی نے بتایا کہ ریلوے کے فلاں جاپانی افسر کے پاس ہے۔ سات آدمی اُس میں بیٹھ سکتے ہیں اور پردے بھی اُس کے پیچھے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک شخص بھاگا بھاگا گیا اور گیراج میں سے اُسے چُرا لایا۔ انڈونیشی ڈرائیور بھی محبّ ِوطن تھا۔ اُس نے پہلے تو تعجّب کیا۔ پھر انکار کیا۔ لیکن جب اُسے بتایا کہ یہ صدر کی سواری کے لئے ہے۔ بولا یہ لو جی چابیاں لیکن مُجھے چھٹی۔ وہ تو اپنے گھر بھاگ گیا جو کسی گاؤں میں تھا۔ یہ لوگ گاڑی دھکیل کر صدر کے محل تک لائے۔

سنگاپور

۱۹٦۷ء


SINGAPUR HOTEL
PULL

سنگاپور میں قدم رنجہ

سنگاپور کے جزیرے کا رشتہ جزیرہ نمائے ملایا سے ایسا ہی ہے جیسا منوڑہ کے جزیرے کا کراچی سے۔ جہاں ہمارے ہاں کیماڑی ہے وہاں ملائیشیا کا شہر جوہور ہے۔ جوہور کا نہیں تو سُلطان جوہور کا نام تو آپ نے سُنا ہی ہو گا۔ اِسی تذکرے میں ہم عرض کر دیں کہ ہانگ کانگ بھی اِسی طرح جزیرہ ہے اور اِس کا رشتہ بھی سرزمینِ چین سے ایسا ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سرزمینِ چین کی نوک کا ایک سِرا ابھی انگریزوں کی عمل داری میں ہے۔ اِسے کولون کہتے ہیں اور کولون کے ریلوے اسٹیشن سے چل کر ریل گاڑی میں کینٹین۔ پیکنگ۔ شنگھائی وغیرہ سیدھے جاسکتے ہیں۔ لیکن ہانگ کانگ اور کولون ہر چند کہ مل کر ایک سیاسی وحدت ہیں اور مجموعاً ہانگ کانگ ہی کہلاتے ہیں لیکن اِن کے درمیان پُل وغیرہ کا سِلسِلہ نہیں۔ بس فیری چلتی ہے جسے اُردُو میں بیڑی کہیے۔ سنگاپور اور ملائشیا کے درمیان کی کھاڑی پر البتّہ پُل ہے۔ پَون ایک میل

لمبا پُل پار کیجئے اور ملائشیا میں داخل ہو جایئے۔

جاکرتا سے گیروواائیر لائن کا طیّارہ کوئی بیس منٹ کی دیر سے چلا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ تاخیر ہمارے اعزاز میں ہوئی ہے تو ہم یہ سوچ کر آبدیدہ ہو گئے کہ ایک یہ لوگ ہیں اور ایک ہمارے وطنِ عزیز کے پی آئی اے والے ہیں کہ ایک روز ہمیں بس پانچ منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ راستے میں رُک کر انسان چائے کی ایک پیالی بھی نہ پیئے۔ پان بھی نہ کھائے۔ اِن لوگوں نے جہاز کے دروازے بند کر کے سیڑھی کھینچ لی۔ ہم نے بہت کہا کہ ہم شاعر آدمی ہیں اِتنی ڈھیل تو ہمیں دے دو لیکن وہ اِن نفاستوں کو کیا جانیں۔ اُلٹا ہماری دِل آزادی کے لئے یہ کہا کہ ہم تو الاٹ صاحب کے لئے بھی جہاز لیٹ نہیں کرتے شاعر کیا چیز ہوتا ہے۔

لیکن انڈونیشیا کے گیروواائیر لائن نے بھی مشرقی وضعداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سامان کے معاملے میں بھی خاصی مروّت برتتے ہیں۔ اگر کھانے پر وزن ۴۴ پونڈ زیادہ ہو جائے تو مُنہ دوسری طرف کر لیتے ہیں جیسے دیکھا ہی نہیں۔ ہمارے پاس وزن چودہ پونڈ زیادہ تھا لیکن کاؤنٹر والے صاحب نے کہا ٹھیک ہے تیرہ چودہ پونڈ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اِس کے مُقابلے میں سنگاپور سے وطن واپسی پر کینٹاز والوں نے محض اتنی سی بات پر کہ وارے پاس تیس پونڈ وزن زیادہ ہو رہا تھا ایک

بے مہری اور سرد مہری برتی کہ

جو بُت کدے میں کریں بیاں

تو کہے صنم بھی ہری ہری

قصّہ جہاز کی روانگی میں تاخیر کا یُوں ہے کہ سوا سات بجے جب جہاز نہ چلا تو لوگوں میں کھُسر پھُسر شروع ہوئی کہ کیا بات ہے۔ مُسافروں کو آواز کیوں نہیں پڑی۔ انڈونیشیا انقلابات کی سرزمین ہے۔ اِس لئے جہاز کی تاخیر کی کُچھ بھی وجہ ہو سکتی تھی۔ ایک صاحب نے کہا اِس جہاز سے سوئیکارنو صاحب کو جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ دوسرا بولا مسافروں کی تلاشی ہو گی۔ ایک انڈونیشی قُلی ہمارے قریب آ کر کُچھ فقرے بول گیا اور کُچھ اشارے کر گیا۔ لیکن انڈونیشی زبان میں آتی نہیں اور اِن لوگوں میں ہمارا شمار کبھی نہیں ہوا جن کے لئے اشارے کافی ہوتے ہیں۔ لہٰذا معذرت کر کے رہ گئے کہ بھیّن اپن کی سمجھ میں نا آوت۔

ہوائی اڈّے کے لاؤنج میں یُوں بھی طلبا نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ ایک پورا جتھّا امریکہ کے بٹینک طلبہ کا تھا جن کو انڈونیشی طلبہ کی جماعت کامی کے رضا کار اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے بقولِ شخصے اُن کی ناسوں میں دھواں دے رہے

تھے۔ انتظار سے تنگ آ کر ہم پچیس روپے میں شربت کا ایک گلاس بھی پی آئے کیونکہ گرمی بہت تھی۔ اِتنے میں ایک شخص بھاگتا ہوا آیا کہ ابنِ انشا کون صاحب ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ رائدۂ کوئے بُتاں ہمیں ہیں۔ کیا ارشاد ہے۔ اُس نے فہمائشاً کہا کہ کسٹم میں چلیئے۔ اپنے سامان کی پڑتال کریئے اور پاسپورٹ پر مُہر لگوایئے۔ اکثر مُلکوں میں باہر جاتے وقت سامان کی پڑتال نہیں کی جاتی۔ ہم سمجھے یہاں بھی نہ ہو گی۔ پاسپورٹ پر مُہر کیوں نہ کرائی تھی کہ اِس پر جگہ ہی باقی نہ تھی۔

ع

مگر کہ زندہ کنی خلق راو باز کشی

خیر یہ تو اپنی بات ہے۔ فی الحال واقع ہم بھول گئے تھے۔ اب اِن صاحب کے ساتھ کسٹم میں گئے۔ صرف میں گئے۔ صرف ہمارا سوٹ کیس دھرا تھا۔ کسٹم افسر نے پُچھ پوچھے بغیر محض ہماری شکل دیکھ کر کہ ایسا مسکین آدمی کیا بے ایمانی یا اسمگلنگ کرے گا ہمارے سامان پر چاک کا نشان کر دیا۔ امیگریشن والوں نے بھی چُپکے سے مُہر لگا دی۔ ہم نے گیروا کے آدمی سے رفعِ شک کے لئے پوچھا کہ جہاز کیوں لیٹ ہوا۔ اُس نے کہا۔ جناب آپ کے سامان کی چیکنگ کی وجہ سے۔ اب جلدی کیجئے اور طیارے پر تشریف لے چلیئے۔

خُدا جانے سنگھاپور یا سنگاپور اِس شہر کا نام کسی سکھ نے رکھا کیونکہ شہر یہ چینیوں کا ہے بیشک سِکھ بھی یہاں بہت ہیں۔ جابجا ٹیکسی ہانکتے۔ دربانی کرتے اور دُکانوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ لیکن اسّی پچاسی فیصد آبادی چینی ہے۔ باقی میں کُچھ ملائی، کُچھ ہندوستانی نسل کے لوگ اور کُچھ یوروپین اور یوریشین۔ ہندوستانیوں میں سے اکثر جنوبی ہند اور سیلون کی طرف کے ہیں۔ دُکانداروں میں سندھی ہندو بھی خاصے ہیں اور کُچھ شمالی ہند اور پاکستان کے ہندو مسلمان۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔ وغیرہ کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ جس طرح غالبؔ کے زمانے میں عیش تجمّل حسین خان کے لئے بنا تھا اِسی طرح دربانی اور چوکیداری سِکھوں کے لئے ایجاد ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں، کلبوں اور اسٹوروں والے شاندار لہراتی ہوئی بابا کرسمس کی سی داڑھیوں والے سِکھوں کو لال نیلی وردیاں پہنا کر دروازوں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ محض آرائش کی چیز ہوتے ہیں۔ دربانی اور چوکیدارہ تو محض ثانوی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ایک سِکھ بابا کو ہم نے یُوں بھی دیکھا کہ صدر دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا بھی ہے اور خرّاٹے لیتا ہوا سو بھی رہا ہے۔ بج رہا ہے اور باآواز ہے۔ سالِ گزشتہ تو ہانگ کانگ میں ہماری وجہ سے دو سِکھوں میں کھٹ پٹ بھی ہو گئی۔ ہوا یہ کہ ہمیں ایک بلڈنگ کے دروازے پر دو سِکھ نظر آئے تو ہم نے ایک سے پُوچھ لیا کہ ”سردار جی

جگہ کتھّے آ۔" انہوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور اِسی میں اختلافِ رائے ہو گیا۔ ایک نے دوسرے کو طعنہ دیا کہ تُم بھی سِکھ ہی ہو۔ بارہ برس سے یہاں ہو اور اتنا نہیں جانتے۔ دوسرے کو یہ بات بُری لگی کہ اُسے سِکھ کہا گیا ہے۔ اُس نے بھی ترکی بہ تُرکی بلکہ پنجابی بہ پنجابی جواب دیا۔ آخر ہم چُپکے سے سٹک گئے اور کسی اور سے پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ہمیں اِسی بلڈنگ کی تلاش تھی جس کے دروازے پر یہ دونوں سردار جی مُدّت العمر سے پہرہ دے رہے تھے۔

یاد رہے کہ سنگاپور ایک زمانے میں ہمارا اگرائیں بھی رہا ہے۔ یعنی ہندوستان ہی کا جُزو تھا۔ تاریخ اِس شہر کی یہ ہے کہ سٹمفورڈ ریفلز صاحب نے جِن کا ذکر انڈونیشیا کے ضمن میں ہم کر آئے ہیں۔ کیونکہ وہ جاوا کے برطانوی گورنر جنرل بھی رہے۔۔۔ ۱۸۱۹ء میں سُلطان جوہور سے اِس امر کی اجازت لی کہ اِس جزیرے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ایک تجارتی کوٹھی قائم کر لیں۔ سُلطان نے اجازت دی یا دینی پڑی۔ اِس کے پانچ سال بعد ریفلز صاحب نے سُلطان سے ایک اور معاہدے پر دستخط کرا لیے اور یُوں چین اور ہندوستان کی تاریخ دہرائی گئی یعنی اعرابی کے اونٹ نے پورے خیمے پر قبضہ کر کے اعرابی کو باہر نکال کیا۔ اب پورا جزیرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے باوا کی جاگیر ہو گیا۔ ۱۸۳۰ء میں اِسے احاطۂ بنگال میں شامل کیا گیا اور

۱۸۵۱ء میں یہ براہِ راست گورنر جنرل انڈیا کے زیر نگیں ہو گیا۔ اب آزاد ہے لیکن آزادی کے فرغل میں اب بھی کُچھ پیوند ولایتی کپڑے کے ہیں۔ یعنی برطانیہ کو فوجی اڈّہ رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن اب جبکہ سارے مشرقِ بعید میں برطانیہ کا ٹھاٹھ دھرارہ گیا ہے۔ ٹامی بنجارہ یہاں سے بھی لاد چلنے کی فکر میں ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں وہ سنگاپور جس کے استحکام کا ایسا شہرہ تھا، پکے ہوئے پھل کی طرح جاپانیوں کی گود میں آن گِرا۔ ہم لوگ تو خیر انگریز کی ہر چیز کو اُس کی حکمتِ عملی سمیت لوہالاٹ سمجھتے تھے سراوک اور ملایا کے امیروں اور سُلطانوں کو بھی کُچھ ایسا ہی گمان تھا کہ شغالِ جاپان نے اِدھر دانت آزمانے کوشش کی تو شیر برطانیہ ایک پنجہ مار کر اُس کا بھُرکس نکال دے گا۔ لیکن آزمائش کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ کم از کم سنگاپور کی حد تک شیر برطانیہ کاغذی شیر تھا۔

ملایا پر جاپانی حملے کا آغاز ۸ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ہوا۔ اُسی روز چار بجے صُبح سنگاپور پر پہلی بمباری ہوئی۔ ساٹھ آدمی ہلاک ہو گئے۔ دو دِن بعد برطانیہ کا مایہ ناز جنگی جہاز پرنس آف ویلز اور کروزری پلس جاپانی تارپیڈو اور بم کھا کر سمندر کی تہہ میں پہنچ گئے۔ ۳۱ جنوری کو حملہ آور ملایا کو زیر کر کے آبنائے جوہور پر پہنچ گئے تھے جو سنگاپور کو سر زمینِ ملایا سے جُدا کرتی ہے۔ فروری کو جاپانی سنگاپور کے جزیرے میں گھُس آئے

اور ۸ فروری کو سنگاپور کا قصّہ تمام تھا۔

جاپانی کمانڈر اِن چیف جرنیل یاماشیتا اور برطانوی کمانڈر اے پرسیول کے درمیان اِس موقع پر جو سوال وجواب ہوئے وہ خاصی عبرت کا سامان ہیں۔

یاماشیتا: دیکھئے صاحب۔ جواب سیدھا صاف اور مُختصر چاہیے۔ آپ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالتے ہیں یا نہیں۔ اور کُچھ نہیں سُننا چاہتا۔

پرسیول: ہُوں

یاماشیتا: کیا انگریزوں کی قید میں کوئی جاپانی سپاہی ہیں۔

پرسیول: نہیں ایک بھی نہیں۔

یاماشیتا: اور جاپانی باشندے؟

پرسیول: جِن جاپانیوں کو نظر بند کیا گیا تھا اُنہیں ہندوستان بھیجا جاچکا ہے

یاماشیتا: اچھّا تو آپ ہتھیار ڈالتے ہیں یا نہیں۔ اگر ڈالتے ہیں تو غیر مشروط طور پر ڈالئے ہاں یا نہ جواب دیجئے۔

پر سیول: کل تک کی مہلت دیجئے۔

یاماشیتا: ہر گز نہیں دی جاسکتی۔ ہم آج رات حملہ کر دیں گے۔

پر سیول : اچھّا آج رات ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تو دیجئے۔

یاماشیتا: معلوم ہوتا ہے ہمیں حملہ کرنا ہی پڑے گا۔ ہاں میں یا نہ میں جواب دیجئے۔

پر سیول:(چُپ)

یاماشیتا: مُجھے فیصلہ کُن جواب چاہیے۔ غیر مشروط حوالگی چاہیے۔ جواب دیجیے

پر سیول: اچھّا صاحب

یاماشیتا: اب آئے ناراہِ راست پر۔ ۱۰ بجے رات جنگ بندی کا حکم ہو جانا چاہئے۔

جوہور اور واپسی

دُنیا کا کون شہر ہے جہاں قابلِ دید چیزیں نہیں۔ ہم دِکھانے پر آئیں تو کراچی میں بھی بہت کُچھ دِکھا کر سیّاح کو حیران کر سکتے ہیں۔ اگر تاریخی آثار، محلّات اور باغات کی قبیل کی کوئی شے نہیں تو اونٹ گاڑی تو ہے ہی۔ پھر محلّات اور باغات ہر پُرانے شہر میں مل جاتے ہیں لیکن اونٹ گاڑی تو بغداد، ایتھنز، قاہرہ وغیرہ میں چراغِ رُخِ زیبا لے کر ڈھونڈیں جب بھی نہ ملے گی۔

لاہور میں بھی کئی مقامات دیدنی ہیں۔ مُغلیہ خاندان کے دور اندیش حکمرانوں نے کیمرے اور دور بینیں لے کر یورش کرنے والے سیّاحوں کی ضرورت کا اندازہ پہلے سے طے کر لیا تھا۔ ایک بادشاہ قلعہ بنا گئے اور اُس کے در و دیوار پر شیشے کانچ وغیرہ لگا گئے کہ دیکھو اور حیرت کرو۔ ایک اور بادشاہ نے ایک اُونچی سی مسجد بنا دی۔ جس

کو مسجدیں دیکھنے کا شوق ہو لال رنگ کی شاہی مسجد دیکھ لے۔ کُچھ سیّاحوں کو فاتحہ پڑھنے اور شاعروں وغیرہ کے مزار دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ اُن کی سہولت کے لئے قوم نے علامہ اقبال نام کے ایک بڑے شاعر کو مار کر عین مسجد اور قلعہ کے درمیان دفن کر دیا تاکہ کم فُرصت سیّاح ایک جگہ سب کُچھ دیکھ کر واپسی کے لئے جہاز پکڑ سکیں۔ مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ملکہ نور جہاں نے بھی یہیں انتقال کرنا اور مزار بنوانا پسند کیا۔ اُدھر باغبان پورے کی طرف جگہ خالی تھی۔ جھگیاں وغیرہ ابھی نہیں پڑی تھیں نہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے بر ڈلگایا تھا، وہاں ایک باغ بنا دیا گیا اور بیچ میں کُچھ درخت لگا کر چوبچے بنا دیے۔ یہ شالامار باغ ہو گیا۔

سنگاپور آکر ہمارا بس چلتا تو ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں چادر تان کر تصوّرِ جاناں کئے پڑے رہتے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ کوئی نہ کوئی میزبان ہمیں گھسیٹ کر لے جاتا تھا کہ اِنہیں فلاں باغ دِکھائیں۔ فلاں گِرجا بہت خوبصورت ہے۔ حالانکہ سنگاپور اور ہانگ کانگ میں آدمی در و دیوار اور سبزہ و باغ دیکھنے تھوڑا ہی جاتا ہے۔ خرید کے لئے کہیئے۔ سنگاپور اور ہانگ کانگ کے ہوائی اڈّے پر اُترتے ہی مسافر جیب سے ایک لمبی سی فہرست نکالتا ہے جس میں عزیزوں اور دوستوں اور اُس کی اپنی فرمائشیں درج ہوتی ہیں۔ وہاں سے رُخصت ہوتا ہے تو دونوں ہاتھوں میں پھولے

ہوئے تھیلے اور بقچے ہوتے ہیں۔ گلے میں کیمرہ اور ایک ہاتھ میں ٹرانسسٹر ہوتا ہے اور سوٹ کیس کو دو قُلی مُل کر اُٹھائے ہوتے ہیں۔ آپ کتنا ہی ٹورسٹ لٹریچر مسافر کے سامنے پھیلائیں وہ سنگاپور میں ریفلز پیلس، اسٹمفورڈ روڈ اور آرچرڈ روڈ کے علاوہ کوئی اور جگہ دیکھنے کا روادار کم ہی ہوتا ہے۔

ہانگ کانگ میں چیزیں ارزاں تر ہیں لیکن ارزاں سنگاپور میں بھی ہیں۔ بس اُنیس بیس یا اٹھارہ بیس یا سترہ بیس کا فرق ہوتا ہے۔ کپڑے اور پوشاکیں بہت سستی۔ پیسے والے کے لئے کیمرے، گھڑیاں، ریڈیو، ٹیلی ویژن۔

کرشمہ دامنِ دِل کشد کہ جا اینجاست

لیکن دُکانوں پر قیمتوں کا فرق بھی ہے۔ ریفلیر پیلس میں جہاں عوامی چین والوں کا اسٹور ایک ایمپوریم اور دوسری بہت سی دُکانیں ہیں۔ جو شے رابنسن کے مشہور اسٹور سے دس ڈالر میں ملے گی دوسری جگہ چھ ڈالر میں بھی دستیاب ہو سکتی ہے۔ یہاں خریداری کا اصول یہ ہے کہ دُکاندار دس ڈالر مانگے تو پانچ ڈالر کہیئے۔ چھ سات ڈالر پر سودا پٹ جائے گا لیکن فارمولا دُکاندار کو بھی معلوم ہے۔ وہ قیمت ہی تین گُنی بتائے گا تاکہ کم کر کے بھی دُگنے پر بیچ سکے۔ ایک روز یہی محسوس کر کے کہ آدھے

داموں چیز دے کر بھی یہ لوگ لُوٹتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا کہ دُکاندار نے ایک سوئٹر کے دس ڈالر بتائے۔ ہم نے کہا دو ڈالر دیں گے۔ اُسے ایسا گاہک کبھی نہ ملا تھا۔ مارے صدمے کے بے ہوش ہو گیا لیکن دوسرے روز پھر ہمیں بھی بے ہوش ہونے کا موقع ملا۔ ہم نے دس ڈالر کی چیز کے دو ڈالر لگائے۔ دُکاندار کے پاس شاید اِتنی فرصت نہ تھی کہ بھاؤ تاؤ کرتا فوراً بولا "لے جایئے صاحب۔ نکالئے دو ڈالر۔"

ایک روز ہمارے میزبان نے کہا "اٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو جوہور۔ ہم نے کہا جوہور تو ملائشیا میں ہے اور ویزا ہمارے پاس نہیں۔ بولے پاسپورٹ ساتھ لے لو مل جائے گا۔لذّتِ آوارگی میں ہم تیّار ہو گئے۔

آبنائے سنگاپور کا پُل پار کیا تو اُدھر کی چوکی والوں نے روکا۔ سنگاپور والوں کو شناختی کارڈ دِکھانا پڑتا ہے۔ باقی کو پاسپورٹ، پوچھا کتنے دِن کا ویزا چاہیئے۔ ہم نے کہا دو ڈھائی گھنٹے کا دے دیجئے۔ بس جوہور کو ہاتھ لگا کر واپس آنا ہے۔ بولے ایک مہینے کا دیئے دیتا ہوں۔ کیا عجب آپ کا جی زیادہ ٹھہرنے کو چاہے۔ پھر کہاں بھاگتے پھریئے گا۔

تھوڑی دیر میں پاسپورٹ مُہر ہو کر آ گیا۔ واپسی میں تو اِتنی بھی چیکنگ نہ ہوئی۔ نہ

ملائشیا کے سِرے پر نہ سنگاپور میں داخل ہوتے۔

اُردُو میں کئی محاورے ہیں۔ خُدا شکّر خورے کو شکّر دیتا ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے وغیرہ۔ ہمیں معلوم نہیں اِس موقع پر کِس کا استعمال پُر محل ہو گا۔ ہم اپنی سیاحت میں ایران گئے۔ افغانستان گئے۔ لنکا گئے۔ فلپائن گئے۔ انڈونیشیا گئے۔ جاپان گئے۔ ہر جگہ سب سے پہلی چیز جو نظر پڑی یا تو وہ کوئی سِکھ بھائی ہوتا تھا یا گوردوارہ۔ تعجّب تو یہ ہے کہ یورپ کے سفر کے آغاز میں ہم بیلجیم اُترے تو برسلز کے ہوائی اڈّے پر سب سے پہلی چیز جو نظر آئی وہ بھی ایک سردار جی تھے۔ جوہور میں بھی داخل ہوتے ہی ہم نے کار موڑی تو موٹے موٹے لفظوں میں گورمکھی رسم الخط میں لکھا نظر آیا۔

''گوردوارہ جوہور بارو۔'' نیچے نظر ڈالی تو دوسرا دار جی ایک سائیکل پر بیٹھے ایک ون وے سڑک پر غَلَط سمت میں جاتے دکھائی دیئے۔ ہمارا جی خوش ہو گیا۔ بات ہوئی نا۔

جوہور کا چڑیا گھر مشہور ہے۔ ہمیں تو کُچھ خالی خالی ویران سا نظر آیا۔ دوسری جنگ کی بمباری کے گولے اِس پر بھی پڑے تھے۔ سامنے سُلطان جوہور کا محل تھا۔ وہی جو ایک زمانے میں سنگاپور کے بھی مالک تھے۔ یہ ملایا کی جنوبی نوک تھی۔ سبزہ

نظروں میں کھُبا جاتا تھا۔ چڑیا گھر سے مایوس ہو کر اور کوکا کولا پی کر ہم میں سمندر کے کنارے ایک بنچ پر آ بیٹھے۔ سڑک بالکل سمندر کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ یہ ساحل ریتلا نہیں ہے بلکہ پکّا ہے۔ پکّا بنایا گیا ہو گا۔



اب بھوک بھی چمکنے لگئی تھی اِس لئے ہم نے شہر کا رُخ کیا۔ ہوٹل اور ریستوران اچھّے سے اچھّے ہوں گے لیکن ہمیں مارکیٹ کا ماحول بھایا۔ عورتوں کے کھُلے کھُلے ڈھیلے شلو کے عجب بہار دیتے ہیں۔ مارکیٹ کے ایک طرف قطار در قطار کباب والوں، دہی بڑے والوں کی دُکانیں تھیں۔ یہاں کراچی میں تو ہم ایسی دُکانوں کو گندہ کہہ کر اُن سے مُنہ موڑ لیں لیکن پردیس میں ہر شے انوکھی لگتی ہے۔ ہم لوگوں نے ایک بنچ سنبھالا اور ساقی کا آرڈر دیا۔ ساقی یا ساتے، ملایا اور انڈونیشیا کا مشہور کھاجا ہے۔ مٹن تِکّا کہیۓ۔ بوٹیاں بانس کی تیلیوں میں پروئی ہوتی ہیں۔ ساتھ ایک پیالہ چٹنی کا ہوتا ہے۔ پوری سیخ کو پانی میں ڈبویۓ اور دانتوں سے بوٹیاں سونت سونت کر کھایۓ۔ ہمیں یہ ایسی چٹ پٹّی معلوم نہ ہوئی جیسی دیکھنے میں لگتی ہیں۔ مسالوں کا فرق ہو گا۔ مِرچ کا مزا ہم انڈونیشیا میں چکھ چُکے تھے کہ زبان پر رکھی اور تالو چیخ گیا۔ یہاں ہم نے اِس کی احتیاط رکھی۔ کھا کر ہم بانس کی تیلیاں نیچے پھینکنے کو تھے کہ ہمارے دوست نے روک دیا اور کہا میز ہی پر رکھو۔ بِل کا وقت آیا تو بیرے نے اِنہی تیلیوں سے سیخوں کی گنتی کی۔ رقم یاد نہیں لیکن کھانا سستا تھا۔

سنگاپور میں آخری شب ہم نے نیشنل تھیٹر میں قزاقستان کے باخور طائفے کا ناچ رنگ دیکھا۔ ہمارے سنگاپور پہنچتے ہی ہماری میزبان نے ہم سے کہہ دیا تھا کہ فلاں

روز تُم مسی نمازی کے ہاں کھانے اور تھیٹر دیکھنے پر مدعو ہو۔ ہم نے کہا مس نمازی؟ بولیں ہاں میری سہیلی ہیں۔ ایرانی نژاد ہیں اور اِن سے میں نے تمہاری تعریف کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ انشا صاحب فارسی بولتے ہیں۔ پس تیّار رہنا۔ اِس بات پر ہمارا دِل بیٹھ گیا کیونکہ حافظ سعدی وغیرہ ہوں تو اُن سے ہم بخوبی گُفتگُو کر سکتے ہیں۔ آج کل کے ایرانیوں سے کیا بات کریں۔ یعنی اُن سے بات کر کے کیا اپنی زبان خراب کریں۔ جب ہماری میزبان نے کہا کہ وہ اُردُو بھی بول لیتی ہیں تو ہماری جان میں جان آئی۔

خیر تماشا دیکھنے ہم بھی گئے اور وہ ہوا بھی۔ مس نمازی کا پورا کُنبہ موجود تھا۔ اُن کے والد بھی۔ کھیل ختم ہونے پر منتظمین نمازی صاحب کو آرٹسٹوں سے ملوانے اسٹیج پر لے گئے۔ کیونکہ نمازی صاحب سنگاپور کے سرکردہ شہریوں میں سے ہیں۔ یہ طائفہ قزاقستان کا تھا۔ ہم نے جاتے ہی فارسی آزمائی لیکن وار خالی گیا۔ ایک گاوپر واری خاتون جو اِس منڈلی کی چودھرائن معلوم ہوتی تھیں بمشکل اپنا بوجھ سنبھالتی مٹکتی ہوئی آئیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا نمستے۔ ہم نے اور ہمارے نمازی دوستوں نے نظر انداز کر کے مُنہ پھیر لیا۔ کسی نے اُنہیں بتایا کہ یہ ایرانی ہیں اور یہ پاکستانی، تو شاید خفیف ہوئیں۔ اُنگلی سے نیم دائرہ سا بنا کر اور زور دے کر اپنی شکستہ انگریزی

میں کہنے لگیں۔ جانتے ہو یہ تمام اداکار مُسلمان ہیں۔ تمام کے تمام۔

ہم نے پوچھا کوئی فارسی والا بھی ہے۔ ایک صاحب بھاگے بھاگے گئے اور ایک صاحب کو پکڑ کر لائے۔ یہ آذر بائیجان میں رہے تھے۔ خیر کُچھ کُچھ فارسی گوئی کا غُبار نمازیوں کا نکلا۔ ایک آدھ ٹانکا ہم نے بھی لگایا۔





کراچی سے کوالالمپور تک

ہم کہیں کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے باہر جائیں تو ہمارا قد بالعموم ایک ہی آدمی پر مشتمل ہوتا ہے اور ہم اس کے لیڈر کے طور پر اپنا تعارف کراتے ہیں۔ لیکن اب کے یونیسکو کے جلسے میں شرکت کے لئے ہم کوالالمپور روانہ ہوئے تو جناب قدرت اللہ شہاب کی رکاب میں تھے۔ وہ لیڈر تھے اور فرسٹ کلاس میں ٹانگیں پھیلا کر دراز ہو گئے۔ ہمیں کروفر پسند نہیں۔ لہٰذا پیچھے اکانومی کلاس کا ایک گوشہ پسند کیا۔ یُوں ہمارا ٹکٹ بھی اکانومی کلاس ہی کا تھا۔

پیسے تو ہم نے پورے دیئے تھے اور نقد دیئے تھے۔ لیکن تھے تو کالے آدمی۔ بی۔ او۔ اے۔ سی والے کہیں بھی ہوں، اپنے جہاز کو انگلستان کا علاقہ سمجھتے ہیں۔ ہم بہت سی دوسری ایئرلائنوں میں سفر کر چکے ہیں۔ ایئر ہوسٹسوں کو دیکھا کہ آتے

جاتے میں بلائیں لیتی جاتی ہیں اور مُسکراہٹوں کی کلیاں بکھیرتی گزرتی ہیں۔ حتّٰی کہ کسی کسی پر تو ہم سے کوئی دِلگداز شعر بھی سرزد ہو جاتا ہے۔ پھر فقط غذائے روح پر نہیں ٹرخاتیں، دانے دُنکے کو بھی پوچھتی رہتی ہیں۔ خیر سگالی کی رو میں کبھی ایسا ہوا کہ وہ ہم پر شہد ٹپکا گئیں۔ کبھی دوسروں کی نظریں بچا کر ہم نے مکھّن لگا دیا۔ اور یُوں گھنی چھاؤں میں بیٹھتے اُٹھتے ہم غریب الوطنی کے فرض سے ادا ہوتے گئے۔ لیکن بی۔ او۔ اے۔ سی کے طیّارے میں تو صاحبو ہماری ایسی پذیرائی ہوئی جیسی انگلستان میں آج کل ہمارے ہم وطنوں کی ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں کوچۂ محبوب میں عاشق سے بھی دربان کُچھ بہتر ہی سلوک کرتا ہو گا۔ یہ ایئر ہوسٹس صاحبہ کہ کسی طرف سے نہ چندے آفتاب تھیں نہ چندے ماہتاب۔ گوروں پر اپنے تبسّم کا چھڑکاؤ کرتی گزرتی تھیں لیکن ہمارے قریب آکر اپنی باچھوں کو یک لخت سمیٹ لیتی تھیں۔ سب کو شربت تقسیم کیا اور ہر چند کہ ہم شاعر اور عشق پیشہ آدمی کئی قسم کے شربتوں کے عادی ہیں اور مانگ بیٹھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سنترے کے شربت سے بھی محروم رہے۔ اور غالبؔ بنے حسرت کرتے رہ گئے کہ ہم کو بھی پوچھتی جو رہو کیا گناہ ہو۔ اس میں کُچھ شک نہیں کہ ہم ان کی رعایا رہے ہیں لیکن اب تو نہیں ہیں۔ یُوں بھی آج کل اقوام متحدہ کی طرف سے رعایا سے بہتر سلوک کی تاکید کی جاتی

ہے۔ شہاب صلحب سے ان کا حال ہم نے نہیں پوچھا۔ ہم تو شیریں بیانی کے علاوہ معمولی شیرینی ٹافیوں گولیوں وغیرہ سے بھی محروم رہے۔ ناشتے میں کُچھ لال سا گوشت دیکھ کر ہم نے اعتراض کیا تو بولیں۔ اچھّا، تو آپ سور نہیں کھاتے یہ تعجّب کی بات ہے۔ ہم نے کہا بی بی۔ تعجّب تو ہمیں بھی ہے لیکن بہر حال نہیں کھاتے۔

راستے میں کلکتہ آیا۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں تو ہمیں تو اس میں سینے پر تر لگنے والی کوئی بات نظر نہ آئی۔ شہاب صاحب نے جانے اسے کسی آن میں دیکھا ہو گا کہ اپنے بہت سے افسانوں کی ہیروئنوں کو دیں اتارا ہے۔ سہسرام والی رانو بھی تو ملتے ہی جارہی تھی جب اس کی کار نیچر ہوتی۔ خیر ہم شہر میں گئے بھی نہیں۔ فقط ہوائی اڈّے پر ٹھیک لینے کو اترے تھے گرد دریا۔ بے رنگ جھلسا ہوا ماحول، بُو دیتے غُسل خانے، لونی لگی دیواریں۔ چھٹی ہوئی چھتیں اور بھولتے ہوئے دروازے۔ یہ کلکتے کا ٹرانزٹ تھا یہیں پارہ چودس کا منظر ہم نے پارسال بیت میں کیا جبل پیارے دیکھ کے صاحب پرے پرے ہی ادائے سی والوں سے آنا بھی نہ ہو سکا کہ مسافروں سے ایک ایک گلاس پانی کو پوچھ لیتے۔ غیر جانہ کی روانگی کا اعلان ہوا تو سب کی جان میں جان آئی۔ اب کے ایر ہوسٹس صاحبہ ہندوستانی تھیں۔ اتھے پر تلک، شاید جنوبی ہند کی ہوں گی

میلاحت ایسی رئیسی؟ اچھّا خاصا نمک کا پہاڑ۔ نوک زبان سے چاند اگر برابر کر دینے کو بے اختیار جی چاہے بلکہ بندہ بشر ہے، کُچھ خیال ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کا بھی جاگا لیکن اتنے میں پرچہ لگا کر آجا کے جزیروں میں پہنچ گئے ہیں۔ حفاظتی بند باندھ لیجئے۔ چنانچہ باندھا۔ کمر پر بھی۔ خیالات کی رو پر بھی۔

مشرق کے جزائر ہم نے دیکھے ہیں نیپان کیا، جادا کیا اور لنگا کیا؟ پرتو جاد کا منظر اس وقت جہاز سے نظر آیا۔ اس کی کیا کیلئے نیچے جھیلیں ہی جھیلیں جنگل ہی جنگل، ندیاں ہی ندیاں ی کھیت ہی کھیت کا ہی، دھانی اور نیلے رنگیوں کا ایک سیلاب، سماں اس وقت کم کم باد درباراں کا تھا۔ لینے والے چھتریاں لے کر جہاز کے دروازے ہی پر پہنچ گئے تھے۔ رنگارنگ چھتریاں۔ سب کو ایک، ایک تھما دی گئ تھوڑی دور پر چھتا ہوا برآمدہ بلکہ کاریڈوروں کا دونوں طرف سے کھُلا لمبا سِلسِلہ۔ ان کے سائبان چھتریوں کی مثال تھے۔ سرے اُونچے، مرکز بیجا قیف کی طرح مُجھے کہ پانی چھت پر پڑتا تھا۔ تو ستونوں کے جون میں سے گزر کر زمین پر اُتر جاتا تھا۔ آج کل ہوائی مستقر تو ایک سے ایک خوبصورت بن رہے ہیں لیکن ربڑ کے فرشتوں اور چوبی پیار دی والے اس ساختمان کے کیا کہتے معلوم ہوا یہ نادر کو تعمیر انشا کے ایک نوجوان ماہر تعمیرات کا کارنامہ ہے۔ اس کے لئے کسی کو باہر سے نہیں بایا گیا۔ ورنہ سنوارنے تو

کیا عمارتوں اور شہروں کی شکلیں بجاڑنے کے لئے بھی آج کل بڑی بڑی فیسیں دے کر باہر ہی سے آدمی بلاتے جاتے ہیں۔

مرلن ہوٹل کو ان پور کا سب سے اونچا ہوٹل گنا جاتا ہے۔ مالک اس کے چینی ہیں اور ان کا ایک ہوٹل ہانگ کانگ نہیں بھی ہے۔ شہاب صاحب نے کمرے میں پہنچتے ہی ایک بیرے کو بلا کر کہا کہ یہاں قبلہ کس طرف کو ہے؟ وہ کُچھ سمجھا۔ کوئی کج کلاہ بھی ایسا نظر نہ آیا کہ اس کی طرف قبلہ راست کر لیتے۔ آخر ہم نے ریشن پر فون کیا۔ وہاں کی ناقص العل مستی بھی تھی۔ ہماری انگریزی اس پر سے پھیپھلتی ہوئی گزر گئی۔ آخر شہاب صاحب نے فرمایا قبلے کا اندازہ کریں گے۔ تُم یُوں پوچھو کہ سورج کس وقت نکلتا ہے اور کب غروب ہوتا ہے تا کہ مغرب اور فجر کی نمازوں کے وقت کا تعیّن ہو جائے۔ جواب ملا کہ سورج نکلتا ضرور ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس وقت۔ چھ اور سات بجے کے درمیان قالباً؟ ہم نے کہا: اسے بانی ہمیں صحیح وقت چاہتے کیونکہ عبادت Praying کے نقطہ نظر سے پوچھ رہے ہیں۔ ہمارا مقصود تو نماز ہی سے تھا۔ لیکن وہ جانے کیا سمجھیں بولیں اچھّا تو آپ سورج کی عبادت کرتے ہیں صُبح کو پچلی کھڑکی کے پردے اٹھائیے گا تو سوچ سامنے نظر آئے گا۔ ہم نے کہا، خانم ہم خُدا پرست لوگ ہیں۔ بیشک کبھی کبھی بُت پرستی بھی کر لیتے

ہیں۔ بشر میکہ بُت کا مطلب آپ پتھّر وغیرہ کی مورتیاں نہ لیں۔ اس کے علاوہ مفاد پرستی سے بھی انکار نہیں لیکن سورج پرست تو ہم قطعی نہیں ہیں اگر آپ نے ہمارے متعلّق چڑھتے سورج کی پوجا کرنے کی کوئی بات سنی ہے تو اسے ماورہ اور استعارہ سمجھئے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ہماری تقریر نقطہ عروج کو پہنچ رہی تھی کہ ادھر سے فون بند ہو گیا۔ ناچاہم نے ڈائرکٹری سے اپنے دوست سیّد ناصر کا نمبر نکالا وہ تو تھے نہیں، ان کی بیگم نے ہماری مُشکل حل کی۔

پھر وہی گلیاں، پھر وہی ہم

دِل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے۔

کوئے ملامت کر تو خیر کیا جائے ہے اور پیدل نہیں جائے ہے لفتانزا سے جائے ہے۔ لفتانزا جرمن ہوائی کمپنی ہے اور یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ لوگ جو کام کرتے ہیں پکّا اور مکمّل کرتے ہیں۔ کسی بات کے کسی پہلو کو فراموش نہیں کرتے۔ ایک معمولی مثال لیجئے۔

جہاز کے باتھ روم کے اندر موٹا موٹا لکھا ہے یہاں سگریٹ پینا سخت منع ہے۔ اِس کے باوجود ایش ٹرے کا بھی انتظام ہے کہ اچھّا آپ نہیں باز آتے تو کم از کم اِس کے ٹوٹے تو ایش ٹرے ہیں بُجھایئے۔ اِس پر ہمیں وہ دانش مند خدمت گار یاد آیا جسے آقا نے معالج صاحب کو لانے کو بھیجا۔ وہ ساتھ ہی غسّال اور گورکن کو بھی لے آیا

زندگی موت تو خُدا کے اختیار میں ہے، نہ جانے اِن میں سے کَس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔

دِن کو یونیسکو کی کانفرنس۔۔۔۔ رات کو پاسامالم۔۔۔ یُوں تو اٹھارہ مُلک ہیں لیکن سامنے کی چنڈال چوکڑی ممتاز ہے۔ ان میں ملائشیا کے محفوظ ہیں۔ نیپال کے ڈکشت۔ فلپائن کے بینی پایو اور پاکستان کے من آنم کہ من دامن۔۔۔ چاند تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا۔ پانچواں ستارہ جو شام کو آتا ہے حروفِ تہجّی کی وجہ سے دِن میں ذرا دور بیٹھتا ہے۔ ایران کا جہانگیر شمسواری۔ محفوظ اور بنی پایو ہمارے پہلے سے دوست ہیں۔ ٹوکیو کی دو سال پہلے کی کانفرنس میں ایک روز جی چاہا کہ شہر کے ہجوم میں گُم جاؤ اور اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھو۔ محفوظ نے صاد کیا اور ہم نے زیرِ زمین ٹرین پکڑی۔ منزل کوئی نہ تھی لہٰذا جہاں ٹرین ختم ہوتی تھی وہاں اُتر کر باہر آ گئے۔ پوچھا یہ کون نگری ہے۔ معلوم ہوا کہ آساکوساکا کا علاقہ ہے۔ اہلاً و سہلاً۔ یہاں کی راتیں جاگتی ہیں اور لوگ۔۔ ستارہ می شکنند آفتاب می سازند۔ جن کو ایمان عزیز ہے اور جان عزیز ہے، اِن کی گلی میں آئے کیوں۔ ہمیں اتّفاق سے یہ دونوں چیزیں عزیز تھیں لہٰذا ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں مُڑ گئے اور ریشی چھتریاں خرید کر لوٹ آئے۔ پھر اُسی سال کے اپریل میں محفوظ میاں نے کوالالمپور میں

گھُمایا اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔ بنی پاپو سے بھی ایسی ہی راہ و رسم پہلے تھی۔ ڈکشت اور جہانگیر ہم ہوٹل بھی تھے۔ پاکستان کو اِن لوگوں نے کانفرنس میں اپنا لیڈر ٹھہرایا۔ اِس لئے بھی کہ اِس کام میں جس کے لئے یہ کانفرنس تھی پاکستان کی کارگزاری سب سے آگے تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پاکستان یعنی ہم نے قرارداد پیش کی۔ ہندوستان نے ناحق مخالفت میں تقریر کی۔ رائے شماری ہوئی تو ہندوستان رہ گیا۔ ایک بھی ووٹ اُسے نہ ملا۔ اَس میں ہماری بات کی اصابت کے علاوہ اَس ٹکڑی کی کوششوں اور لابی کو بہت دخل تھا۔ یہ اصولی لڑائی نہ تھی ورنہ ہندوستانی مندوب ہمارے ذاتی دوست تھے۔ کرتار سنگھ دُگل۔ شائستگی اور یار باشی کا کامل نمونہ۔ بعد ازاں ایک روز دُگل جی نے ایک قرار دار پیش کرنی چاہی تو ہم پہلے سے مشورہ کر لیا اور مسودہ میں ترمیم و اصلاح کا حق دیا۔ خیر وہ مسئلہ ایسا تھا کہ ہمیں تائید کرنی ہی

تھی۔

اس کانفرنس میں زیادہ انگریزی بولنے والے تھے۔ لیکن لاؤس کا نمائندہ انگریزی نہ جانتا تھا۔ محض اس کے لئے تین مترجم بلائے گئے تھے۔ دونوں بھاری بھر کم مردانِ معقول۔ اور اتّفاق سے دونوں اسرائیل سے درآمد کئے گئے تھے۔ انگریزی کو فرنچ اور فرنچ کو انگریزی میں ڈھالتے تھے جنہیں لاؤس کا نمائندہ کبھی نہیں سُنتا تھا اور ایک میم صاحب تھیں۔ ذات کی یونانی۔ زوجہ کسی انگریز کی۔ ایسی شیریں زبان مترجمہ بھی چشمِ فلک نے کیا خود ہم نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اگر کسی مقرّر کی تقریر میں ہمیں خاطر خواہ دلچسپی نہ ہوتی تھی تو ائیر فون لگا کر اِس کا فرانسیسی ترجمہ سُننے لگتے تھے۔ فرانسیسی ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن اِن صاحبہ کی زبان سے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ایک بار تواِس کانفرنس میں پنجابی بھی بولی گئی۔ ہوا یہ



کہ ڈُگل صاحب کی سمجھ میں ایک نکتہ نہیں آ رہا تھا۔ چیئرمین نے بھی وضاحت کی لیکن ڈُگل صاحب نے کہا۔ میں نہیں سمجھا۔ آخر ہم نے پنجابی میں بتایا۔ ڈُگل صاحب نے کہا۔ اچھّا تے ایہہ گل اے، پھیر ٹھیک اے۔

لاؤس کے مائندے نے ایک روز اپنی تقریر میں کہا دُنیا ہاتھی کی رفتار سے چل رہی ہے اور ہم لاؤس میں کچھوے کی رفتار سے۔ اِس پر لوگوں کو پُوچھنا پڑا کہ لاؤس میں ہاتھی کی رفتار کیا ہوتی ہے اور کیا اِس سے بھی تیز رفتار کوئی اور جانور وہاں ہے۔ موصوف نے بھی یہ فرمایا کہ اِس کانفرنس میں پلاننگ کی باتیں ہو رہی ہیں ہر کوئی پلاننگ کی بات کرتا ہے۔ میں اپنے ملک سے چلا تو ہمارے وزیر صاحب نے کہا تُم یہ دیکھ کر آنا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ چونکہ یہ فیشن ایبل لفظ ہے ہمیں اپنے ہاں بھی پلاننگ کرنی چاہیے۔ میں پیرس میں بھی یونسیکو کے دفتر گیا اور اُن سے کہا آپ کے ہاں کوئی شخص پلاننگ کا ماہر ہو تو ہمیں دے دیجیے۔ پتہ چلا کہ کُل سولہ آدمی ہیں اور سب کے سب مصروف ہیں۔ ہم نے اُن صاحب سے کہا کہ وہ پلاننگ کی فکر چھوڑیں کام کریں۔ کیونکہ بعض مُلکوں میں پلاننگ پر اتنی زیادہ توجّہ دی جا رہی ہے کہ کسی کو عملی کام کرنے کی فرصت نہیں رہتی۔ بولے ہمارے ہاں تو کام کرنے والے بھی نہیں۔ پلاننگ والے نہ سہی وہی کہیں سے دِلوا دیجیے۔

دوپہر کو ہماری ٹکڑی اُٹھتی اور اسلامک ریستوران میں جابراجتی۔ تھا تو یہ جنوبی ہند کے مسلمانوں کا لیکن بریانی اُس میں اچھّی ملتی تھی اور پھر لسّی بھی بنا دیتے تھے۔
ایک روز عُمر خیام میں کھانے کا طے ہوا۔ اس کا بہت شہرہ سُنا تھا۔ عجب دِلچسپ جگہ نکلی۔ عُمر خیام کا جو تصوّر کسی انجان کا ہو سکتا اِن لوگوں کا بھی تھا۔ دروازہ کھولتے ہی دیکھا کہ ایک مُورتی ہاتھ باندھے کھڑے نمستے کر رہی ہے کھانے کا کمرہ مُغل روم ہے۔ کھانوں کے نام بھی جہانگیر قورمہ، شالاماری پلاؤ، اور شاہجہانی کوفتہ وغیرہ ہیں۔ میز پر ایک بی بی کاندھے پر خم اُٹھائے ایک بڑے میاں کو شراب کا جام پیش کرتی دکھائی گئی تھی۔ مینو کے اندر رُباعیات بھی دے رکھی تھی مع ترجمے کے۔ ہم نے اور ہمارے ایرانی دوست جہانگیر نے اِن رُباعیات کو جو کہ نسخ میں تھیں پڑھنے کی کوشش کی لیکن نہ پڑھ سکے کیونکہ وہ فارسی میں نہیں تھیں۔ اِن ظالموں کو فارسی عربی کا فرق کیا معلوم۔ کہیں سے عربی ترجمہ اُٹھایا اور بلاک بنا کر چھاپ دیا۔ اسی کو اصل سمجھتے ہوں گے۔ دروازوں پر صرف مُغل آرٹ ہی نہیں تھا جابجا راجپوت آرٹ بھی تھا اور مورتیاں تو طاقوں کی محرابوں میں جابجا ہاتھ باندھے نمستے کرتی کھڑی تھیں۔ گویا غیر مشرقیوں کے لئے نہایت عمدہ سکّہ بند مشرقی ماحول کا انتظام تھا۔ کھانا اچھّا تھا مگر دام بھی چوکھے تھے۔ اسلامک ریستوران کے مُقابلے میں کوئی

پانچ گُنا۔

تماشا گُزری کا

شام ہوئی اور میاں محفوظ نے اپنی کار نکالی جسے وہ کوالالمپور سے اپنے ساتھ لیتے آئے تھے اور پورے جزیرے کا چکّر کاٹتے ٹُھکیاں لیتے تماشا مِرے آگے دیکھتے۔ آدھی شب کی خبر لاتے۔ ایک ٹُھکی پاساالم پر ضرور ہوتی تھی۔ پاساالم یعنی شبینہ بازار۔ نائٹ مارکیٹ۔ اے صاحبو ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی ضرورت نہیں شبیہ بازار وہ جگہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں بلکہ پھیری والوں کا بازار ہے جو جانے کب سے ہفتے کے ہر روز ایک نئی جگہ پر برپا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اگلے دِنوں میں یہ بازار گزٗری کہلاتے تھے۔ ٹک دیکھ مرے یار تماشا گُزری کا۔ بُدھ کو آرچرڈ روڈ پر یعنی مرکزِ شہر کے ڈیڑھ میل تک فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا۔ کھوئے سے کھوا چھلتا ہوا۔ ہر چیز چار ملتی ہے اور سستی بھی ہے۔ دُکاندار راہ جاتے کو پکڑتے ہیں۔ لے لو آٹھ آنے کی چیز چار آنے میں، کی ہانک بھی لگاتے ہیں۔ باقی دِنوں میں نواحی

بستیوں میں۔ ایک روز تو شہر سے باہر جنگل میں تھا جسے یُوں بھی وُوڈ لینڈ کہتے ہیں۔

آپ کتنا بھی بچیں، کُچھ نہ کُچھ لے کر ہی لوٹیں گے۔ بارہ بجے اور لوگوں نے ٹیوب لائٹیں اُتاریں اور سوداسمیٹ کر ٹرکوں پر بار کرنا شروع کیا۔ یہاں کے بھاؤ تاؤ میں عجیب مزا ہے۔

"کیا لوگے میاں اِس قمیص کے؟"

"بیس ڈالر (سنگاپور کا ڈالر امریکی ڈالر کا ایک تہائی ہوتا ہے)

"بیس بہت زیادہ ہے۔"

"آپ کیا دیں گے؟"

"سات۔"

"واہ صاحب اچھّی قدر کی۔ اچھّا پندرہ دے دیجئے۔"

"نہیں سات۔"

"اجی کُچھ تو بڑھیئے۔ بارہ کی تو ہماری خرید ہے۔ اچھّا بارہ ہی دے دیجئے۔"


5-!
50
NEW
SHIRTS
$500

"نہیں سات۔"

"اچھّا آٹھ دے دیجئے۔"

"کہہ جو دیا سات۔"

"پھر تو جایئے سات میں نہیں ملے گی۔۔۔اجی کہاں چلے۔ کتنی لیجئے گا؟"

جمعرات کو میفرسن روڈ پر یا یوچو کانگ روڈ پر یہی میلہ ہے۔ جمعہ کو نیوٹن روڈ کی باری ہے۔ ہفتے کو سُوڈ لینڈ میں جنگل میں منگل ہے۔ اتوار کو سماوانگ۔ پیر کو اوون روڈ۔ منگل کو چانگی روڈ یا پایا لیبر روڈ اور بُدھ کو پھر آرچرڈ روڈ۔ ہر جا کہ رفت خیمہ زود بارگاہ ساخت۔ چلو کہ سستی لگا دی ہے خُونِ دِل کی کشید۔

آپ پیسے والے ہیں یا نک چڑھے ہیں اور زندگی کا لُطف نہیں اٹھانا چاہتے تو ریفلز پلیس میں رابنسن کے اسٹور میں گھُس جایئے۔ جو چیز چاہیئے مل جائے گی۔ بندھوا لیجئے۔ لیکن جو مزہ چینج ایلی (Change Alley) یا آرکیڈ میں خریداری کا ہے وہ کہیں اور نہیں۔ یہ دو پتلی سی گلیاں ہیں۔ چینج ایلی کے باہر تو نوٹ بدلنے والے کھڑے ہیں۔ کسی بھی مُلک کا سِکّہ آپ خریدنا یا بیچنا چاہیں اِن کی خدمات حاضر ہیں اور

بھاؤ تاؤ کا بھی انتظام ہے۔ اِس گلی کو چینج ایلی اِسی لئے کہتے ہیں۔ گلی میں گھُسے تو فقط کرشمہ ہی نہیں بلکہ دُکاندار بھی دامن دِل می کشد کہ جا اینجاست۔

گھڑیاں۔ کیمرے۔ پین۔ کپڑے۔ جوتے۔ خریدارو بتاو کیا خریدو گے اور ہاں جیب پاکٹ سے بھی ہوشیار۔ یہاں ٹک نگاہ چُوکی اور مال دوستوں کا۔ دس کی چیز پانچ میں مل تو جاتی ہے لیکن دِل کو دُگدھا رہتی ہے کہ شاید چار میں مل جاتی۔ یہاں یہ بھی امکان ہے کہ آپ آٹھ روپے میں پارکر پین لے لیں اور خوش خوش گھر جائیں اور چند روز میں ملمع اُتر جائے کیونکہ کون چیز ہے جس کی نقل ہانگ کانگ کے کارخانوں میں نہیں بنتی اور یہاں نہیں بِکتی۔

لبِ ساحل کے خیابان یعنی اسپلینیڈ میں شام کو رومانی جوڑے آ بیٹھتے ہیں۔ بنچ ہیں اور وہ ہیں اور اُن کی دُنیا ہے۔ یہاں کیا نہیں ہوتا۔ ظالم سماج کنکھیوں سے دیکھتا اور دانت کپکپاتا گزر جاتا ہے۔ ایک کشتی بیچ سمند کے لنگر انداز ہے۔ اُس تک جانے کے لیے ایک لانچ ہے۔ اُس کے اُوپر کے حصّے میں موم بتّیوں کی روشنی میں ناؤنوش کا انتظام ہے۔ پیچھے رقص گاہ ہے۔ ایک شب محفوظ میاں ہمیں وہاں بھی لے گئے۔ پینے والا تو جمعیت میں فقط ہمارا ایرانی دوست تھا ہم نے کوکا کولا سے شوق کیا اور بیٹھ کر چلے آئے۔ ہمیں یہ ایک بوتل بھی سات روپے میں پڑی۔ آگے کی بات آگے

والے جانیں۔ کیبرے نائٹ کلب اور نہ جانے کیا کیا؟ بہت ہیں۔ لیکن بنکاک کے پاسنگ بھی نہیں۔ ویت نام سے چھٹّی پر آنے والے امریکیوں کی ہورش رہی تو یہ شہر بنکاک بن جائے گا۔

مشرقِ بعید کے بعض مُلک مجمع الجزائر ہیں۔ مثلاً فلپائن اور انڈونیشیا۔ ان دونوں مُلکوں میں سے ایک میں ساڑھے تین ہزار جزیرے ہیں۔ دوسرا سات ہزار جزائر پر مُشتمل ہے۔ لیکن آباد فقط پچیس تیس جزیروں پر ہوتی ہے۔ باقی میں سے تو اکثر سمندر کے چڑھاؤ کے وقت زیرِ آب آجاتے ہیں۔ اور اُتار کے وقت سر باہر نکال لیتے ہیں۔ رقبہ بھی بعضوں کا مربّع گزوں کے حساب سے ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بعض ہندوستانی ریاستیں بھی ایسی ہی ہوتی تھیں کہ حُکمران راجا کہلاتا ہے لیکن آبادی پندرہ آدمیوں کی اور آمدنی کوئی پانچ روپیہ مہینہ ہے۔ مشہور ہے کہ ایک کہ والئ ریاست تو کھاٹ بچھائے سر پر کلغی لگائے بیٹھے رہتے تھے اور کھاٹ سے نیچے پاؤں نہیں اتارتے تھے کیونکہ وہاں سے دوسرے راجا کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ سنگاپور چھوٹا جزیرہ ہے لیکن اتنا بھی نہیں اور اہمیت میں تو بڑے بڑوں سے بڑا ہے۔ آبادی میں ۷۸ فیصد چینی ہیں کوئی ۱۲ فیصدی ملائی، چھ فیصدی ہندوستانی پاکستانی۔ باقی تین میں نہ تیرہ میں۔ ہندوستانی زیادہ تر جنوبی ہند کے۔ پھر بھی سندھی

دُکاندار اور سِکھ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ سندھی تو قریب قریب سبھی حیدر آباد کے اور سب کے سب پیسے والے۔ سِکھوں میں کُچھ بڑے متمول۔ باقی دُکانوں اور بینکوں کے چوکیدار۔ اِن دِنوں سنگاپور میں رونق افروز ہونے والوں میں فقط ہمیں تنہا مشہور آدمی نہ تھے۔ ہپّی لوگوں کے گورو گھنٹال شری مہیش یوگی بھی آ پدھارے تھے۔ لیکن آج کل مشرق میں روحانیت کی اِتنی قدر نہیں جتنی مغرب میں ہوتی ہے کیوں کہ یہ مال اِدھر ہی کا ہے، اِدھر ہی بِک جاتا ہے۔ سنگاپور کے اخبار نویسوں نے تو اُن کے تقدس کو نظر انداز کرتے ہوئے فقرہ بازی تک کی اور کہا یہ آپ کیا مالائیں منکے لئے پھرتے ہیں اور یہ مرگ چھالا۔ ہرن کی کھال کس مرض کی دوا ہے۔ وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے اور بولے سادھوؤں کا یہی سامان ہوتا ہے۔ بین الاقوامی محبّت کے بھوکوں کو اُنھوں نے رشی کیش آنے کی دعوت دی تا کہ ہمالیہ کے دامن میں سکون سے بیٹھ کر اپنی آتما کو سکون سے مالا مال کر سکیں۔ یہاں ۲۵ جنوری سے اِن کی بین الاقوامی کلاس شروع ہو رہی ہے۔ رشی جی تارکِ دُنیا آدمی ہیں۔ لہٰذا سنگاپور کے سب سے اُونچے ہوٹل۔۔۔ ہوٹل ملائشیا میں ٹھہرے تھے۔ لیکن صوفے پر آلتی پالتی مار کر ہی بیٹھتے تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا سُنا ہے آپ لکھ پتی ہیں۔ آپ کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ اُنھوں نے جواب

میں فقط اُنگلی اُٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ ہمارے رشی جی بین الا قوامی پیمانے کے ڈبّہ پیر ہیں۔ اب انہوں نے اعلان کیا ہے کہ دو سال کے اندر میں نیم ریٹائر ہو کر ہمالیہ کے دامن میں جا بیٹھوں گا۔ ریٹائر کا لفظ اُنہوں نے استعمال نہیں کیا پبلک کے پُر زور اصرار کی صورت میں یہ ارادہ ترک کر دینے کی گنجائش رکھی ہے۔

ہائے راما ہم کہاں آ گئے

بنکاک میں راما ہوٹل ہماری قسمت میں لکھا تھا۔ یہ بھی لفتانزا والوں نے لکھ دیا تھا۔ یہ ہلٹن ہوٹلوں کے سِلسِلے کی ایک کڑی ہے اور اِس کڑی میں پروئے جانے پر ہم خوش بھی ہوئے۔ بھائی لوگوں کی حبّ الوطنی کا پہلا ثبوت ہمیں اِس ہوٹل میں ملا۔ انگریزی کو یہاں وہ مقام حاصل نہیں جو ہمارے ہاں ہے۔ زیادہ تر دُکانوں کے نام اور اشتہارات تھائی زبان ہی میں نظر آئے۔ بنکاک پوسٹ یہاں کا ایک ممتاز انگریزی اخبار ہے، رائے تھامسن کی جاگیر میں شامل ہے۔ اور مینیجنگ ایڈیٹر اس کے ہمارے دوست سیّد محمد علی ہیں جو ڈان اور پاکستان ٹائمز وغیرہ میں رہ چُکے ہیں۔ اِس کی پیشانی پر نمایاں طور پر لکھا رہتا ہے۔

”سب سے کثیر الاشاعت اخبار۔ تعدادِ اشاعت پندرہ ہزار“

راما ہوٹل میں حبّ الوطنی کا مظاہرہ یہ لوگ بایں انداز کرتے تھے کہ تھوڑا کئے مسافر کی انگریزی نہیں سمجھتے تھے تاکہ وہ تھائی سیکھے۔ کونٹر پر ہماری گفتگو کُچھ اِس قسم کی ہوئی:

ہم: ہمارے دوست تنویر احمد خاں کی کوئی خبر ہے؟ اُنہیں ہمارے انتظار میں یہاں ٹھہرنا تھا۔

جواب: لنچ کا کمرہ وہ اُس طرف ہے۔

ہم: وہ ٹوکیو سے آج یہاں پہنچنے والے تھے۔

جواب: زیورات کی دُکانیں سامنے کی گلی میں ہیں۔

ہم: وہ یہاں نہیں آئے تو کوئی پیغام تو ہو گا۔

جواب: جی ہاں! سنگل کمرے کا کرایہ ایک سو چالیس بھات روزانہ ہے۔

ہم: آپ کے پاس بنکاک کے بارے میں کوئی ٹورسٹ لٹریچر ہے؟

جواب: جی نہیں، بارش کل نہیں ہوئی، شاید آج ہو؟

ہم نے تنگ آ کر کہا: سوال از آسماں جواب از ریسماں۔

جواب:۔جی نہیں۔ میرے پاس ریز گاری نہیں ہے۔

عاجز آ کر ہم نے کہا: ہائے راما! ہائے راما! ہم کہاں آ گئے۔

شام کو ابّو الحسین آتے اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہمیں بنکاک دکھایا۔ وہ اُنگلی سے اشارہ کر کے کہتے۔ یہ ہندوؤں کا پرانا مندر ہے۔ ہم نے دیکھا تو اس پر سیٹو ہیڈ کوارٹرز لکھا تھا۔

معلوم ہوا اِتنے ہیں وہ مندر آدھ میل پیچھے نکل گیا۔ وہ کہتے یہ نہر دیکھو، ہمیں وہ کارخانہ نظر آیا۔ اُنہوں نے کہا یہ شاہی محل ہے، وہاں ہمیں جوہڑ میں بطخیں تیرتی نظر آئیں۔ آخر ہم نے کہا: یا تو گاڑی کی رفتار کم کرو۔ یا پھر اُس مقام کا ذکر کرو جو آدھ میل آگے ہے تا کہ جتنی دیر ہم گردن اُدھر کو گھمائیں وہ ہمارے سامنے ہو۔ فرمائش کی کہ بنکاک کو مشرق کا وینس کہتے ہیں۔ زرا وہ نہروں کا جال تو دکھاؤ جس کی وجہ سے اِسے وینس گردانتے ہیں۔ ابو الحسین بولے: سرکار نے اِن سب کو پاٹ دیا۔ اُس پر دُکانیں اور سڑکیں بنا دیں۔ ایک جگہ بہت اُونچا مدّور منارہ نظر آیا۔ ہم نے کہا یہ کیا؟

بولے: یہ منارۂ فتح کہلاتا ہے۔

ہم نے کہا: کس کی کس پر فتح کی یادگار ہے یہ؟

ابّو الحسین بولے: تھائی لینڈ نے کسی لڑائی میں فرانس کو شکست دی تھی اُس کی یادگار ہے۔

ہم نے کہا: تھوڑی سی تاریخ ہم نے بھی پڑھی ہے۔ آخر وہ کون سی لڑائی تھی۔

تب ابو الحسین نے کہا: یہ تمہیں کیا، کسی کو بھی معلوم نہیں۔ پچھلے سال فرانسیسی سفیر کو بھی اِس جشن میں بُلایا گیا تھا جو اِس مقام پر ہوتا ہے۔ اُس نے کہا: صاحبو مُجھے خود معلوم نہیں وہ کون سی لڑائی تھی؟ کب ہوتی تھی؟ یہ اگر کبھی ہوئی بھی تھی تو اِسے ہم کبھی کا بھول چُکے ہیں۔ لیکن چونکہ سبھی مُلکوں میں منارۂ فتح قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے، تھائیوں نے بھی اِسے ضروری سمجھا۔ اصل چیز واقعہ نہیں ہے جذبہ ہے۔

ویت نام کی لڑائی بند ہونے کے خیال سے اگر کوئی ملک خوف کھاتا ہے تو وہ تھائی لینڈ ہے۔ کیونکہ یہاں ڈالروں کی بھرمار اِسی کے طفیل تو ہے۔ ہر روز تین ہزار فوجی یہاں چھٹی گزارنے کے لئے آتے ہیں۔ اُنہیں ۵ روز کی مہلت ملتی ہے اور ہر روز

۶۰ ڈالر خرچ کرنے ان کو لازمی ہیں۔ یہ اِسی مقصد سے ملتے ہیں، اگر کوئی خرچ نہیں کرتا تو اُسے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے انٹر کانٹینینٹل کے درجے کے کوئی ۵۰ ہوٹل ہوں گے۔ بار، نائٹ کلب اور حمام جس میں سب ننگے ہوتے ہیں۔ یہاں اِس طرح ہیں جس طرح کراچی میں پان کی دُکانیں۔ اِن کے نام بھی امریکیوں کو وطن کی یاد دِلاتے ہیں۔ میامی کلب۔ واشنگٹن کیبرے۔ لاس اینجلز حمام، یہ سب امریکیوں کے کپڑے اُتارنے کے کارخانے ہیں۔ فقط محاورے میں نہیں ویسے بھی۔ ہمارے ایک دوست بتاتے ہیں کہ پہلی بار میں ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرا۔ ۴۵ نمبر کمرہ مقرر ہوا۔ میں نے چابی لے کر کمرہ کھولا تو دیکھا کہ وہاں ایک صاحبہ فروکش ہیں۔

میں نے معذرت کی کہ معاف کیجئے۔ میں شاید غَلَط کمرے میں آ گیا۔ پٹاخ سے بولیں: ”جی نہیں۔ آپ بالکل صحیح کمرے میں ہیں۔“

”آپ کا تعارف!“

بولیں: ”میں اِس کمرے میں شامل ہوں۔“

”یعنی کمرے کے کرائے میں؟“

بولیں: ”جی نہیں، میری فیس الگ ہے۔ پچاس ڈالر۔“

یہ صاحب تھے مولوی قسم کے آدمی۔ بولے: ”بی بی تُم جاؤ۔ مُجھے یہاں فقط ٹھہرنا ہے۔ وہ بمُشکل مانیں۔ وہ بھی پانچ ڈالر ہر جانے کے لے کر۔



جہاں امریکیوں کی یورش ہو جائے وہاں ڈالر کی ریل پیل تو ہو جاتی ہے لیکن اور ہر چیز مع غیرت کے نایاب ہو جاتی ہے۔ یہ جاپان میں ہوا دوسری جنگ کے زمانے میں۔ بنکاک میں آج ہو رہا ہے۔ آبرو کی سوداگری میں لوگوں کو خُدا کے علاوہ کُچھ ڈر ہمسائے کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن جب سب ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں تو کوئی خیال

روکنے والا نہیں رہتا۔ راما ہوٹل بڑا معزّز ہوٹل ہے۔ لیکن جس بوائے نے سامان پہنچایا، اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی لنگڑی انگریزی اور کنایوں کی مدد سے جتا دیا کہ وہ ہمارے آرام کے لئے ہر طرح کی خدمات بجالانے کو تیّار ہے۔ خیر مسافروں میں ہم ایسے بدتوفیق بہت ہوتے ہیں لیکن ویت نام سے آنے والے سپاہی کو تو یہ پانچ دِن زندگی کے مستعار ملتے ہیں۔ ویت کانگ کی گولی اُس کی مُنتظر ہوتی ہے۔ پھر سحر ہو نہ ہو کِسے معلوم۔ ہوائی اڈّے سے باہر ایک امریکی کو تو ہم نے دیکھا کہ بیٹھا بھوں بھوں رو رہا ہے۔ ہم نے جانا کہ کسی تکلیف میں ہے۔

ہم نے کہا: ”ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔“

بولا: ”جاؤ جاؤ! تُم میری مدد نہیں کر سکتے۔ تُم یہ لڑائی بند نہیں کرا سکتے۔ کرا سکتے ہو؟“

یہ شخص پانچ دِن زندگی مُستعار کے گزار کر واپس جا رہا تھا۔ اِس وقت وہ زندہ ہے کہ نہیں کہنا مُشکل ہے۔

ہانگ کانگ

۱۹۶۶ء


JUMBO BAR
TAILOR
CITY HALL

لعبتِ چین کا نظر بٹّو

جس طرح کسی خوش منظر عمارت کی پیشانی پر ایک کالی ہنڈیا لٹکا دی جاتی ہے تا کہ اُسے نظر نہ لگے۔ اِس طرح چین کی اقلیم عظیم کے گلے میں بھی ایک نظر بٹّو بندھا ہے اور اِسے ہانگ کانگ کہتے ہیں۔ دراصل ہانگ کانگ کوئی ایک جگہ نہیں کم از کم دو جگہوں کا نام ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اِن میں ایک کا نام ہانگ ہو گا دوسرے کا کانگ۔ یہ بات نہیں۔ ایک تو جزیرہ ہے کوئی گیارہ میل لمبا۔ چوڑائی کہیں دو میل ہے کہیں تین میل۔ حد سے حد پانچ میل۔ اُس کا نام ہانگ کانگ (یا وکٹوریا) ہے اور دوسری چین کے جزیرہ نما کی ایک نوک جسے ہم ہاتھی کی دُم کے ڈھائی بالوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اس کا نام ہے کولون۔ اس کا رقبہ پونے چار میل ہے۔ اس میں بین الاقوامی ہوائی اڈّہ بھی ہے۔ برطانیہ کی فوجی بارکیں تھی اور وہ فروش گاہیں بھی جہاں سے سیّاح لوگ کیمرے، دُور بینیں، ٹرانسسٹر، سوٹ، قمیصیں اور الا بالا خرید

کے لوٹتے ہیں۔ کینٹن کو ریل بھی یہیں سے جاتی ہے۔

سرکاری دفاتر البتّہ ہانگ کانگ میں ہیں اور جزیرہ ہانگ کانگ سے کولون جانے کے لئے فیری میں جانا ہوتا ہے۔ فیری ایک بہت بڑی مسطح لانچ سمجھئے۔ درمیانی خلیج کہیں میل بھر چوڑی ہے کہیں کم۔ ایک جگہ تو بس ڈھائی فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ دونوں ساحلوں میں اور اِسی میں سے بڑے سے بڑے جہاز گُزرتے ہیں۔ جہازوں کی گزرگاہ نہ ہوتی تو کبھی کا پُل بن گیا ہوتا۔ کُچھ اور جزیریاں بھی ہیں اور ساحلِ چین پر نئے علاقہ جات کے نام سے ایک خاصا بڑا رقبہ زمین (۳۵۵ مربّع میل) بھی لیکن بنیادی علاقے کولون اور ہانگ کانگ ہی جانیے۔

ہمارا سفر نامہ یکم جون کی شام کے ساڑھے چار بجے سے شروع ہوتا ہے۔ جب بی او اے کا طیارہ کولون کے ہوائی اڈّے پر اُترا اور قُلی نے ہمارے سامان کو ہاتھ لگانے کے دوڈالر ہم سے لے لئے۔ ہوٹل کی ہمیں تشویش نہ تھی کیونکہ ایک مشہور ہوائی کمپنی نے جس کا ٹکٹ لے کر ہم کراچی سے چلے تھے ہم کہہ دیا تھا کہ ''فورچونا'' ہوٹل میں جا کر فروکش ہو جانا۔ ہمارے دوسرے ساتھی تو ہمیں حیرت سے تکتے رہ گئے کیونکہ اُنہیں ہوائی اڈّے پر واقع معلوماتی دفتر برائے ہوٹل سے معلومات کرنی تھیں۔ ہم گردن اکڑائے ہوٹل فورچونا کی گاڑی میں بیٹھ گرد و پیش کا منظر دیکھتے،

سیٹی بجاتے، جھٹ پٹ فورچونا پہنچ گئے اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتے مینجر سے جا کر کہا۔ لائیے حضرت ہمارے کمرے کی چابی اور بجھواتے رہیے ہمارا سامان اوپر۔

مینجر نے کہا: ”اسم شریف؟“

ہم نے اپنا اسم شریف بتایا لیکن مینجر کی حیرانی دور نہ ہوئی۔ بولا ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”ٹوکیو سے۔۔۔ اور کہاں سے آتے؟“

”نہ ہمارے ہاں آپ کا نام ہے نہ آپ کے لئے کوئی کمرہ۔“

ہم نے کہا۔ ”عزیزِ من ذرا غور سے دیکھو۔ ہم کراچی سے انتظام کرا کے چلے تھے۔“

عزیزِ من نے غور سے دیکھ کر کہا۔ ”یہاں مسٹر ابن کا نام تو ہے۔ آپ اپنا نام انشا بتا رہے ہیں۔“

ہم نے کہا: ”ہمیں تو ہیں مسٹر ابنے۔ ہمارا پورا نام ابنِ انشا ہے۔“

مینجر صاحب بولے۔ ”پھر آپ پرسوں تشریف لائیے۔ آپ کی بُکنگ تین تاریخ

سے ہے۔ آج کوئی کمرہ نہیں۔"

بات یہ ہے کہ ہم تین جون کے بجائے یکم ہی کو وارد ِہانگ کانگ ہو گئے تھے۔ ٹوکیو میں ہم رہتے، لیکن کھاتے کیا۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم نے کراچی اور ہانگ کانگ دونوں جگہ اپنے پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع بھجوائی تھی اور اب ہوٹل والے کہہ رہے تھے کہ ہم کو نہیں معلوم!

"اب ہم کہاں جائیں۔"

مینجر بولا۔ "کسی اور ہوٹل میں چلے جایئے۔"

"قریب ترین ہوٹل کون سا ہے؟"

"قریب ترین تو کلوور clover ہوٹل ہے، یہ سامنے رہا۔ میں اُس کے مینجر کو فون کئے دیتا ہوں۔ ابھی آپ کا سامان لے جاتا ہے۔"

"اچھّا ہوٹل ہے؟"

"ہمارے ہوٹل کے پائے کا تو نہیں۔ خیر آپ خود دیکھ لیجئے گا۔ کرایہ بھی کُچھ کم ہے۔ ہمارا ۴۵ ڈالر روزانہ، اُن کا ۳۵ ڈالر۔"

کلوور ہوٹل کی نیچے کی منزل پر تو کوئی سینما ہے۔ اُوپر دس گیارہ منزلیں ہوٹل کی ہیں۔ دفتر تیسری منزل پر ہے۔ وہاں تو ہم نے بس اپنا نام اور کام وغیرہ لکھوایا اور ایک بیرا ہمیں آٹھ سو بارہ نمبر کے کمرے میں لے گیا۔ اُس کے اندر مشین دھڑ دھڑا رہی تھی۔ ہم نے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

بولے۔ "ائیر کنڈیشنر ہے۔ اِس سے کمرہ ٹھنڈا رہتا ہے۔"

"ٹھنڈا تو نہیں ہے۔"

"جی رات کو ٹھنڈا ہو گا۔"

"لیکن اِس میں سے تو ٹھنڈی ہوا نہیں آرہی۔"

بیرے نے کہا۔ "حضور آپ اِس کے سامنے بیٹھ کے دیکھئے تو محسوس ہو۔"

"لیکن یہ ہوا اور خنکی پلنگ تک تو آنی چاہئے۔"

"جی بے شک آنی چاہئے لیکن پلنگ کو آپ گھسیٹ کر اِس کے پاس لے جایئے گا۔ آرام پایئے گا۔"

"اچھّا تو جاؤ۔۔۔۔ چابی دے دو کمرے کی۔۔۔۔ خُدا حافظ۔"

بیرا طول۔ "جناب چابی تو ہم گاہک کو نہیں دیتے۔ یہ ہمارے ہی پاس رہتی ہے۔ ہوٹل کی چیزوں کی حفاظت جو کرنی ہوئی۔"

ہم نے غُسل خانہ وغیرہ دیکھا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ اگرچہ اس ٹھاٹھ کے مُقابلے میں کُچھ جس کے ہم ٹوکیو میں عادی ہو گئے تھے۔ تھرماس میں سے پانی پینا چاہا تو گرم۔ ہم نے پھر ہیرے کو بُلایا۔ بولا۔ "اچھّا جناب لاتا ہوں۔ ٹھنڈا پانی کہیں سے۔"

ٹوکیو میں تو موسم بہت ہی خوشگوار تھا اور ہم گرم سوٹ زیبِ تن کئے ہوئے تھے۔ لیکن ہانگ کانگ کا موسم اور حابس۔۔۔ ہم نے خیریت اِسی میں جانی کہ کپڑے بدل لیں۔ سوٹ کیس میں نیچے دو جوڑے ٹھنڈے کپڑوں کے رکھے تو تھے۔ لیکن جیب میں ہاتھ ڈالا تو سوٹ کیس کی چابی غائب۔ خُدا جانے کہاں رہ گئی۔ ہم چابیاں، پیسے، ہوائی جہاز کے ٹکٹ وغیرہ گُم کرنے میں شہرتِ عام اور بقائے دوام تو رکھتے ہیں لیکن یہ بھلا کون سا موقع تھا چابیاں گُم ہونے کا۔ بیرے کو بُلایا اور اُس کو ٹھہر ٹھہر کر سمجھایا کہ یہ تالا معمولی قسم کا ہے اِس کو کسی بھی سوٹ کیس کی چابی لگ سکتی ہے۔

کہیں سے چابیاں لاؤ اور کھول دو۔ شاباش۔

اُس نے صاف جواب دے دیا کہ جناب ہمارے پاس نہیں۔ ہم نہیں کھولتے تالا۔

ہم نے کہا۔ ”کسی تالا کھولنے والے کو بلاؤ۔“

بیرا بولا۔ ”اس وقت تو صبر کیجیئے۔ صبح دس بجے ملے گا تالا کھولنے والا۔“

”دس بجے کل؟ بلاؤ منیجر کو۔۔۔ اچھّا ہم خود ہی منیجر کے پاس جاتے ہیں۔“ منیجر نے بھی کل دس بجے کا مژدہ سُنایا۔ ہم نے کہا نا مُمکن۔ کسی تالا توڑنے والے کو بلاؤ ورنہ ہم خود توڑیں گے تالا۔

خیر منیجر نے کِسی کو پھر بھیجا کہ کوشش کرے۔

تھوڑی دیر بعد میں کوریڈور سے ایک بُڈّھا بر آمد ہوا جس کے ہاتھ میں سُوا تھا۔ ایک ہتھوڑا۔۔۔ ہماری باچھیں کھِل گئیں لیکن اِس وقت اِن کو سمیٹنا مُشکل ہو گیا جب اُس نے اپنے کام کا ہدیہ طلب کیا۔۔۔ چار ڈالر۔

ہم نے بیرے سے فریاد کی۔ چار ڈالر؟ غضب خُدا کا۔ ارے میاں مجھے سوٹ کیس خریدنا نہیں۔ نہ تالا بنوانا ہے۔ حتّیٰ کہ چابی تک بنوانی منظور نہیں۔ فقط کوئی تار یا سُوا

تالے میں داخل کر کے اِسے کھولنا ہے۔ ایک ڈالر دے دوں گا۔"

"نا۔"

"دو ڈالر۔"

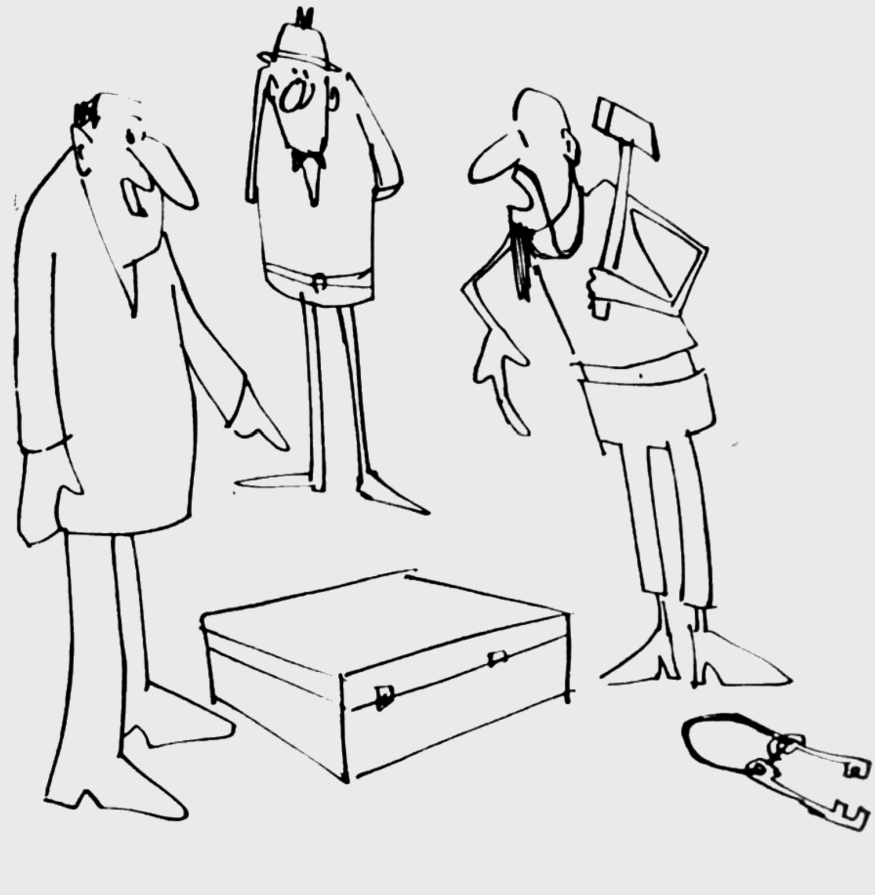
"جی نہیں۔"

"تین ڈالر۔"

بُڈّھا منغّض ہو کر چل دیا کہ جناب میں نے پہلے ہی مناسب دام بتائے تھے چار ڈالر سے ایک پیسہ کم نہ ہو گا۔ ہم نے اُسے بُلایا۔ اُس کی ہتھیلی پر چار ڈالر رکھے۔ اُس کی مُٹھّی کو اپنے ہاتھ سے بند کیا۔ اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا۔ "اچھّا حضور۔۔۔ تاوان حاضر ہے۔ اب کھولیے تالا۔"

اُس مردِ متمکن نے چابی کے سوراخ میں سُوا داخل کیا ہی تھا کہ تالا کھٹ سے کھُل گیا۔ اگر کُچھ وقت سے کھلتا اور شاید ہمیں اپنے چار ڈالر کے جانے کا اتنا نقصان نہ ہوتا لیکن اب طیش آیا اور ہم نے اُس شخص سے کہا۔ شکریہ لیکن ہماری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔۔۔ اور بیر اصاحب تُم بھی۔"

بیرا بولا۔ ”جناب اور کوئی ہوٹل ہوتا تو اتنے سارے کام کے سات آٹھ ڈالر سے کم نہ لگتے۔ وہ میری وجہ سے اِس نے چار ڈالر میں یہ کام کر دیا مطلب اِس یہ تھا کہ میں بھی امیدوارِ کرم ہوں۔ دو ڈالر بخشش میری بھی یاد رکھیۓ گا۔ اور وہ واقعی اپنی بخشش لے کر ٹلا۔ تالا کھولنے والے سے کتنی بخشش وصول کی ہو گی ہم نہیں کہہ سکتے۔



کمرے دو طرح ائیر کنڈیشن کئے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں اُنہیں ٹھنڈا رکھا جاتا ہے اور سردیوں میں گرم۔ ہمارا خیال ہے کلوور ہوٹل نے اِس خیال سے کہ ہم ٹوکیو کے ٹھنڈے شہر سے آئے ہیں اور گرم سوٹ پہنے ہوئے ہیں ہمارے لئے سردیوں والے ائیر کنڈیشن کا انتظام کیا تھا۔ خیر ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ غُسل خانے میں گئے۔ اپنی تازہ غزل گُنگنائی۔ نہائے بھی۔ تب کُچھ سکون ہوا۔ اب ہم نے پتلون اور بُشرٹ زیبِ تن کی۔ ائیر کنڈیشنز بند کیا جس سے گرمی میں قدرے افاقہ ہوا۔

اب ہمارے پاس دو پونے دو دِن تھے۔ جو کُچھ کرنا تھا انہی میں کرنا تھا۔ پہلے تو ٹوکیو کے ٹھاٹھ کے بعد کا عالم دیکھ کر چار آنسو روئے۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی کمرے کا کرایہ یہی تھا، زیادہ نہ تھا۔ لیکن نوکر چاکر، ماما، اصیلیں بلائیں لینے کے لیے تیّار رہتی تھیں۔ اور من مانی لڑکیاں گیشاؤں کا لباس پہنے لِفٹ میں سلام دُعا کرتی تھیں اور دِل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ خیر میاں آزاد ؎

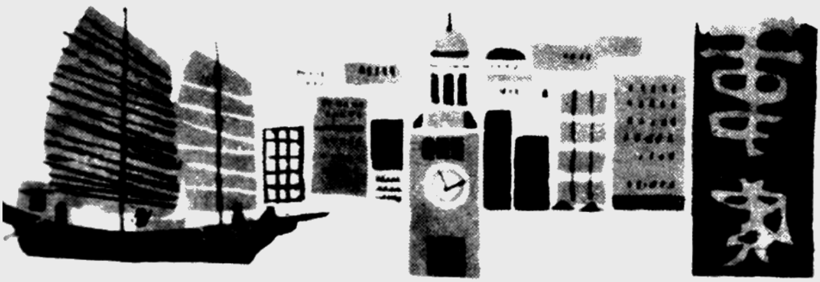
ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے

ہوٹلوں کے کمروں میں ایک بورڈ کا رہتا ہے کہ کرایہ اتنا ہے اور اگر آپ کے ہاں کوئی چوری چکاری ہوئی تو ہم ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ اور بارہ بجے کمرہ خالی کرنا ہو گا۔ یہ

اور وہ ایک چھوٹا سا نوٹس البتّہ لیمپ کے پیچھے اور تھا:

”ہم اپنے کرم فرماؤں کو ناشائستہ لوگوں اور اُن کے ٹیلی فون سے محفوظ رکھنے کے لئے مناسب خیال کرتے ہیں کہ آدھی رات کے بعد کوئی ناشائستہ فرد آئے یا اس کا فون آئے تو اپنے کرم فرما کے کمرے سے نہ ملائیں۔ البتّہ اگر ہمارے کرم فرما ایسی ممانعت ضروری نہ سمجھیں تو ہر طرح سے آزاد ہیں۔“

اِسے دیکھا اور فلور بوائے کی مُونچھوں میں سرسراتی مُسکراہٹ کو دیکھا تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ یا اللہ ہماری عصمت اور آبرو تیرے ہاتھ ہے۔



نمبر ۷۹ کی تلاش میں

فور چونا ہوٹل میں کمرہ نہ ملنا اور ہمارا اکلوور ہوٹل میں وارد ہونا سوءِ اتّفاقات کے سِلسِلے کی پہلی دو کڑیاں تھیں۔ تیسری کڑی تھی ہمارے سوٹ کیس کی چابی کا گُم ہونا اور اِس کو کھلوانے کی کوشش میں ہمارا بقدر چار ڈالر مُفلس تر ہو جانا۔ ہانگ کانگ کا پروگرام ہی اس طرح بنا تھا کہ ائیر کمپنی کے خرچ پر ہوٹل میں ٹھہریں گے اور جو چند ٹکے جیب میں ہیں اِن سے شہر دیکھیں گے اور کوئی چھوٹی موٹی چیز قمیص وغیرہ خریدیں گے۔ لیکن یہ کیا پتہ تھا کہ ہانگ کانگ میں جہاں ہم یکسر اجنبی تھے ہمارے لئے عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔

ہم نے سوٹ کیس کھولا اور وہ پینٹ نکالا جو کراچی سے ہمارے ایک دوست نے ہمیں دیا تھا کہ ہانگ کانگ پہنچو تو فلاں صاحب کو پہنچا دینا۔ فون کر دینا۔ وہ خود ہی آ

کر لے جائیں گے اور چونکہ وہ لوگ پنجابی ہیں تمہاری رہنمائی اور مدد کا حق بھی ادا کریں گے۔ پس ہم نے فون کیا۔ پھر فون کیا۔ پھر فون کیا۔ لیکن صدائے برنخاست۔ آخر سوچا کہ کیوں نہ خود اِن لوگوں سے شرفِ ملاقات حاصل کیا جائے۔ یہ جگہ واٹرلو پر تھی اور وہاں وکٹوریہ مینشن تلاش کر کے اُس کی چھٹی منزل پر فلیٹ ۷۴ میں جانا تھا۔ ہوٹل ہمارا نتھان روڈ پر تھا جسے کولون کی بندر روڈ سمجھئے۔ اب ہم نے وہ نقشہ نکالا جو ہوٹل فورچونا کی لابی سے لے لیا تھا اور بیرے سے کہا ہمیں ذرا اِس پر بتاؤ کہ واٹرلو روڈ کہاں ہے۔ بیرے نے نہایت شفقت سے نقشہ پر اُنگلی پھیرنی شروع کی جو بہت جلد نقشہ کی سرحد پار کر کے میز پر چلی گئی۔ معلوم ہوا ہوٹل فورچونا والوں نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنے گرد و نواح کی چند سڑکوں اور گلیوں کے علاوہ نقشے پر کُچھ نہ دیا جائے تاکہ کوئی مسافر غریب بھٹک نہ جائے۔ خیر بیرے نے کہا جہاں نقشہ ختم ہوتا ہے وہاں سے دو سو گز آگے جایئے اور پھر کسی سے پوچھ لیجئے کہ واٹر لُو روڈ کِدھر ہے۔ ہم نے کہ کتنے ہی شہروں کی گلیوں کو پیادہ پارَوند چُکے ہیں نقشہ اُٹھایا، پیکٹ بغل میں مارا اور خضرِ راہ بیرے کی بتائی ہوئی سِمت میں روانہ ہو گئے۔ کرنا خُدا کا ایسا ہوا کہ چند چوک کے بعد واٹر لُو روڈ مل گئی۔ نتھان روڈ سے داہنے ہاتھ کو ایک تِرچھی سی شاخ نکل گئی تھی۔ اُس وقت ہمیں یہ اندازہ نہ

تھا کہ اتنے چھوٹے آم میں اتنی بڑی گُٹھلی ہو سکتی ہے۔ یعنی اِس چھوٹے شہر میں اتنی لمبی سڑکیں ہو سکتی ہیں۔ ہم یہ سمجھے کہ سڑک مل گئی تو گھر بھی مل گیا سمجھو۔ وکٹوریہ مینشن کا نمبر ۹۷ تھا۔ کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غم دِل۔

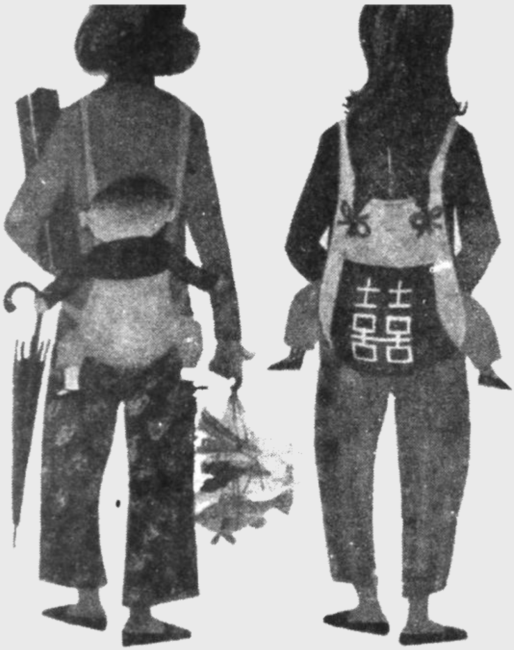
لیکن اِس شبِ سُست موج کا ساحل نہ تھا۔ اوّل تو واٹر لُو روڈ پر نمبر تھے نہیں، تھے تو آٹھ دس مکانوں کے بعد ایک نظر آتا۔ اب ہم نے پوچھنا شروع کیا۔ جس چینی کو ہم اُس کے کپڑوں سے تعلیم یافتہ جان کر سوال کرتے تھے وہ کاندھے اُچکا کر رہ جاتا اور اپنی راہ ہو لیتا۔ ایک آدھ نے انگریزی میں کہا ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن ایسے بھی ملے کہ ہمارے سوال کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ نہ کاندھے اُچکائے، نہ معذرت کی۔ بلکہ ہمیں بھرپور نظر سے دیکھ کر چل دیے اور ہم اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے۔ چلتے چلتے، چلتے چلتے کئی چوک پار کرنے کے بعد ہم کو ۸۰ ایک جگہ لکھا مِل گیا اور ہم نے کہا لو معرکہ مار لیا۔ اب ایک اگلا یا اِس سے پچھلا نمبر ۹۷ ہو گا۔ لیکن ۸۰ کی یہ عمارت کوئی گرجا تھی اور اِس کے ساتھ والے مکان کا نمبر ۳۷ تھا۔ اِس کے بعد ایک گلی تھی اور گلی کے پار ۵۹ نمبر کا مکان تھا۔ معلوم ہوا اِس سڑک کے مکانوں کے لیے نمبروں کی لاٹری ڈالی گئی تھی۔ نمبروں کی ترتیب کا فرسودہ اصول استعمال نہ کیا گیا تھا۔ اب تک ہم ڈھائی میل کی راہ طے کر چکے تھے اور اب تک ہمارے ساتھ جو گزری تھی اِس کی

بناء پر غُنچۂ دِل بھی نہ کِھلا تھا بلکہ دِل تنگی کی کیفیت تھی۔ خیر اب جو ایک بھلے مانس گزرے اُن سے ہم نے فرمائش کی کہ وکٹوریہ مینشن بتاؤ۔ اُس شخص نے سڑک کی دوسری طرف اونچی اونچی عمارتوں کے ایک سِلسِلے کی طرف اشارہ کیا۔ کوئی دو فرلانگ دور اور کہا۔ وہیں کہیں ہے ڈھونڈ لیجئے۔

قصّہ کوتاہ ۸۰ سے کوئی دو فرلانگ دور ۷۹ مل گئی۔ اب فقط چھٹی منزل پر جانے اور ۷۴ نمبر فلیٹ تلاش کرنے کی بات تھی۔

بلڈنگ میں دو تین لفٹ لگے تھے۔ ایک کا بٹن دبایا اور انتظار کیا کہ دروازہ کھُلے۔ دروازہ کھُلا تھوڑی دیر بعد۔ اِسے ہم نے اپنی طرف کھینچا تو دروازے کے کواڑ کی طرح باہر کو کھُل گیا۔ اندر جا کر ہم نے چھ نمبر کا بٹن دبایا لیکن لفٹ ساکت۔ پھر دبایا۔ اب کے بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر دروازے کو جھٹکا دیا اور لِفٹ نے اُوپر چڑھنا شروع کیا ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶۔۔۔ ارے یہ کیا۔۔؟ ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳۔۔۔۔ گویا ہم تیرھویں منزل پر پہنچ گئے تھے۔ اب ہم نے پھر ۶ دبایا اور لِفٹ نے نیچے اُترنا شروع کیا لیکن ۶ پر اب کے بھی نہ رُکا اور زمین پر آکر دم لیا۔ اب کے ہم نے یہ ترکیب کی کہ منزلِ مقصود کے قریب جا کر STOP کا بٹن دبایا لیکن اِس لِفٹ کی تعمیر میں صورت خرابی کی یہ نکلی کہ یہ پانچویں اور چھٹے مالے کے درمیان جا

کے رُکا۔ پھر دبایا تو چھٹے اور ساتویں کے درمیان سفید دیوار کے سامنے مُعلّق ہو گیا۔ ناچار ہم اُوپر جا کر پھر نیچے آئے اور پھر زمینی منزل پر نِکل آئے کہ کوئی شخص ملے تو اِس نادر روزگار لفٹ کی ترکیب استعمال معلوم کی جائے۔



اتنے میں ایک دوسرے لِفٹ سے ایک انگریز نُما بزرگ برآمد ہوئے۔ اُن سے ہم نے احوال کہا تو وہ مُسکرا کر، دوسرے لفٹ میں لے گئے اور ہمیں ٦ پر جا کر اُتارا۔

٧٤ نمبر کا فلیٹ کاریڈور کے سِرے پر تھا لیکن دروازہ اُس کا بند تھا اور دروازے کے

باہر ایک آہنی جنگلا لگا تھا۔ خیر ہم نے بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد کسی خاتون کے دروازے کو جزوی طور پر کھولا اور کہا۔

"کیا کام ہے؟ کِس سے ملنا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "ڈاکٹر فلاں اور اُن کی بیگم فلاں یہاں رہتی ہیں؟"

اُس خاتون نے کہا۔ "یہ تو بعد میں بتاؤں گی پہلے آپ کام بتایئے؟"

ہم نے کام عرض کیا۔ "یہ ایک پیکٹ کراچی سے لایا ہوں۔ اُنھیں دینا ہے۔"

اب اُنہوں نے دروازہ کھول دیا۔ اندر دو تین صاحب بیٹھے تھے جنہوں نے ہمیں دیکھ کر کِسی قسم کی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ ہم نے اپنے سلام علیکم کا جواب بھی نہ سُنا۔ اور خود ہی ایک کُرسی لے کر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے یہ نہ پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ بہر حال ہم نے اپنی بپتا سُنائی۔ آخر ایک صاحب بولے۔ "ہاں ہمارا فون خراب ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ ہم آپ کو مل گئے کیونکہ آج ہم یہ فلیٹ بدل رہے ہیں۔ کہیں اور چلے جائیں گے۔" ہم نے اُن کا بہت شکریہ ادا کیا کہ آج مکان نہ بدل کر ہماری اتنی زحمت بچالی اور پھر سلام کر کے چلے آئے۔

وقت کھانے کا ہو رہا تھا اور ہماری بھوک بھی چمک اُٹھی تھی۔ راستے میں ایک دو چینی ریستوران نظر آئے لیکن جاپانی چینی کھانا اتنے دِن کھایا تھا کہ اب اُس کا شوق نہ تھا۔ ہم بے خیالی میں اپنے ہوٹل سے کوئی آدھ میل آگے نکل گئے جہاں داہنی طرف فوجی بیرکس اور خاردار تاروں کا سِلسِلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم غَلَط جگہ آ گئے۔ اب کے جو ہم لوٹے تو چوک ہی پر ایک صاحب نے کھیسیں نکال کر ہم سے کُچھ سوال کیا۔ پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ ہم نے پوچھا کیا؟

بولا۔ ”چوکری“

چینی ہم جانتے ہیں اور انگریزی میں ایسا لفظ ہمیں یاد نہ تھا لہٰذا مزید وضاحت طلب کی۔ اب کے اُس نے کہا۔ ”چوکری چاہیئے۔“

ہم نے کہا۔ ”what چوکری۔“

بولا۔ ”عمدہ، نفیس۔young۔“

اب ہم جان گئے کہ ہندوستانیوں پاکستانیوں کی آسانی کے لیے اُنہوں نے یہ لفظ یاد کر رکھا ہے۔ اِس پر ہانگ کانگ کی حکایات اور روایات یاد آئیں۔ ایک زمانے میں

شنگھائی میں بھی یہ عالم تھا کہ راہ چلتوں کو روکا جاتا تھا اور سارے شہر میں قحبہ خانوں۔ چنڈو خانوں اور دلالوں کے ٹھکانوں کا جال بِچھا تھا۔ چین میں تو اب یہ چیز ناپید ہے۔ ایسی ناپید جیسے کبھی نہ رہی ہو۔ لیکن ہانگ کانگ میں مسافر نوازی کا معقول انتظام ہے۔ یہاں جیب بھی کٹتی ہے اور قدم قدم پر تیر تھ رام فیروز پوری کے ڈاکٹر نومانچو اور سنہری بچھّو بھی موجود ہیں۔ ہوٹلوں میں آپ کا سوٹ کیس بھی کھول لیا جاتا ہے اور اُس پر ہمیں ہوٹل کے کمرے کا وہ نوٹس بھی یاد آیا کہ ناشائستہ لوگوں اور اُن کے ٹیلی فونوں سے خبر دار۔

ہم جلدی سے لندن تھیٹر والی گلی میں مُڑ گئے اور اگلے ہی چوک میں پھر گِھر گئے۔ پہلے تو ایک رکشا والے نے جس کے چہرے پر سب کُچھ لکھا تھا ہمارا راستہ روکا۔ ہم نے فُٹ پاتھ بدلا تو ایک چھجےّ کی آڑ سے دو آدمی اور نکلے۔ اُن کے پاس مالِ تجارت ایک ہی تھا۔ اچھّا اور ہانگ کانگ کی روایت کے مطابق سستا۔ ناپسند ہو تو دام واپس۔

خیریت اِسی میں نظر آئی کہ نتھان روڑ ہی پکڑو۔۔۔۔۔ ریستوران کی تلاش بھی ملتوی۔ آخر کلوور ہوٹل ہی میں آ کر دم لیا۔ اُس کی چھت پر بھی ایک ریستوران ہے جس کے ساتھ جنّت گاہ اور فردوس گوش کے کُچھ التزامات ہیں۔ ہم نے اُوپر پہنچ کر ایک نیم تاریک بر آمدے میں جلدی جلدی کُچھ منگا کر کھایا۔ ایک کوکا کولا پیا اور

بیروں کو مایوس اور متحیّر چھوڑ اپنے کمرے میں آ گئے۔ یہ عزم ہم نے کر لیا تھا کہ آدھی رات کو کوئی فون آئے یا یہ آئے۔ ہم علی الصباح اِس ہوٹل سے کنارہ کریں گے۔ پہلے چابی گُم ہوئی تھی اب کے کہیں خود ہی گُم نہ ہو جائیں۔

افغانستان

۱۹۶۶ء



ایک سفر نامہ جو کہیں کا بھی نہیں ہے

ہم نے سفر نامے بہت لکھے ہیں۔ چین و ما چین کے سفر نامے۔ ایران توران کے سفر نامے، اِن جگہوں کے سفر نامے جہاں ہم نہیں گئے۔ اور اِن وارداتوں کا چشم دید احوال جو ہم نے نہیں دیکھیں۔ انسانوں کو اللہ تعالی نے ٹانگیں بے شک دی ہیں لیکن دماغ بھی تو دیا ہے جس کی اہمیّت ٹانگوں کے برابر نہ ہو۔ بہر حال ہے تو۔

آج کا سفر نامہ ہے تو سفر نامہ لیکن اگر کوئی پوچھے کہ کہاں کا ہے تو بتا بھی نہ سکیں۔ آج صُبح ہم کابل کے لیے چلے تھے لیکن رات ہو گئی ہے اور کابل پُہنچے نہیں ہیں۔ پہلے راولپنڈی میں لیٹ ہوئے۔ پھر پشاور سے چلنے میں تعویق ہوئی۔ آخر چلے۔ پائلٹ نے بتایا کہ آپ کے نیچے اِس وقت درّہ خیبر ہے۔ پھر کہا یہ دہنی طرف کو جلال آباد کا قصبہ ہے اور یہ ٹیڑھی میڑھی جوئے کم آب دریائے کابل کہلاتا ہے۔ اب آپ

حکومتِ افغانستان کے وہ فارم بھر دیجئے جن میں وطنیت قومیت وغیرہ لکھنی ہوتی ہے اور اب صاحبان (پائلٹ نے کھنکار کر کہا) اب تھوڑی دیر میں ہم پشاور کے ہوائی اڈّے پر اُترنے والے ہیں کیونکہ کابل گھنگور بادلوں میں چھُپا ہوا ہے۔ وہاں ہم اُتر نہیں سکتے۔ اُمّید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہو گا۔

دراصل آثار شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھے۔ جب سے کابل جانے کا سُنا لوگ ہمیں برابر ڈرا رہے تھے کہ سردی ہے جانا نہیں۔ مر جاؤ گے۔ مولانا حامد علی خاں نے کہا۔ ”میں کابل میں دو دو اوور کوٹ پہن کر بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ تن زیب کا انگر کھا پہنے ہوئے ہیں۔“ حمید اختر نے نصیحت کی کہ ”جاتے ہی وہاں سے دگلہ نما افغانی کوٹ خرید لینا (ورنہ نتائج کا ذمّہ دار نہ ہو گا) اِن لوگوں کا ہم ذکر نہیں کرتے جو ہم سے جل کر طعن تشنے پر اُتر آئے تھے۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے جو تُم وہاں جا رہے ہو۔ خیر فکر ہر کس قدر ہمّت اوست۔

ایک جونا مارکیٹ ہم شرما شرمی میں نہیں گئے ورنہ کون سی جگہ ہے جہاں سے ہم نے اپنے لیے کپڑے جمع نہیں کئے۔ ہمیں دراصل اوور کوٹ درکار تھے اور کوئی اونی زیر جامہ تو سبحان اللہ۔ لیکن ہماری شہرت ایسی خراب ہوئی کہ لوگوں نے قیاس کیا، ہم شاید فلسطین کے مہاجروں یا افغانستان کے پاؤندوں کے لئے کپڑے جمع کر رہے

ہیں۔ نتیجتاً سب نے اپنے پھٹے ہوئے گِھسے ہوئے کپڑے ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر واپس دے گا اور ڈرائی کلین کرا کے دے گا۔ نہ دے گا تو ہماری جان اِن کپڑوں سے چھوٹے گی۔ دونوں صورتوں میں نقصان اُس شخص کا ہے۔ اور کوٹ ہمارے پاس دو ہو گئے۔ ایک تو آغا جعفری کا عطیہ۔ اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب کہ پہننے کو جی نہ چاہے۔ دوسرا حبیب اللہ شہاب کا جو شاید اُنہوں نے قطب شمالی کی مُہم کے لئے بنوایا تھا کیونکہ ہم نے اُسے پہنا تو بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ گئے۔ دو آدمیوں نے ہماری بانہوں میں ہاتھ دے کر ہمیں دوبارہ کھڑا کیا اور پھر اُسے پہن کر ہم بالکل برفانی ریچھ معلوم ہوتے تھے۔ بس رنگ کا فرق تھا کیونکہ برفانی ریچھ غالباً سفید ہوتا ہے۔ کُلاہ و دستانہ ہم سر پر نہیں رکھتے لیکن اِس خاص موقع کے لئے ایک فیلٹ خریدی۔ اُس کا اُلٹا سیدھا معلوم کیا۔ لومڑی کی کھال کے دستانے لیے۔ گلے میں کانگڑی ڈالنے کا بھی خیال تھا لیکن وہ کشمیر کی خاص چیز ہے۔ ہمارے کراچی میں نہیں ملتی۔

اس سارے ساز و سامان سے لیس ہو کر دمِ تحریر ہم پشاور میں پڑے ہیں یہ ڈین ہوٹل کا کمرہ ۴۷ ہے۔ آتش دان میں آگ دہک رہی ہے۔ جس طرح ہمارے گاؤں کے فتح دین درزی نے کراچی الف ڈین اینڈ سنز ٹیلرز اینڈ آؤٹ فٹرز کے نام

سے اپنی دُکان لگائی اور چمکائی ہے اِس سے ہم سمجھتے تھے کہ ڈین ہوٹل بھی کسی احمد دین یا نور دین کا ہو گا لیکن ہوٹل کا ناک نقشہ بتایا ہے کہ یہ واقعی کسی انگریز بہادر کی ملکیت رہا ہے۔ لان کشادہ۔ احاطہ کشادہ۔ کمرے کشادہ۔ ہر چیز کشادہ ہے سوائے مالکوں کے دِل کے کیونکہ ہمارے کمرے میں بجائے غالیچوں کے اُن کی کترنیں پڑی ہیں۔ ٹھنڈے کمرے کے فرش پر اِن پر پاؤں رکھتے ہوئے یُوں گزرنا پڑتا ہے جیسے کیچڑ میں پڑی ہوئی اینٹوں پر بچتے بچاتے قدم رکھتے ہوئے چلتے ہیں۔ لاؤنج کے قالین بھی گھسے پھٹے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ جدید ہوٹلوں کی سی نہ اِس میں شان ہے نہ آسائش۔ اپنی عُمر طبیعی میں سے کُچھ ہنس کر گزار چکا ہے اور کُچھ رو کر گزار رہا ہے۔ سیّد محمد جعفری نے جو مصرع پرانے کوٹ کی مدح میں لکھا تھا ہمیں اس ہوٹل کو دیکھ کر یاد آیا۔

ع کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ

باوجود فون کرنے کے کوئی دوست پشاور میں نہ مل سکا۔ پشاور والوں کی عالی حوصلگی سے ہم کما حقہ متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمیں پی آئی اے کے دفتر جانا تھا۔ کسی نے بتایا کہ انٹر نیشنل ہوٹل میں ہے۔ ہم نے اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا کر پوچھا کتنی دور ہے یہ جگہ ؟ تو کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ جناب بالکل ہمارے پچھواڑے ہے۔ بس کوئی ایک

فرلانگ ہو گی۔ آپ ہوٹل کے دروازے سے نکل کر بڑی سڑک پر آیئے اور بائیں ہاتھ کو چلیئے۔ بس سامنے ہی ہے۔

جب ہم اِس ہدایت کے مطابق کوئی پون میل کی مسافت طے کر چُکے تو ایک صاحب سے پوچھا۔ اُنہوں نے کہا۔ "پی آئی اے کا دفتر اجی وہ تو یہ رہا۔ آپ کو اِسی راستے پر ایک سینما ملے گا۔" اُس کے بعد پی آئی اے کا دفتر ہے اور واقعی اِس جگہ سے کوئی آدھ میل آگے ہمیں وہ دفتر مل گیا۔ یہ جگہ واقعی ڈین ہوٹل کے پچھواڑے میں ہے لیکن ایسا ہی ہے جیسے کراچی کے پچھواڑے میں کاٹھیاواڑ ہے اور لاہور کے پچھواڑے میں تبّت پڑتا ہے۔ انسان عالی حوصلہ ہو تو اُسے میل اور فرسنگ کے فاصلے فرلانگیں اور گز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا پشاور کی مزید سیر کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن اِس ایک مثال سے خائف ہو گئے کیونکہ ہم اُن بزرگ سے پوچھتے کہ درّہ خیبر کتنی دور ہے تو وہ یقیناً یہی فرماتے کہ بس دو منٹ کا راستہ ہے۔ سیدھے اِس سڑک پر چلے جایئے اگلے چوک پر داہنے ہاتھ کو درّہ خیبر ہی تو ہے۔

ہاں کابل میں گدھے ہوتے ہیں

ہم اور رمضان شریف قبلہ کابل میں ایک ہی روز وارد ہوئے۔ پاکستان اس لحاظ سے افغانستان کے مُقابلے میں پسماندہ ہے کہ یہاں ابھی ماہِ شعبان چل رہا تھا۔ پشاور سے ڈین ہوٹل کی میزبانی کالُطف اٹھاتے اور چلغوزے ٹھونگتے ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے لیکن پَون گھنٹے کابل کے خوبصورت ہوائی اڈّے پر اُترے تو پرچہ لگا کہ صاحبو۔ آج ہر طرف یکم رمضان کی تعطیل ہے۔ آپ کی باچھوں پر جو چلغوزوں کے چھلکے لگے ہیں اُنہوں اچھّی طرح صاف کرلیجئے۔

کابل میں ہم دونوں چیزوں کا رُعب دِل میں لے کر گئے تھے۔ ایک سردی کا دوسرے رمضان شریف کا۔ سردی کے ڈر سے ہم نے جو پوستینوں، دُہرے تہرے سویٹروں، مفلروں، طرح طرح کی ٹوپیوں اور کنٹوپوں دوستانوں اور قطبِ

شمالی والے اوور کوٹوں کا انتظام کیا تھا جاڑے میاں شاید اِس کا سن کر دُبک گئے اور کابل والوں سے کہا کہ یہ شخص یہاں سے جائے گا تو پھر تُم لوگوں سے سمجھوں گا۔ جتنے دِن ہم کابل میں رہے جاڑا بس ایسا ہی تھا جیسا پنڈی میں ہوتا ہے۔ پشاور میں تھا۔ بلکہ لاہور میں بھی۔ کوئٹہ سے اِک ذرا سردی کی لہر آجائے تو ایسا نقشہ تو کراچی میں بھی ہو جاتا ہے۔ دستانے، سوئٹر، مفلر اور کنٹوپ اور حبیب اللہ شہاب والا مہا اوور کوٹ دیکھ دیکھ کر ہم اتنے دنوں جھلّایا کئے۔ ایک روز بھی کڑاکے کی دندان شکن سردی پڑ جاتی تو اِن کا مصرف نکل آتا اور ہمیں گلِہ نہ رہتا۔

روزوں کے متعلّق اپنے افغان اور پٹھان بھائیوں کے متشدّد رویّے کا ذکر بھی ہم سُن چُکے تھے۔ بے شک ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے وہ روشن خیال اور مغربی قسم کا تھا۔ تاہم لوگوں نے بتا رکھا تھا کہ سُنا ہے وہاں تڑکے ہی مسافروں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر اُٹھا دیتے ہیں اور بہ نوکِ شمشیر روزہ رکھواتے ہیں۔ الحمد للہ کہ یہ اندیشے بھی باطل ثابت ہوئے۔ ہم نے کابل کے ریستورانوں اور بھٹیار خانوں کو اِسی طرح احترام کے پردے لٹکائے کاروبار کرتے دیکھا جیسا کراچی میں دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک آدھ بار روزہ رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ایک افغان دوست نے کہا کہ شوق سے رکھو ہم منع نہیں کرتے لیکن اتنا دیکھ لو کہ تُم سفر میں ہو اور سفر میں روزے کی

احتیاط رکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے جذبۂ ایمانی کو اتنی ڈھیل نہ دیتے تو ہماری روزہ کُشائی کی خبر کابل سے آتی۔



کابل میں دو ہی اچھّے ہوٹل ہیں۔ کابل اور سپین زر۔۔ سپین زر تو ابھی حال ہی بنا ہے

اور الٹرا ماڈرن گنا جاتا ہے۔ اگرچہ زیادہ بڑا نہیں۔ کابل پرانا ہے۔ وضعدارانہ، شریفانہ اور آرام دہ۔ باہر سے اُس کی سہ منزلہ عمارت بے رنگ سی ہے۔ لیکن اندر جائیے تو لاؤنج اور کمرے اور ساز و سامان سب نفیس۔ ہم کابل ہوٹل میں اُترے۔ کمرے کا بھاڑا ٹھہرایا۔ معلوم ہوا تین سو افغانی روزانہ دینے ہوں گے۔ دس فیصد سروس اِس پر مستزاد۔ ناشتہ اور کھانا اِس کے علاوہ۔ کسی چیز کے دام سینکڑوں میں سُنیں تو ہمیں اختلاج ہو جاتا ہے لیکن یہ معلوم کرکے سکون ہوا کہ ایک افغانی ہماری مرحومہ دونّی کے برابر ہوتا ہے۔ ہم نے سو روپے پاکستانی دیئے اور ہوٹل والے نے آٹھ سو افغانی ہمیں گن دیئے۔ حساب سے چالیس پینتالیس روپے کا کمرہ پڑا۔ جسے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر گلبرگ تو یہ دام سُن کر اُچھل ہی پڑے کیونکہ ڈالر کے حساب سے گنیں تو یہی افغانی ایک آنے کا پڑتا ہے اور تین سو افغانی کا مطلب ہوا چار ڈالر روزانہ۔ بات یہ ہے کہ افغانستان میں سِکّے کی بین الاقوامی قیمت مقرّر نہیں ہے۔ ہر بازار کا بھاؤ نکلتا ہے۔ ڈالر کے ستّر پچھتر افغانی مل جاتے ہیں اور روپے کے بہت دوڑ دھوپ سے شاید نو افغانی مل جاتے ہیں۔ بہر حال ہم کسی چیز کے دام سُن کر اُسے فوراً پاکستانی سِکّے میں ڈھالتے تو وہ خاصی مہنگی معلوم ہوتی۔ گلبرگ صاحب کی آنکھیں ارزانی دیکھ کر چمک اُٹھتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

ہم کابل جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے۔ کُچھ بھی نہ لا سکے اور ڈاکٹر گلبرگ وہاں سے لدے پھندے گئے۔

پشاور کے ہوائی اڈّے پر ہم نے اپنے ہم سفروں میں ایک اُدھیڑ عُمر کے بزرگ کو دیکھا کہ لمبی سُرخ داڑھی ہے اور سر پر بھی کنگھی سے بے نیاز بالوں کا جھاڑ کھڑا ہے۔ تھوڑا لنگڑاتے ہیں اور چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ پھول دار لے کر چلتے ہیں۔ پھول دار باسکٹ پہنے ہوئے تھے۔ یعنی اُن کی وضع قطع سج دھج سب سے الگ تھی۔ ہم پی آئی اے کے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ دِکھا رہے تھے کہ وہ مُسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پاس یہ SAS یعنی سکینڈے نیوین ائیر سروس کا ٹکٹ کہاں سے آ گیا۔ ہم نے بتایا کہ یونیسکو جس کی طرف سے ہم نے یہ سفر اختیار کیا ہے، اُس نے پیرس سے اس کا انتظام کیا تھا۔ بولے مُجھے یُوں جستجو ہوئی کہ میں ڈنمارک کا ہوں اور SAS میرے وطن کی کمپنی ہے۔ اِس پر بات چل نکلی۔ ہم نے اُنہیں بتایا کہ آپ کے وطن کی زیارت بھی ہم کر چُکے ہیں۔ کوپن ہیگن کے علاوہ السی نور بھی گئے تھے جہاں ہملٹ کا قلعہ ہے اور جہاں سے سمندر پار سویڈن نظر آتا ہے۔

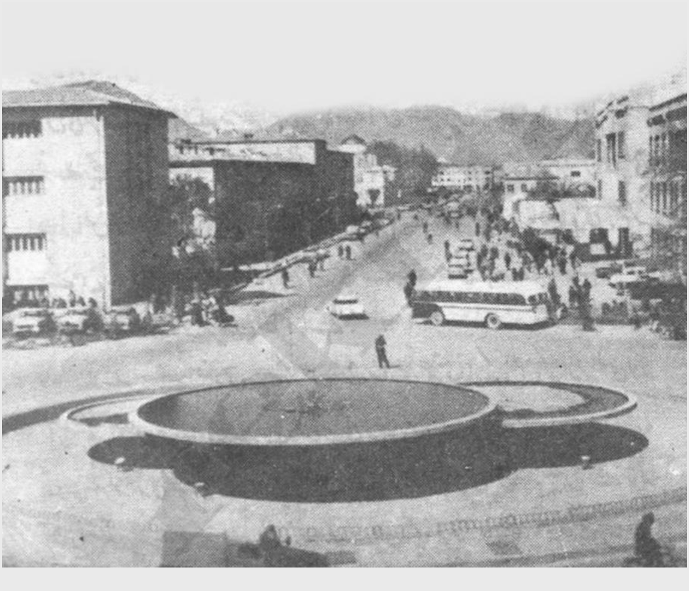
بولے: ”مُجھے افسوس ہے کہ میں نے ساری عمر ڈنمارک میں گزار کر السی نور آج

تک نہیں دیکھا۔" ہم نے یہ کہہ کر اُن کی ڈھارس بندھائی کہ ہم نے بھی کراچی میں آدھی عمر گزاری ہے لیکن منگھو پیر نہیں گئے۔ زیادہ تفصیل میں ہم نہیں گئے تاکہ ہمارا منگھو پیر اُن کے السی نور کے مُقابلے میں کچّا نہ پڑ جائے۔ یہ ڈاکٹر گلبرگ تھے۔

ڈاکٹر گلبرگ دوا دارو والے ڈاکٹر ہیں لیکن نسخوں کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے ہیں اور یہی ہماری دوستی کی وجہ ہوئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کی کتاب "اسکیموڈاکٹر" برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ کئی مُلکوں میں چھپ چُکی ہے۔ ہم نے ریڈرڈائجسٹ میں اُس کا ذکر یا خلاصہ پڑھا تھا اور کُچھ کچھ یاد تھا۔ یہ سُن کر وہ اور خوش ہوئے اور اپنی بی بی سے کہا۔ دیکھو یہ شخص کتنا پڑھا لکھا ہے۔ اُس نے عیدع ڈائجسٹ میں میری کتاب کا ذکر پڑھا ہے۔ فرانسیسیوں کی طرح "ر" کا تلفّظ وہ ہمیشہ "غ" ہی کرتے رہے۔

ڈاکٹر گلبرگ مُہم جو آدمی ہیں۔ برسوں وہ گرین لینڈ جا کر اسکیموں کے ساتھ رہے۔ اُن کی زبان اور معاشرت اختیار کی۔ انہی کا سا بے نمک کھانا کھاتے رہے ہیں۔ یہی مچھلی ریچھ کا گوشت وغیرہ۔ برف کے جھونپڑوں میں قیام کیا اور پھر یہ کتاب لکھی۔ اب میاں بی بی ایشیا اور مشرقِ بعید کے دورے پر نکلے تھے۔ کینیا، ہندوستان، تھائی لینڈ اور نیپال ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ اب کابُل اور تہران ہو کر وطن واپسی کا پروگرام تھا۔ ہندوستان سے یہ لوگ ایک شب ٹھہر کر بھاگے کیونکہ یہ

پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جن پتھ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اُس روز سادھوؤں اور غیر سادھوؤں کی طرف سے گئوکشی کے معاملے پر وہ خوف ناک مظاہرہ ہوا تھا جس میں جان و مال کا بے حد نقصان ہوا۔ مظاہرین نے مغربی ٹورسٹوں کو بھی جہاں وہ نظر آئے گھیر لیا اور کہا یہ لوگ بھی مسلمانوں سے کم نہیں۔ یہ بھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ بڑی مُشکل سے خشمگیں مجمع کے نرغے سے نکل کر ہوٹل واپس پُہنچے اور اُسی دِن نیپال روانہ ہو گئے۔



کابل کا چوک پختونستان

پاکستانیوں۔۔۔ خصوصاً پشاور والوں کے یہ بہت معترف تھے کہ بڑے تپاک اور خلوص سے ملتے ہیں۔ پی آئی اے کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے کہ اِس کے آدمی بہت خلیق اور متواضع ہیں۔ ہاں اپنے پشاور والے ہوٹل کے نام سے بے مزہ ہوتے تھے۔ کہتے تھے یہ نظر بٹو ہے تاکہ پاکستان کو نظر نہ لگ جائے۔ دیکھو کابُل ہوٹل میں یہ چار ڈالر روزانہ کا کتنا اچھّا کمرہ ہے۔ اِسے گرم رکھنے کا مرکزی نظام بھی ہے۔ قالین۔ فرنیچر۔ سروس بھی معقول۔ پشاور میں مَیں تین دِن رہا اور اِس باوا آدم کے زمانے کے کمرے کے تیرہ ڈالر روزانہ دیتا رہا۔ یہی نہیں، اُن لوگوں نے پانچ روپے روزانہ اُس لکڑی کے بھی مُجھ سے وصول کئے جو کمرہ گرم رکھنے یا اُس میں دھواں پھیلانے کے لئے روزانہ جلانی پڑتی تھی۔

جاتے ہوئے جِن لوگوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا کابُل میں گدھے نہیں ہوتے اُن کی اِطّلاع کے لئے گزارش ہے کہ ہوتے ہیں اور بہت ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا مطلب چار ٹانگوں والی بلا سینگ کی مخلوق سے ہے۔ دو ٹانگوں والے بھی یقیناً ہوں گے۔ ہم نے زیادہ جستجو نہیں کی۔ یہ گدھے وہ تھے جو زر نگار پارک کے سامنے قطار در قطار کھڑے تھے۔ اور اِن کے پالان سنگتروں سے بھرے تھے۔ یہاں سنگترے تُل کر بِکتے ہیں۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی سنگتروں پر مچل گئیں اور بولیں۔ اِن کا بھاؤ پوچھو۔ ہم

نے بھاؤ پوچھا۔ ”آغا چند است ؟“ ایران کی طرح یہاں بھی معلوم ہوا کہ فارسی بولنا آسان ہے سمجھنا مُشکل۔ آغا نے جو جواب دیا وہ ہمارے پلّے نہ پڑا حالانکہ ہم نے چہ؟ چہ؟؟ کر کے ایک بار وضاحت بھی چاہی۔ اِن غیر مُلکیوں کو یہ بتانا غیر ضروری تھا کہ یہ گدھے والا اِن الفاظ میں ادائے مطلب سے قاصر ہے جو ہماری سمجھ میں آ سکیں۔ لہٰذا ہم نے کہا چھوڑیئے مہنگا بہت دیتا ہے لیکن وہ خاتون تھوڑی دور ایک اور گدھے کے پاس چلی گئیں کہ یہاں سے لے لو۔ یہ سستا دے گا۔ ہم نے ایک باٹ کی طرف اشارہ کر کے سنگتروں والے سے کہا کہ آغا بس این قدر دے دو۔ اس نے تولا تو چار سنگترے پڑے۔ قیمت ہم نے نہ پوچھی کہ افہام و تفہیم میں دقّت نہ ہو۔ آخر باہم زبان سمجھنے کا معاملہ ہمارا اور ہمارے افغان بھائیوں کا ہے۔ ڈنمارک والوں کو اِس سے کیا مطلب۔ ہم نے دس افغانی کا نوٹ دیا۔ اُس نے چار افغانی کاٹ کر باقی ریز گاری ہمیں دے دی۔ ڈاکٹر گلبرگ اور اُن کی بی بی نے ہمارا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اِس دیارِ غیر میں جہاں ہماری زبان اور انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں تُم ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کیا کرتے۔ ہم نے موزوں الفاظ میں کسرِ نفسی کرنے کے بعد کہا کہ خیر انسان انسان کے کام آتا ہی ہے۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند وغیرہ۔

ریلوے۔۔۔۔ کون سی ریلوے؟

جس کام سے ہم کابل گئے تھے اُس کا تعلّق کتابوں سے تھا۔ ہم نے اپنے ایک افغانی دوست سے کہا کہ ہمیں کسی پبلشر سے ملوائیے۔

بولے۔ ”یہاں کوئی پبلشر نہیں۔“

”چھوٹا موٹا تو ہو گا؟“

”نہ چھوٹا نہ موٹا۔“

”پھر کُتب فروش کتابیں کہاں سے لیتے ہیں؟“

”کُتب فروش؟ کون سے کُتب فروش؟“ ہم نے کہا۔ ”بازار میں کتابوں بیچنے والوں سے مطلب ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشنوں پر بھی بُک اسٹال ہوتے ہیں۔

کابُل قندھار وغیرہ میں ہوں گے ہی جہاں سے مسافر سفر میں دِل بہلانے کے لئے ناول، رسالے، جنتریاں وغیرہ خریدتے ہیں۔ ہمارے دوست نے کسی قدر جھلّاہٹ سے کہا۔

"میاں ہوش کی دوا کرو۔ کون سے ریلوے اسٹیشن اور کیسی ریلوے۔ تمہیں معلوم ہے افغانستان میں ریلوے نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ شیطانی چرخہ تمہیں کو مبارک ہو۔"

تب ہمیں افغانستان کے متعلّق وہ مضمون یاد آیا جو ہم نے کابل جانے سے پہلے پڑھا تھا۔ لکھا تھا کہ "اِدھر آپ نے درّہ خیبر کے پار افغانستان کی نئی سرزمین میں قدم رکھا اور ایک صدی پیچھے پہنچ گئے۔"

لیکن کبھی کبھی مسافر کے ساتھ ابّوالحسن سوتے جاگتے کا قصّہ بھی ہو جاتا ہے۔ اگر آپ پرانے شہر کے محلہ شور بازار میں کسی کی آنکھیں بند کئے اور کابل یونیورسٹی لائبریری میں جا کر کھولئے تو گرم سرد یا شادی مرگ قسم کی واردات ہونے کا خطرہ ہے۔ ہماری تو آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ ایسی الٹرا ماڈرن لائبریری، جدید ترین سازوسامان سے لیس۔ ہم نے اپنے مُلک میں تو دیکھی نہیں اور بھی کم ہی مُلکوں میں

ہو گی۔ نقشہ اس کا امریکہ کی دعوت پر ایک جاپانی ماہرِ تعمیرات نے بنایا اور باقی ہر چیز میزیں، کُرسیاں، الماریاں، حتّٰی کپ کیل قبضے تک امریکہ سے آئے۔ کتابوں میں بھی امریکہ کا مال بھرا دیکھا۔ اگرچہ چند الماریاں روسی کتابوں کی بھی دکھائی دیں۔

پبلشروں کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ افغانستان میں اِس نام کی کوئی مخلوق نہیں۔ حکومت کے محکمے اور ادارے سرکاری مطبعوں میں کتابیں چھاپتے ہیں۔ اِن کی بھی مکمّل تعداد پورے مُلک میں پانچ ہے۔ پرائیویٹ پریس کوئی نہیں ہے۔ اوّل تو اِن حالات میں کوئی شخص کُچھ لکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا۔ اگر کوئی مرزا غالبؔ یا فیض احمد فیضؔ پیدا ہو بھی جائے تو از راہِ قانون اُسے حکومت کو عرضی دینی چاہئے کہ بندے کی یہ تالیفِ لطیف زیورِ طبع سے آراستہ کی جائے۔ وہ ٹھوک بجا کر (کسی کام میں جلدی نہیں کی جاتی) دیکھیں گے کہ ہاں کوئی مضائقہ نہیں تو حکم ملے گا کہ اچھّا چھاپے دیتے ہیں۔ کاغذ کتابت طباعت کے پیسے لاؤ اور جب چھپ جائے تو جہاں جی چاہے جیسے جی چاہے بیچو۔

مانگ کا حال یہ ہے کہ کُچھ کتابیں شائقین خرید لے جاتے ہیں۔ کُچھ بنیا لے جاتا ہے اور اُس میں چلغوزے وغیرہ ڈال کر بیچتا ہے۔ ہمارے اِنہی دوست نے فرمایا کہ تُم جو کُچھ بھی کہو اِس نظام میں مصلحت یہ ہے کہ لوگ بیہودہ شاعری اور رنگیلے ناولوں

وغیرہ سے محفوظ رہتے ہیں۔

ریلوے کی کہانی معلوم ہوئی کہ شاہ امان اللہ خان اپنے زمانے میں دار الامان نام کی تازہ بستی بسائی تھی۔ وہاں تک ریلوے لائن۔۔۔ ریلوے نہ کہئے ٹرالی لائن بچھائی تھی۔ بچّہ سقّہ نے اُن کا تاج و تخت چھینا تو پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرنگیوں کی بدعت قرار دے کر اُکھاڑ پھینکا۔ ہم نے دار الامان میں اِس کے اُکھڑے ہونے زنگ خوردہ سلیپر اور دو تین ٹوٹی پھوٹی بوگیاں آثارِ صنادید کے طور پر ایک جھونپڑے کے سامنے کھڑی پائیں جو ایک زمانے میں ریلوے اسٹیشن تھا۔ اِس وقت بھی ریلوے لائن کا فوری طور پر کوئی منصوبہ نہیں کیونکہ سڑکوں کے ذریعے آمد و رفت کو بہتر بنانا آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی۔ دوسرے ممالک اِس میں بڑی مدد دے رہے ہیں۔ کُچھ سڑکیں روس نے بنائی اور کُچھ اُن کی ضِد میں آکر امریکہ نے بنا دیں۔ روس نے کوہ ہندوکش میں دو میل لمبی سُرنگ لگا کر کھود کر یا بنا کر افغانستان میں تجارتی مال کی نقل و حرکت میں غیر معمولی آسانی پیدا کر دی ہے۔ بڑی طاقتوں کے دِلوں میں افغانستان کا درد ایسا جاگا ہے یا پھر اِسے کُچھ اور نام دے دیجئے کہ روس اور امریکہ کے علاوہ جو امداد دینے کے معاملے میں اوّل اور دوم ہیں۔ مغربی جرمنی، فرانس اور برطانیہ بھی دامے درمے قدمے سخنے افغانستان کی خدمت کو عین

سعادت سمجھتے ہیں اور برطانیہ جو امداد دینے میں پانچویں نمبر پر ہے دو کارخانے شکر کے اور ایک کارخانہ سرسوں کا تیل نکالنے کا قائم کر رہا ہے۔ کیوں نہ کرے۔ اُس نے کڑوا پھیکا ہو کر دیکھ لیا۔ جنگیں بھی لڑیں لیکن کُچھ فائدہ نہ ہوا۔ جب دیکھا کہ اِن تِلوں میں تیل نہیں یعنی افغانستان والے سلطنتِ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں آنے سے انکاری ہیں تو سرسوں کا تیل نکالنے کے کارخانے کی پیش کش کر دی اور کڑوے کسیلے پن کی تلافی کے لئے دو فیکٹریاں شکر کی بھی لاڈالیں۔

کُتب فروشوں کے متعلّق یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ سِرے سے ناپید ہیں۔ ہم نے شہرِ نو کے علاقے میں دو تین کیبن نُما دُکانیں دیکھیں جن میں پرائمری اور مڈل کلاسوں کے لئے حکومت کی شائع کردہ چند درسی کتابوں کے علاوہ کُچھ ایران کی پیپر بیک کتابیں، کُچھ امریکہ کے سستے ایڈیشن اور شمع دہلی کے پرچے نظر آئے۔ ایک دو جگہ فُٹ پاتھوں پر پرانے امریکی ناول اور رسالے دکھائی دیئے جو کابل میں رہنے والے کسی گورے نے ردّی میں بیچے ہوں گے۔ پھر دریائے کابل کی دیواروں کی منڈیر پر بھی لوگوں کو دس دس بیس بیس کتابیں رکھے بیچتے دیکھا، ان میں بھی زیادہ تر الف بے کا قاعدہ اور حساب وغیرہ کی درسی کتابیں تھیں۔ ہاں ایک دُکان وزارتِ تعلیم کے دفتر کے نیچے ضرور سرکار نے حال ہی میں کھولی ہے جس میں قاری کے علاوہ کُچھ

روسی اور انگریزی کتابیں بھی دِکھائی دیں یا پھر ایک دُکان فرنیکلن والوں نے با اجازتِ سرکار قائم کی ہے۔ اس میں زیادہ تر درسی مواد ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مُلک میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہیں۔ پہلا مدرسہ پہلی جنگِ عظیم کے لگ بھگ امیر حبیب اللہ نے قائم کیا جس کا نام توحبیبیہ کالج تھا لیکن مولوی محمد علی قصوری وغیرہ نے جو وہاں پڑھاتے رہے ہیں لکھا ہے کہ اِس کی حیثیت مِڈل اسکول سے زیادہ نہ تھی۔ نصاب نہایت ناقص۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید اور اُس کا ترجمہ نصاب میں شامل کرنا چاہا تو مفتیٔ شہر نے سخت اعتراض کیا کہ طالبِ علم وہابی ہو جائیں گے اور آخر دم تک مخالفت جاری رکھی۔ مولانا سلیمان ندوی ۱۹۳۳ء میں بہ معیت علامہ اقبال مرحوم اور سر راس مسعود کابل گئے تو اِن کو مدرسے دیکھنے کا بھی شوق ہوا۔ سخت مایوس ہوئے۔ ایک مُلّا دوراز کار غَلَط کتاب پڑھا رہا تھا اور غَلَط مسئلے بیان کر رہا تھا۔ مولوی صاحب چُپکے سے سٹک آئے۔ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے اور بعد بے شمار پاکستانی اور ہندوستانی مسلمان اِن مکاتب میں جا کر پڑھاتے رہے ہیں کیونکہ افغانی ٹیچر کہیں نہیں ملتے تھے۔ بعضے اِن میں زمانے کی سیاست کا شکار ہوئے۔ آخر میں مُلک بدر ہوئے۔ بعضے جان سے بھی گئے۔ مغربی طرز کے مدرسے میں فرانسیسی اور جرمن مدرس بھی تھے مگر بہت سے افغان

نوجوان یورپ کے مختلف مُلکوں سے بھی تعلیم حاصل کر کے آئے۔ اب افغانستان میں دو طرح کے آدمی ملتے ہیں۔ یا تو بالکل اَن پڑھ یا کولمبیا یونیورسٹی کے گریجویٹ۔ خواندگی کا تناسب پانچ فیصدی کے قریب ہے اور اسکول اب بھی بہت کم ہیں۔ اتنا ہے کہ تعلیم نیچے سے اوپر تک یعنی یونیورسٹی تک بالکل مُفت ہے۔ حتّٰی کہ کتابوں کا خرچ بھی سرکار دیتی ہے۔

دریائے کابل جو شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے ہمارے ہوٹل سے کُچھ دور نہ تھا۔ دریا لفظ کے استعمال کے لئے ہم دریائے ستلج اور سندھ، دریائے گنگا اور جمنا، دریائے ہوانگ ہو اور ینگسی وغیرہ سے تہ دِل سے معذرت خواہ ہیں۔ کراچی والے دریائے کابل کی وُسعت کا اندازہ کرنا چاہیں تو اُس گندے نالے کو دیکھ لیں جو نہ جانے کہاں سے آتا ہے اور کہاں سے جاتا ہے لیکن وومن کالج کے پاس سے گُزرتا ہے۔ فرق اُس نالے اور دریائے کابل میں یہ ہے کہ اُس نالے کا پانی نسبتاً صاف ہے اور اُس میں اتنی زیادہ بُو نہیں آتی۔ پانی کی مقدار بھی آج کل تو اُسی نالے میں زیادہ ہے۔ ہاں گرمیوں میں سُنا ہے برف پگھلتی ہے تو دریائے کابل کی ناطاقتی کُچھ دور ہو جاتی ہے۔ دیوار پر سے نیچے جھانکیں تو دریا کی غریب نوازی کا نقشہ نظر آتا ہے کہ یہاں ایک بُڑھیا کپڑے دھو رہی ہے۔ دس قدم پرے اُس میں سے چلو بھر پانی بھر کر کوئی آب دست بھی

کر رہا ہے۔ تھوڑا آگے اس میں بچّے نہا بھی رہے ہیں اور آس پاس کے گھر والوں کو بھی کوڑا پھینکنے کا بڑا آرام ہے۔ ٹوکری دریا میں جھاڑ دی۔ یہی دریا پیاسوں کی تشنگی بھی رفع کرتا ہے کیونکہ نئے حصّۂ شہر کو چھوڑ کر پرانے شہر میں گھروں تک پانی کے پائپ لے جانے کا کوئی سِلسِلہ نہیں۔ ہتھّی والے اور کہیں کہیں دوسرے نلکے البتّہ ہیں جن سے محلّے والے اپنی باری سے مٹّی کے مٹکے اور جھجھریں بھر لے جاتے ہیں۔ اِن مٹکوں کی وضع قطع کے ظرف ہم نے یا تو عجائب گھروں میں دیکھے یا پھر رباعیاتِ عُمر خیام کی بعض تصویروں میں۔ صراحی آپ نے دیکھی ہے۔ اِن سے ذرا بڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُنہیں صراحا کہہ لیجئے۔ ایک طرف کو پکڑنے کے لیے دستہ بھی لگا دیجئے بے شک۔

اب حکومت پانی پائپوں کے ذریعے گھروں تک پہنچانے کا بندوبست کر رہی ہے لیکن فی الحال تو شہر میں سقوں کا راج ہے۔ ایک سقّہ تو کُچھ دِنوں تک مُلک کا بادشاہ بھی رہا ہے لیکن وہ الگ کہانی ہے۔


کھڑک سنگھ و پسران
+ ایں جا کپڑا سستا است

ست سری اکال

افغانستان سے آ کر کشمش، میوے، سلاجیت اور ہینگ بیچنے والے آغا ہوتے تو دکاندار ہی ہیں لیکن ڈیل کارنیگی کی کتابیں ذرا کم پڑھے ہوتے ہیں لہٰذا کاروبار کرتے وقت بھی اپنی خودی کو بُلند رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک کابلی آغا نے ہمارے ایک میر صاحب کو کاندھے سے جھٹک کر کہا۔۔۔۔ ”خو، ہینگ خرید و ہینگ۔“ میر صاحب لکھنو کے تھے۔ نہایت شائستگی سے بولے ”قبلہ آغا صاحب! اِس ہیچمدان کو ہینگ درکار نہیں۔“ آغا موصوف نے لال پیلے ہو کر ایک جھٹکا اور دیا اور فرمایا۔ ”خُو۔۔۔ کاپر کا بچّہ۔ کیسے نہیں خریدے گا۔ ہم کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہے جو اتنی دور سے اُٹھا کے لایا ہے۔ نکالو پیسے۔“

ایک شاعر نے اِس مضمون کو شعر میں بھی باندھا ہے۔

واسطے تیرے بچّہ کافر

ہینگ غزنی سے جاکے لایا ہے

کابل کے بازاروں میں خریدنے والا بھی آغا ہوتا ہے، بیچنے والا بھی۔ البتّہ آغا کی دکانداری دوڑ پھل، میوے، پرانے کوٹوں اور غالیچوں تک ہے۔ کبابی اور نانبائی، موچی اور دُھنیا بھی بے شک افغان ہی ہے لیکن ہم جو ہوٹل سے نکل کر بازار کی طرف آئے اور کپڑے کی دُکان میں جھانکا تو دو سردار جی بیٹھے نظر آئے۔ ہانک لگائی۔ ''آؤ میاں جی کی چاہی دا اے۔'' جلدی سے آگے بڑھے تو دوسری دُکان میں بھی سِکھ۔۔۔ تیسری میں بھی۔۔۔ چوک زر نگار سے مسجد پُل خشتی تک۔ مسجد پُل خشتی سے جادۂ یسوند کے دورویّہ اور اِدھر پارک کی طرف آتے ہیں۔ اِس چوک تک جس کا نام ہم لینا نہیں چاہتے (آپ سے کیا پردہ۔۔ اس کا نام چوک پختونستان ہے) دورویّہ خالصہ دربار کا نقشہ دیکھا۔۔۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر ہم گلیوں میں گھُس گئے۔۔۔ وہاں بھی سردار جی شُدہ فارسی بولتے نظر آئے۔ ہم نے ساری عُمر میں اِتنے سِکھ نہیں دیکھے جتنے اب کے کابل میں دیکھ لئے۔ سِکھ ایران میں بھی ہیں۔

تہران میں ہم نے اِن کی دُکانیں دیکھیں اور زاہدان کی توجۂ تسمیہ ہی سکھ ہیں۔ یہ لوگ کوئٹہ اور زاہدان ریلوے وغیرہ کی ٹھیکیداری اور مزدوری کے سِلسِلے میں اُدھر گئے تھے۔۔۔۔ پھر وہیں رس بس گئے۔ اِس بستی کا نام پہلے دُزد آب تھا۔ سادہ لوح ایرانیوں کو یہ بڑی بڑی داڑھیوں والوں کی ریل پیل نظر آئی۔۔۔ تو اُنہوں نے اِن کو خاصانِ خُدا اور زاہدانِ شب بیدار کی صف میں شمار کر کے پوری بستی کو زاہدان کہنا شروع کر دیا۔

پھر ایک دِن یُوں ہوا کہ ہم کابل کے ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے تھے کہ ایک بزرگ سفید ریش دو تین خالصہ حضرات کے جلو میں آہستہ قدم اُٹھاتے وارد ہوئے۔ ہم نے غور سے دیکھا اور اُن کو پہچاننے کی کوشش کی۔ آخر جب وہ ہمارے سامنے کی میز پر آن کر بیٹھ گئے اور ہمارے ایک پاکستانی صحافی دوست (م۔ش) نے لپک کر اُن سے علیک سلیک یعنی ست سری اکال وغیرہ کی تب ہم پر کھلا کہ ماسٹر تارا سنگھ جی ہیں۔ ہم نے بھی اُن سے دُعا سلام کی اور خیریت پوچھی۔ لیکن ہم حیران تھے کہ یہ یہاں کہاں۔ اِن کے ساتھ جو سردار جی تھے اُن سے پوچھا کہ ماسٹر جی کا ارادہ کِدھر کا ہے۔ وہ گول کر گئے کہ پتہ نہیں۔ اصل میں وہ ہمیں ہندوستانی سمجھے۔ جب ہم نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں تو بولے۔ پھر ٹھیک ہے۔ بات یہ ہے کہ ماسٹر جی بالکل

چُپ چپاتے آتے ہیں۔ کسی کو خبر نہیں دی۔ اِسی میں مصلحت ہے۔

ماسٹر جی آ کر بیٹھے ہی تھے کہ سِکھوں کا تانتا بندھ گیا۔ کابل کے سکھ شلوار پہنتے ہیں اور اکثر کھیس کی بُکل مارتے ہیں۔ اُن کی پگڑیاں بھی ڈھیلے ڈھالے پگّڑ ہوتے ہیں بلکہ اُنہیں منڈاسا کہنا چاہیے۔ وہ جو نئی نسل کے سِکھ ٹیڈی کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ منڈاسے اُن کے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے کابل ہوٹل کا وسیع لاؤنج دربار صاحب امر تسر بن گیا۔ ہم کسی سِکھ سے یُوں بھی بات کرنا چاہتے تھے۔ اُن میں سے ایک بزرگ سے کہا کہ سردار کی آپ لوگ کب سے یہاں ہیں۔ بولے کئی پُشتوں سے ہیں۔ بلکہ صدیوں سے۔ ایک نے اُن میں سے آگے بڑھ کر کہا جی ہم پٹھان ہیں۔ ہم نے کہا آپ لوگ پُشت ہاپُشت یہاں رہ کر بھی اِتنی فصیح اور بامحاورہ اور دریائے بیاس میں دُھلی ہوئی پنجابی کیسے بولتے ہیں۔ بولے ”واہ جی! یہ ہماری مادری زبان جو ٹھہری۔ ہمارے بچّے گھروں میں پنجابی ہی تو بولتے ہیں۔ فارسی اور پشتو تو بڑے ہو کر دُکانداری کے لئے سیکھتے ہیں۔“ ہم نے پوچھا: ”آپ کی تعداد کیا ہو گی۔“ ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہوئے بولے: ”واہگورو جی کی کرپا سے کوئی دس ہزار جی ہوں گے۔“

معلوم ہوا کہ دس بارہ گوردوارے بھی ہیں۔۔۔۔ جلال آباد میں بھی اِن کی آبادی

بہت ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی کُچھ نہ کُچھ ہو گا۔ کابل میں ہندو بھی ہیں لیکن سِکھوں سے کم۔ ایک آدھ جگہ کسی مہاجن کی دُکان نظر آئی۔ "ارجن داس و پسران"۔

کابل ایشیا میں ہے۔ اس لئے بھاؤ تاؤ یہاں بھی خریداری کا لازمی جزو ہے۔ ایک آدھ جگہ ہم نے خریداری میں ڈاکٹر گلبرگ اور اُن کی بی بی کی رہنمائی کی اور ترجمانی کی۔ دُکاندار نے ہمیشہ یہی کہا کہ تمہارے دوست ہیں لہٰذا ہم اِن کو مال بارعایت دیتے ہیں۔ بے شک وہ کم بھی دیتے تھے۔ چیزوں کا حال ہم لکھ چُکے کہ سستی ہیں۔ لیکن ٹورسٹوں والی چوٹ ایک روز کھا ہی گئے۔ ہم کھانے کی میز بیٹھے تھے کہ میاں بیوی جوش سے تمتماتے آئے اور کہا دیکھو ہم کیسی نادر چیز میں لائے ہیں۔ بس قسمت سے مل گئیں۔ ہم نے کہا دکھاؤ تو۔۔۔ تب اُن کی بی بی نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دو ٹوٹے ہوئے تانبے کے بادیے نکالے۔ کہا دیکھو کتنی قیمت کے ہوں گے۔ ہم نے پوچھا آپ لوگوں نے کتنی قیمت دی۔ معلوم ہوا اٹھارہ ڈالر نقد۔ ہم چُپ ہو رہے لیکن وہ برابر داد حاصل کرنے پر مُصر تھے۔ بولے تُم اِن کی قیمت بتاؤ۔ یہ دیکھو اِس پر یہ پرانی فارسی تحریر بھی ہے۔ اِس کا ترجمہ بھی ہمیں مطلوب ہے۔ ہم نے کہا بہر حال آپ لوگوں نے اِسے نشانی کے طور پر خریدا ہے۔ اب اِس کی قیمت سے کیا

مطلب۔ اِسے جا کر گھر میں سجائیے۔ بہت معمولی بادیے تھے۔ دو ڈھائی روپے اِن کی قیمت اُس وقت ہو گی جب بالکل نئے تھے۔ ہندوستان کا بنا ہوا مال تھا۔ نہایت بھدّے لفظوں میں ایک پر لکھا تھا۔

"جناب پیالہ حاضر ہے۔"

دوسرے پر بھی ذرا مختلف عبادت تھی۔ "جناب جام حاضر ہے۔ مراد آباد۔"

جب ہم نے بتایا کہ ہمارے نزدیک اِن کی کیا قیمت ہو گی اور یہ کہ عبادت اُردُو میں ہے اور شہر کا نام بھی ہے مراد آباد، جو ہندوستان میں واقع ہے تو بے چاروں کے چہرے لٹک گئے۔ بولے ہمیں تو خاص افغانی چیز کہہ کت دیا تھا۔ ہمارے ساتھ چلو۔ واپس کریں۔ ہم گئے۔ خاصی دور دُکان تھی لیکن افسوس وہ دِن جمعرات کا دِن تھا۔ دُکان بند ہو گئی اور ہفتے کے روز کھُلتی تھی اور اِن بے چاروں کا جہاز جمعے کو جانا تھا۔ اٹھارہ آنے کے پیالے کے اٹھارہ ڈالر دیے۔ اگلی پچھلی کفایت کی سب کسر نکل گئی۔ ہم نے دِلاسا دیا کہ خیر سردار گلبرگ سنگھ جی ڈنمارک میں کسے معلوم ہو گا کہ اُردُو ہے یا فارسی ہے اور مُراد آباد افغانستان میں ہے یا بھارت میں۔

ٹورسٹوں کے ساتھ دوسرے ملکوں میں جو کُچھ ہوتا ہے اِس کے مُقابلے میں تو یہ کچھ

بھی نہیں۔ مشہور بات ہے کہ دِلّی میں کسی دُکاندار نے ایک امریکن کے ہاتھ ایک کھوپڑی بیچی تھی کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ہے۔ اس نے کھوپڑی پچاس ڈالر میں خوشی خوشی لے لی۔ چند دن بعد وہ امریکن پھر اس دکان پر گیا تو دُکاندار نے پھر ایک اور نسبتاً چھوٹی کھوپڑی اُسے تھما دی اور اُسے بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ سے منسوب کیا۔ امریکن بہت جھلّایا کہ رنجیت سنگھ کی کھوپڑی تو میں ابھی پرسوں پیر کے روز لے کر گیا ہوں۔ دُکاندار نے کہا۔

”جناب یہ اُن کے بچپن کے دِنوں کی ہے“



یہ ہیں گلبرگ صاحب

آغا گپ بر نیند

۱۹۶۴ء میں ایرانی فارسی ہماری رطب اللّسانی کی گرفت میں آئی ہی تھی کہ ہمیں تہران سے لوٹنا پڑا۔ کابل جانے سے پہلے ہم نے کراچی میں اس تیغِ اصیل کو صیقل کیا اور افغانستان پہنچتے ہی کابلی آغاؤں پر اِس کے وار کرنے شروع کئے۔ لیکن افسوس ہمارے سارے محاورے اور روز مرے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہم جس مُلک میں جاتے ہیں وہاں سے گڑیا یا گڑیائیں ضرور لاتے ہیں۔ تہران میں ایک دکان پر ہم نے اپنی کتابی فارسی مین پوچھا کہ:

”آغا لعبت می خواہم“

دُکاندار نے جواب دیا۔ ”لعبت، لعبت چہ؟“ یعنی لعبت کیا شے ہوتی ہے؟

ہم نے گڑیا کی طرف اشارہ کیا تو بولا۔ ”اخّاہ عروسک می خواہی۔ ایں است۔“

مطلب یہ کہ سیدھے سیدھے عروسک کیوں نہیں کہتے۔

ہم عروسک کے لفظ کو پلّے باندھ رکھا تھا۔ کابل میں ایک جنزل اسٹور پر جو تمباکو، کپڑا، میوے، بائیسکل، گُر اور ریزر بلیڈ بیچتا تھا۔ ہم نے اپنی حاجت بیان کی کہ آغا ”عروسکے می خواہم۔“

بولا: ”عروسک؟ چہ عروسک؟“ یعنی وہ کس کھیت کی مولی ہوتی ہے۔ مثالیں دے کر واضح کرو۔

ہم نے اُنگلی سے اشارہ کیا تو بولا۔ ”این گُڈّی است۔“ یعنی اِسے گُڈّی کہتے ہیں۔ ایک جگہ ہمیں ایک ٹوکری پسند آئی۔ ٹوکری کے لئے ہماری گرہ میں فقط سبدِ گُل کا لفظ تھا لیکن وہ ہمیں کُچھ زیادہ ہی شاعرانہ نظر آیا۔ بس ہم نے اسٹور والے سے کہا۔

”آغا۔ ایں چیست۔“

بولا۔ ”ایں توکری است۔“

لہٰذا ابعد ازاں اگر کوئی شخص کہتا۔ ”ایں سرک خیلے خراب است“ تو ہم جان جاتے

کہ اشارہ سڑک کی طرف ہے۔ ''من بہ دانہ مندی می روم'' مندی کا مطلب منڈی ہے۔ درد مندی وغیرہ سے اِس کا کوئی تعلّق نہیں۔ ہم ہوٹل میں ''صُبحانہ'' مانگتے رہے، کسی نے نہ دیا۔ آخر سیدھے سیدھے ناشتہ کہا تو بیرا فوراًباورچی خانے کی طرف بھاگا۔ بوٹ پاش کرانے کے لئے ہم نے بہتیرا کہا کہ آغا واکس بزیند۔ لیکن کسی نے تعمیلِ حکم نہ کی۔ آخر ہم نے کہا ''بوت پالش می خواہم'' تو فوراًپالش اور بُرش بھی نکل آئے اور کرنے والے کے دانت بھی۔ کابل واپس آنے کے بعد ہم جو اِس قسم کے اشتہارات دیکھتے ہیں کہ ''مٹّی کے یک صد چھکڑا جات برائے بھروائی گڑھا جات، سڑک ہائے ضلع شیخوپورہ مطلوب ہیں'' تو ہمیں مُطلق ہنسی نہیں آئی۔ نہ ہمیں برما شیل کے رسالہ ''پیامِ تیل'' کا نام عجیب لگتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنے ایک میزبان کو یہ کہتے سُنا کہ ''ایں موتر خیلے تیل می خورد'' یعنی یہ موٹر بہت تیل کھاتی ہے۔

کابلیوں کو اپنی زبان پر فخر ہے۔ اِسے وہ انگریزی میں بھی کبھی پرشین نہیں لکھتے Farsi ہی کہتے ہیں اور اِس کا رشتہ درّی سے ملاتے ہیں۔ جبکہ ایرانی فارسی کا رشتہ پہلوی سے ہے۔ یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ فارسی کے اساتذہ کا کلام کابلی قاری کے روزمرّے میں ہے اور افغانستان نے فردوسی اور سنائی پیدا کئے ہیں۔ ہرات، غزنی، اور بلخ جو ہمارے بزرگوں کی تاریخ کے مراکز رہے ہیں افغانستان ہی میں تو ہیں۔

ایک آدھ بار ہمیں مقامی محاورے نے بُرا ماننے کا بھی موقع دیا۔ ایک محفل میں ایک نہایت سنجیدہ مسئلے پر ہم نے اظہارِ خیال کی اجازت چاہی تو صاحبِ صدر بولے۔

”بلّے بلّے گپ بزیند۔۔۔ یعنی ہاں ہاں گپ مارو۔“ ہم بہت جُز بُز ہوئے۔ بعد میں



معلوم ہوا کہ اِس کا مطلب "ارشاد فرمایئے" بھی ہو سکتا ہے۔ اِس میں کوئی پہلو توہین یا استخفاف کا نہیں ہے۔ اگر کوئی واعظ نغز گو وخوش گُفتار بھی سرِ منبر دریائے فصاحت کی جولانی دِکھائے گا اور رشد و ہدایت کے موتی لُٹائے گا تو لوگ از راہِ تحسین ہی کہیں گے کہ "خوب گپ می زند" مطلب اِس کا صرف یہ ہو گا کہ اچھّی باتیں کرتا ہے۔

جاتے ہوئے گھر والوں نے یہی تاکید کی تھی کہ کابل جارہے ہو تو اپنی خیریت کی اِطّلاع ضرور واپسی ڈاک سے بھیجنا۔ لہٰذا ہم نے جاتے ہی کاغذ لفافے اور ٹکٹ تلاش کرنے شروع کئے۔ ہمارے پاس کابل کا نقشہ ضرور تھا لیکن اُس میں جہاں ڈاک خانہ لکھا ہوتا، وہاں تلاش کرنے پر یا تو سبزی کی دُکان ملتی یا تنور۔ گلبرگ صاحب اور اُن کی بی بی نے بڑے شوق سے کابل کی تصویریں اور اونٹوں کی قطاروں اور کھجوروں والے تہنیتی کارڈ جمع کئے تھے۔ وہ بھی ٹکٹوں اور ڈاک خانے کی تلاش میں سارا شہر گھوم گئے۔ درِ مقصود ہاتھ نہ آیا اور اپنے بچّوں کے لئے یہ تحفے وہ دستی لے گئے۔ یہ بات نہیں کہ وہاں ڈاک خانہ ہے نہیں۔ نہ ہوتا تو وہاں سے خط کیسے آتے۔ ہمارے پاس تلاش کے لئے زیادہ وقت نہ تھا۔ ایک ہفتہ ہی تو تھا۔

ٹکٹ نہیں ملا نہ سہی۔ کاغذ لفافے ہمیں مل گئے تھے اور اِس کے لئے ہمیں قصاب

کی دُکان پر نہ جانا پڑا۔ ظفر حسین ایبک نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ جب ہم پہلی جنگِ عظیم کے اواخر میں افغانستان گئے (ذکر شہر جلال آباد کا ہے) تو معلوم ہوا کہ یہاں قلم دوات پنسل وغیرہ بیچنے کی کوئی دُکان نہیں۔ کاغذ البتّہ قصاب کی دُکان پر ملتے ہیں۔ اِن صاحب نے یہ ذکر نہیں کیا کہ اُن دِنوں گوشت کہاں سے ملتا تھا۔ غالباً درزی کی دُکان پر جاتے ہوں گے۔

متفرقاتِ کابل

ہم کابل گئے لیکن غلَط وقت۔ وہاں کُچھ اور وقت ہے۔ شگفتن گل ہائے ناز کا۔ اپریل کے مہینہ میں گُل بوٹے جاگ اُٹھتے ہیں۔ اور اگر غالبؔ کے معنوں میں نہ لیا جائے تو در و دیوار پر سبزہ اُگ آتا ہے۔ برگ درختانِ سبز اور اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیراہنوں والے پھول۔ یہ ہے وہ بہار جس پر بابر بادشاہ لہلوٹ ہوا تھا اور وصیّت کر گیا تھا کہ میری موت کہیں بھی ہو میری آخری آرام گاہ کابل ہی میں بنی چاہیئے۔ ہم سے ہمارے میزبانوں اور دوستوں نے اہلاً و سہلاً تو کہا لیکن یہ بھی کہا کہ میاں کیوں دسمبر میں آ گئے۔ وہ بھی رمضان شریف کے دِنوں میں۔ اپریل میں آؤ اور پغمان دیکھو۔ پغمان تو خیر دور کی بات ہے۔ اِن دِنوں تو تمہارا یہ زرنگار پارک بھی پھولے نہیں سماتا۔

زر نگار پارک ہمارے ہوٹل کے بالکل پہلو میں تھا۔ بس سڑک درمیان میں تھی۔ اُس وقت تو اُس کا ایک پتّہ بھی سبز نہ تھا۔ سردی سے ساری گھاس جھلسی ہوئی اور روشیں زرد۔ سہارے درخت ٹُنڈ مُنڈ اور سارے خیاباں ویران۔ باہر کا باغ شہرِ نو پارک، چمنِ حضوری۔۔ جہاں جہاں ہمارا شوقِ گلگشت ہمیں لے گیا یہی کیفیت تھی۔ خاک اُڑتی تھی اُس شہر میں جس کا قصیدہ صائب تبریزی اِس شعر سے شروع کرتا ہے۔

خوشا عشرت سرائے کابل و دامانِ کہسارش

کہ ناخنِ بر دل گُل می زند مژ گانِ ہر خارش

اور اِس بیت ختم

تعالےٰ اللہ از باغِ جہاں آرا و شہر آرا

کہ طوبیٰ خُشک بر جا ماندہ است از رشکِ اشجارش

زر نگار پارک پہلے خاصا وسیع تھا۔ اب سمٹ گیا ہے اور کئی سرکاری عمارتوں نے اِس کا پہلو دبا لیا ہے۔ اِس میں کئی تاریخی یادگاریں ہیں۔ اِس کونے پر جو ہمارے ہوٹل

کی طرف پڑتا ہے امیر عبد الرحمان کا سادہ اور سفید مقبرہ ہے۔ امیر عبد الرحمان وہ بادشاہ تھے جن کے رُعب اور ہیبت سے دھرتی کانپتی تھی۔ اُنہوں نے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۱ء تک حکومت کی۔ اُس وقت افغانستان میں تین طاقتیں تھیں۔ ایک بادشاہ، دوسرے خوانین اور تیسرے مُلّا۔ امیر عبد الرحمان نے مُلّا کو تو ساتھ ملائے رکھا۔ خوانین کی بیخ کُنی کی کہ کل کلاں کوئی اور دعوے دار تخت کا نہ پیدا ہو جائے۔ امیر عبد الرحمان نے یورپ کا سفر بھی کیا اور باغ بالا میں ہم نے وہ نوادر دیکھے جو موصوف نے اِس سیاحت میں جمع کئے تھے۔ اِن کے سفر یورپ کے کئی قصّے مشہور ہیں۔ مثلاً یہی کہ ملکہ وکٹوریہ نے دعوت پر بُلایا۔ اُنہوں نے چھُری کانٹے کو نظر انداز کر کے مُرغ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دانتوں سے بھنبھوڑنا شروع کیا اور ہڈیاں زمین پر پھینکیں۔ مہمان عالی مقام کے احترام میں ملکہ وکٹوریہ نے بھی یہی کیا اور فرش پر ہڈّیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اِس کے بعد ہاتھ دھونے کے لئے پانی کے پیالے (فنگر باؤل) سامنے آئے تو امیر صاحب نے اپنا پیالہ غٹا غٹ پی لیا۔ ملکہ مُعظّمہ اور اُن کے درباریوں کو بھی یہی کرنا پڑا۔ کتابوں میں آیا ہے کہ منتظم بہت اچھّے تھے۔ اچھّے کا مطلب سخت گیر سمجھئے۔ اِن کے زمانے تک شاہی محل پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ بالا حصار ہی میں ہوتا تھا۔ امیر عبد الرحمان نے اِسے ترک کر کے نیچے میدان میں قلعہ

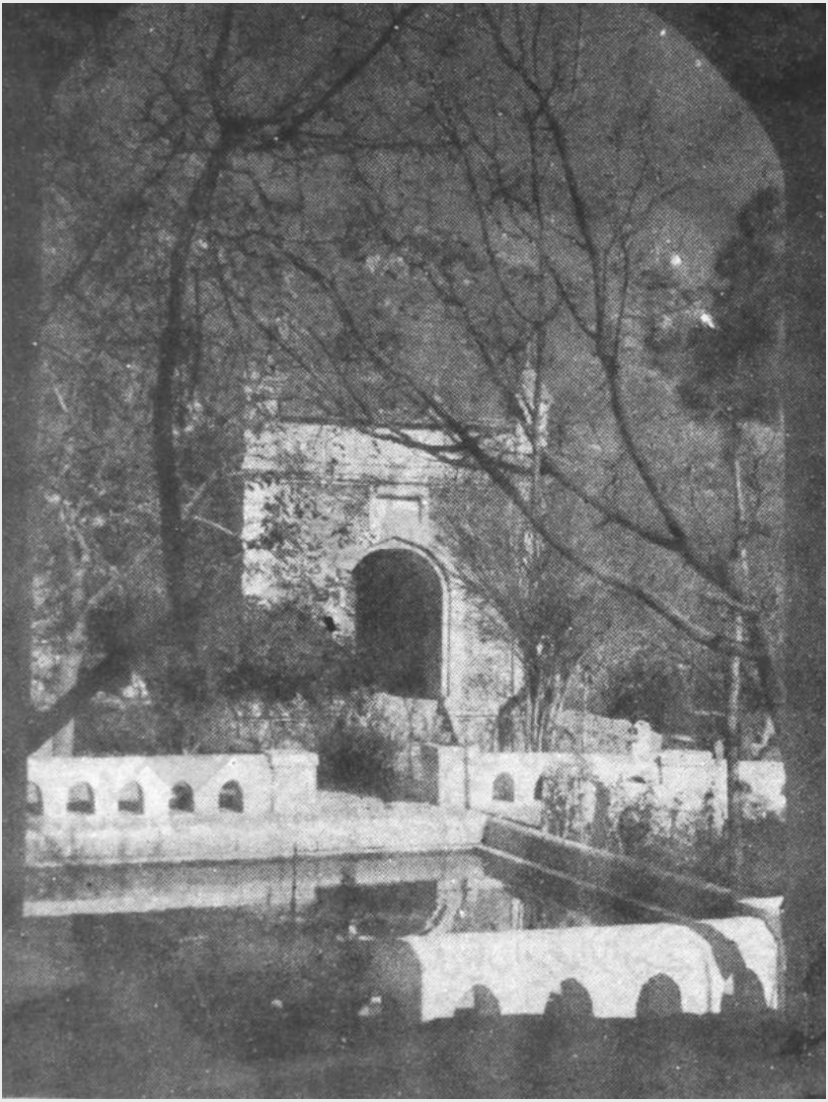
بنایا جسے ارک کہتے ہیں اور جو اب بھی شاہی مستقر ہے۔ اللہ بخشے مستبد اور شقی القلب اِس درجہ تھے کہ تین سگے بھائیوں کو محض اِس جُرم کی پاداش میں قتل کرادیا کہ اُن میں سے ایک نے خواب میں خود کو بادشاہ بنتے دیکھا تھا۔ اِس شامت کے مارے نے صُبح اُٹھ کر اپنے دوسرے بھائی سے اِس کا تذکرہ کیا۔ اُس نے اُسے منع کیا کہ کسی اور سے نہ کہنا لیکن بات کسی طور باہر نکل گئی اور امیر عبد الرحمان نے دونوں کو پکڑ منگوایا۔ حتّٰی کہ اُن کے تیسرے بھائی کو بھی جو کابل سے کوسوں دور تھا۔ امیر نے جلّادوں کو حکم دیا کہ تینوں کے سر قلم کر دو۔ اِس پر دوسرے بھائی نے کہا۔ ”مُجھے تو نہ مارو۔ میں نے تو خواب دیکھا نہیں فقط سُنا ہے۔“ تیسرا بولا۔ ”حضور میں نے تو سُنا بھی نہیں۔ میں تو کابل سے باہر تھا۔“ لیکن امیر نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا اور تینوں موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ اِنہی بزرگ کے عہد میں شنواریوں نے بغاوت کی تو اُس کی ناکامی کے بعد قبائل کے سرداروں کے سروں سے ایک اونچا مینار تعمیر کیا گیا۔

امیر عبد الرحمان کے مقبرے کی عمارت بڑی نہیں لیکن اُس کی سادگی میں شِکوہ ہے۔ ساتھ ہی اِس اندازِ تعمیر کی ایک چھوٹی سی مسجد جس کے صحن میں پچیس تیس آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہو گی۔ مقبرے کے بر آمدوں میں مختلف کتبے

اور شاعروں کے قصیدے سنگِ مرمر پر کندہ ہیں جن میں اُن کو کیواں بارگاہ اور نوشیرواں ثانی اور رحمت و بخشش اور جود وسخا کا منبع بتایا گیا ہے۔ خیر وہ اور زمانہ تھا۔ امیر عبد الرحمان تو پھر بادشاہ تھے۔ اُن کے قصیدے نہ لکھتے تو وہ اُن کی کھال کھنچوا دیتا۔ معمولی ڈپٹی کمشنروں اور انسپکٹر تعلیمات وغیرہ کے خیر مقدم میں بھی ہم نے لوگوں کو اِس سے زیادہ لکھتے دیکھا ہے۔ مقبرے سے تھوڑی دور زر نگار پارک ہی میں غازی امان اللہ خاں کے دو بھائیوں کی قبریں ہیں۔ جو بچّہ سقّہ کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ اِن مزاروں کی لوحیں اُکھڑی ہوئی ہیں۔ پندرہویں صدی کے ایک بزرگ محمد امین احمد انصاری کا مزار بھی ایک چھوٹی سی بُرجی کے نیچے اُس کے پاس ہے۔ پارک کے اِس علاقے میں تاجداروں کے محل بنے بھی اور ڈھے بھی گئے۔ جن میں ہے ایک وہ تھا جس میں ۱۹۶۱ء میں افغانستان کی دستاویز آزادی پر دستخط ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں پیوند زمین کر دیا گیا۔ ایک اور محل یہاں امیر عبد الرحمان نے اپنی چہیتی بیوی کے لئے بنوایا تھا اور جس کا ایک حصّہ اب بھی کھڑا ہے اور بوجو جان کہلاتا ہے۔

کہتے ہیں شہنشاہ بابر کے چچا الغ بیگ نے پندرہویں صدی میں یہاں ایک باغ بنایا تھا جس کی جگہ بعد میں بستان سرائے کے باغ نے لی۔ پارک کے اُس سِرے پر جو

دریائے کابل کی طرف کو ہے اور جہاں اب پشتانی تجارتی بینک اور پی آئی اے کا دفتر ہے ایک چوبی عمارت شیرینی رکھنے کے لئے مخصوص تھی۔ امیر عبد الرحمان کے زمانے میں اور اس کے جانشین کے دور میں بھی یہ دستور تھا کہ اگر کوئی امیر سلام خانے میں بادشاہ کو سلام کرنے آتا تھا تو اُسے ایک چمک دار ریشمی رومال میں مِصری کا ایک ڈلا باندھ کے دیتے تھے۔ ڈلے کا حجم اُس امیر کے درجے کی نسبت سے ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ ایک آدھ سیر شیرینی یعنی شکر آمیز میوے بھی عطا ہوتے تھے۔ چونکہ مختلف تقریبات پر سلام کرنے کے لئے بے شمار لوگ آتے تھے لہٰذا منوں شیرینی اور مِصری تقسیم ہو جاتی۔ اب نہ شیرینی ہے نہ شیرینی کھانے والے نہ محل ہے۔ نہ امیر عبد الرحمان۔ اب اِس جگہ پر حمال اور مزدور بیٹھ کر دھوپ تاپتے ہیں اور کپڑوں میں سے جوئیں چُن چُن کر مارتے ہیں۔



مقبرۂ بابر کابل

اس پارک کو شہر کا قلب جاننا چاہیئے۔ ائیر پورٹ جانے کا راستہ یہی ہے۔ دونوں اچھے ہوٹل۔۔۔ کابل اور سپین زر۔۔۔ یہیں واقع ہیں۔ افغان اریانا اور پی آئی اے کے دفاتر بھی یہاں ہیں۔ اطلاعات اور تعلیمات کی وزارتوں کے جدید دفاتر بھی اِس سے ملے ہوئے ہیں اور پرانی وزارتِ خانہ بھی سامنے آتی ہے۔ ایک سڑک مسجد پُل خشتی کی طرف کو نکل گئی ہے۔ ایک مقبرہ تیمور شاہ اور ماشین خانے کے پاس سے ہوتی ہوئی دارالامان اور یونیورسٹی اور بابر باغ کی طرف چلی گئی ہے۔ پھر ایک دروازہ ارک کا بھی پارک کی طرف پڑتا ہے اور شہرِ نَو، باغِ بالا، پغمان وغیرہ جانے کی شاہراہ بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جو سڑک پُرانی وزارتِ خارجہ کے سامنے پڑتی ہے۔ اِس پر مُختلف مُلکوں کے سفارت خانے ہیں۔ یہیں اقوامِ متحدہ کا دفتر ہے جہاں ہمیں اپنے کام سے جانا پڑتا ہے اور چینی سفارت خانے سے اِس کی دیوار ملی ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمسائیگی کے باوجود اقوامِ متحدہ والے چین والوں کو نہیں پہچانتے۔ اُن کا سائن بورڈ دیکھ کر انجان بن کر گُزر جاتے ہیں اور چین والے تو اِتنی گھاس بھی نہ ڈالتے ہوں گے۔ اُن کے نام کی تختی بھی نہ پڑھتے ہوں گے۔

اِس سڑک کے کونے پر ایک روز ہم نیشنل لائبریری میں گئے۔ پرانے زمانے کی خستہ عمارت ہے۔ کبھی یہاں کوئی سرکاری دفتر ہوا کرتا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے تنگ و

تاریک زینے ہیں لیکن کتابوں کا ذخیرہ نادر ہے۔ مجلسِ ادبی کے علامہ اقبال اور مولانا سلیمان ندوی مہمان ہوئے تھے۔ اِس کا کُتب خانہ بھی اب اِس لائبریری کا جزو ہے۔ کوئی ایک ہزار کتابیں ہیں فارسی کی، انگریزی کی اور اُردُو کی بھی۔ اُردُو کا ذخیرہ نہ جانے کس زمانے میں بنا ہو گا۔ اگرچہ انجمنِ ترقّیٔ اُردُو کی کتابیں بھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر رائے صاحب مُنشی گلاب سنگھ اور مُنشی محبوب عالم کے زمانے کی ہیں۔ قصّے کہانیاں ہیں جن کی مُشترکہ جلدیں بنی ہوئی ہیں۔ پرانے پرچوں میں اصلاح، انیس، امان، افغان وغیرہ کے فائل بھی یہاں ہیں جو ۴۲-۱۸۳۹ء کی پہلی افغان جنگ کے متعلّق انگریزوں نے لکھ رکھی ہیں۔ یہ جنگ، جس میں انگریزی سپاہ ایسی تباہ ہوئی تھی کہ اٹھارہ بیس ہزار کی فوج میں سے فقط ایک آدمی ڈاکر برائیڈن گرتا پڑتا زخمی حالت میں جلال آباد پہنچا تھا، انگریزوں کو آج تک نہیں بھولی۔ بیسیوں کتابیں اِس موضوع پر لکھی گئیں اور آج تک لکھی جارہی ہیں۔ مصوّروں نے اِس واقعہ ہائلہ پر قلم آزمایا اور اِس کی خیالی تصویریں لندن کی ٹیٹ گیلری میں لٹکی ہوئی ہیں۔ اخباروں کے فائلوں میں ہمیں حبیب الاسلام کی تلاش تھی۔ یہ اخبار بچّہ سقّہ نے جاری کیا جو خود کو محافظِ اسلام امیر حبیب اللہ کہلاتا تھا۔ جب تک بچّہ سقّہ رہا یہ پرچہ بھی چھپتا رہا۔ اِس کے مندرجات عبرت انگیز ہیں۔ یہ قزاق خود کو محافظِ اسلام

کہتا تھا کہ لوگ بھی اِسے یہی کہتے تھے۔ بلکہ ہر روز حبیب الاسلام میں ایک لمبی فہرست بیعت کرنے اور اطاعت قبول کرنے والوں اور امان اللہ خاں پر تبرّہ بھیجنے والوں کی چھپتی تھی۔

ایران

١٩٦٨ء

اک ذرا تہران تک

ایک بار پھر ہمارے آوارہ گرد پاؤں میں کھجلی ہوئی اور ہم نے تہران جانے کا اذن پا کر اپنی فارسی کو وِم لگا کر رگڑ رگڑ کر مانجھا۔ اچھّا تو آقائے ابنِ انشا اِس دیار میں پھر جاؤ اور صُبحانہ کھاؤ۔ کوچوں میں گھومو اور جوتا گھِس جائے تو اُسے تعمیر کراؤ کہ وہاں مرمّت کے لئے یہی لفظ ہے۔ مکان ساختمان ہے اور ادارہ سازمان۔ نوکرانی کلفت ہے اور ڈرائیور آقائے رانند۔ دستگیر کا مطلب گرفتار ہے اور گرفتار کا مطلب مصروف۔ ہمارے ایک دوست نے نئے سفارتخانے میں آئے تو دوسرے روز اپنی سیکریٹری کی درخواست رُخصت میز پر پاکر بہت پریشان ہوئے۔ اُس میں لکھا تھا بوجہ گرفتاری شخصی آج دفتر نہیں آسکتی۔ یہ بڑے ہمدرد قسم کے ہیں۔ فون کر کے پوچھا کہ بی بی تیرا کون شخص گرفتار ہو گیا ہے۔ ہم ضمانت دے کر چھڑا دیں۔ تو معلوم ہوا کہ گرفتار شخصی کا مطلب پرسنل کام یعنی ذاتی مصروفیت ہے۔ کسی ایرانی

غریب کے گھر جائیے تو از راہِ خاکساری یہ مت اصرار کیجئے کہ میں فرش پر بیٹھوں گا۔ وہ بے چارا آپ کے لئے فرش کا بندوبست کرتا پھرے گا۔ فرش کے معنی قالین ہیں آج کی فارسی میں۔



ہم ہمہمار ہے تھے کہ اب کے بہار کی بانگی دیکھیں گے۔ خیابانِ اِرم پائیں گے۔ ایک بار جانا ہوا تو کڑاکے کے جاڑے کا عمل تھا۔ دسمبر کا مہینہ۔ برف دیکھتے دانت کٹکٹاتے لوٹے۔ دوسری بار اپریل تھا۔ ہم اپنے ٹھنڈے لباس میں چلے اور وہاں جاتے ہی ریفریجریٹر میں لگ گئے۔ پہلی بار کنارِ آب رُکنا باد و گلگشت مُصلّٰی دونوں

سے مایوس آئے۔ شیراز میں برگ باد کا نشان نہ تھا۔ دوسری بار کیسپیئن کنارے راتیں گزار دِل گداز نظمیں لکھتے لوٹے۔ ع کنار کیسپیئن پہ ہم بہت اداس ہو گئے وغیرہ۔۔۔۔۔۔ بہار سے دونوں بار ملاقات نہ ہوئی۔ اب کے جانے سے پہلے ہم نے پوچھا یارو یہ کون سا فارسی مہینہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اردی بہشت ہے۔ بلکہ اِس کا بھی چل چلاؤ ہے۔ بے اختیار سودا کا قصیدہ یاد آیا۔

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

تیغِ ارُدی نے کیا مُلکِ خزاں مستاصل

ہم نے پی آئی اے والوں سے کہا: بھیّا جلدی سے دے دو ایک ٹکٹ تہران کا ہمیں ورنہ بہار چلی جائے گی۔

کام نے ہم کو نکمّا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

افسوس کہ ہمارا شوقِ بہار بینی و گُلچینی اب کے کام کی نذر ہو گیا۔ ہم "چلتے ہو تو چمن کو چلیئے۔۔۔۔" اپنے غُسل خانے ہی میں گُنگُناتے رہ گئے۔ کسی باغ واغ تک رسائی نہ

ہوئی۔ ورنہ جی چاہتا تھا کیا کیا کُچھ۔ بس اپنے ہوٹل کی گیلری سے نیچے جھانک لیتے تھے اور چونکہ ہم طبقۂ چہارم پر تھے یعنی چوتھے مالے پر، لہٰذا ہمسایوں کے صحنوں اور چمنوں پر نظر پڑتی ہے۔ اب ہم نے یہ دیکھا کہ یہ لوگ اپنے گھروں ہی میں گُلزار بناتے ہیں۔ صحن کتنا بھی چھوٹا ہو اُس میں ایک تختہ گھاس اور پھولوں کا ضرور ہو گا۔ بڑا صحن ہے تو بڑی پھُلواری لیکن وہاں سبزے پر بیٹھنا یا اُس کو روندنا بد ذوقی بلکہ گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے گِرد کُرسیاں بِچھا کر بیٹھتے ہیں اور آنکھوں میں ٹھنڈک بساتے ہیں۔ ہمارے ہوٹل کے ضمن میں بھی ایک تختہ گھاس کا تھا جس کے چاروں کونوں میں گلاب کے تھالے تھے اور گلاب بھی قسما قسم کا۔

عجیب اِتّفاق ہے کہ اب کے بھی ہمارا بندوبست ہوٹل اٹلانٹک میں تھا۔ اٹلانٹک یعنی اوقیانوس۔ بحرِ ظلمات بھی شاید اِسی سمندر کو کہتے ہیں۔ تو یُوں سمجھئے کہ یہ ہفتہ ہمیں بحرِ ظُلمات میں گھوڑے دوڑاتے گُزرا۔ یہ گھوڑے بھی ہم اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے وہیں خریدے تھے۔

۱۹۶۴ء میں ہم جس ہجوم میں تھے اُس میں کئی مُلکوں کے لوگ تھے۔ انگریز، ہندوستانی، سیلونی وغیرہ۔ اِن لوگوں کو تو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ ہاں ہماری فارسی نے ہمیں بہت دُکھ دیا۔ اِن لوگوں کو فارسی جاننے کا ادعا نہ تھا لہٰذا انگریزی بولتے تھے۔

کوئی سمجھے سمجھے ورنہ خصماں نوں کھائے۔ ہم فارسی بولتے تو ایسی زنّاٹے کی تھی کہ خود ایرانی ہمارا مُنہ تکتے رہ جاتے تھے۔ لیکن جب ایرانی جواب دیتا تھا تو رفت گیا اور بود تھا سے آگے نہ سمجھ پاتے تھے۔ بس بلے بلے چشم چشم۔ مرسی مرسی کرتے رہ جاتے تھے۔ کوئی بھی زبان ہو اُس کا بولنا آسان ہے۔ سمجھنا مُشکل ہے۔ اب کے ائیر پورٹ ہی سے ایسا ڈرائیور ملا کہ ہم فارسی بولیں تو انگریزی میں جواب دیتا تھا۔ ہوٹل کا کاؤنٹر پر ہم نے انگریزی بگھاری تو کاؤنٹر کا آدمی اُردُو بولا۔ جی اچھا۔ جی اچھا۔ ہم نے پوچھا۔ یعنی؟ تب معلوم ہوا کہ وہ شخص تین سال کراچی میں رہا ہے اور پندرہ سال اِس سے پہلے بمبئی میں۔ پس ہوٹل میں اُردُو چلی۔ جس میٹنگ میں ہم گئے تھے اُس میں انگریزی چلی۔ خوبی قسمت سے ہمارے دوست بشیر خالد آر سی ڈی والے پہلے ہی روز سے ساتھ ہو گئے تھے۔ اُن کے ساتھ پنجابی چلی۔ فارسی بولنی ہوتی تھی تو ہم انہی کو آگے کر دیتے تھے لیکن ایک روز تو وہ بھی رمجک چاٹ گئے۔ ہوا یہ کہ ہم نے کلیم سہسرامی اور شبیر احمد اختر کو فون کیا۔ یہ دونوں تہران کی رہائش گاہ میں ڈاکٹری پاس کرنے گئے ہیں۔ فون کے ادھر سے لینڈ لیڈی فارسی میں جواب دیا۔ ہم ہمّت کر کے فارسی بولتے رہے لیکن جب وہ گوشی گوشی کرنے لگی تو ہم نے چونگا بشیر خالد کو تھما دیا کہ اب فارسی کا پانی ہمارے سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے گوشی

گوشی سُن کر فون بند کر دیا اور کہا اِس کا مطلب میں سمجھتا ہوں کہ وہ کلیم صاحب کو اِطّلاع دے رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں خود فون کر لیں گے۔ بعد میں کھُلا کہ آنچہ ما پند اشتیم غَلَط تھا۔ وہ کُچھ ''گوش خدمت'' وغیرہ کہہ رہی تھیں جس کا مطلب ہوتا ہے ہولڈ آن، یعنی تھامے رکھئے میں بُلا کے لاتی ہوں۔

ہم سوچتے ہیں کہ سعدی اور حافظ زندہ ہو کر بازاروں کا چکّر لگائیں تو خود چکرا جائیں۔ خانہ کو خونۂ آسمان کو آسمون تو خیر سُن لیں گے۔ اخبار میں رژیم کا مطلب کیا لیں گے۔ سائن بورڈ پر دیکا ریسپون اور سالن اور مبل اور اپار تمنتہائے کو کیا سمجھیں گے۔، یہ سبھی انگریزی اور فرانسیسی کے لفظ ہیں۔ ڈیکوریشن میل (فرنیچر) اپارٹمنٹ وغیرہ سالن کا لفظ دیکھ کر آپ کے مُنہ میں پانی نہ بھر آنا چاہئے۔ اِس کا مطلب salon ہے۔ اِس میں بال کٹوایئے، چمپی کروایئے یا اپنی جلد پر جھانواں پھِروائے۔

۱۹۴۶ء تک ایران کی ٹیکسیوں میں ہیٹر نہ ہوا کرتے تھے۔ تہران میں آپ کہیں بھی چلیں جائیں پندرہ ریال یعنی پندرہ آنے میں جاسکتے تھے۔ اصفہان چھوٹا ہے ہاں دس ریال دے کر کہیں بھی چلے جائیں۔ شیر از کا ریٹ پانچ ریال تھا لیکن اب میٹر لگ گئے ہیں۔ ٹیکسی دس ریال سے شروع ہوتی ہے۔ ایک ایک ریال بڑھتا ہے۔ آخر

میں کُچھ بطور اضافہ بھی دینا پڑتا ہے۔ ائیر پورٹ سے شہر اُس زمانے میں پچاس ریال میں چلے جاتے تھے۔ اب کے ایک سو بیس ریال دے کے چھُوٹے۔ یہاں کی ٹیکسیاں بھی خوب ہیں۔ آواز سے دُگنی رفتار سے چلتی ہیں اور ہر ایک نے پیچھے کے شیشے پر لکھوا رکھا ہے "آہستہ "یعنی اے پیچھے آنے والے تُو آہستہ آئیو۔ میری فکر مت کیجیو۔ پھر بھی حادثے کم ہوتے ہیں۔ ٹریفک کا سپاہی بے قاعدگی دیکھ کر فوراً روک لیتا ہے اور وہ وہیں جُرمانہ وصول کر کے رسید لکھ دیتا ہے۔ اِس سے یہ لوگ ڈرتے بھی بہت ہیں۔ کیونکہ سُنا ہے وہ رشوت نہیں لیتا۔ ایک روز شام کو ہم ایک بڑے میاں کی ٹیکسی میں بیٹھے۔ لائٹیں اُس کی خراب تھیں۔ روشن نہیں تھیں۔ سپاہی نے چوراہے پر روکا اور فوراً پچاس ریال جرمانہ وصول کیا۔ وہ بہت بکتا جھکتا رہا کہ چراغ روشن است۔ لیکن سنتری نے نہ مانا۔ حقیقت یہی تھی کہ اُس کی لائٹیں جل نہیں رہی تھیں۔ لیکن بڑے میاں کو اصرار تھا کہ یہ سپاہی جھوٹ بولتا ہے۔ آگے چل کر ہم نے اُسے پرچانے کو کہا کہ ایرانی بڑے اچھّے لوگ ہوتے ہیں۔ جل کر کہنے لگا: "بالکل بھی اچھّے نہیں ہوتے۔ دیکھا نہیں وہ ٹریفک کا سپاہی کتنا جھُوٹا تھا۔"

شب جائے کہ مَن بُودم

ہمارے محب و مُشفق اُردُو کے نامی گرامی ادیب ڈاکٹر حسین رائے پوری آج کل تہران میں ہیں۔ یونیسکو مِشن کے سربراہ کے طور پر اُن کی کلفت (خادمہ) ہمارے لئے خاصی کلفت کا باعث ہوئیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کا نمبر معلوم کر کے اُن کے گھر پر فون کیا تو وہ تو تھے نہیں، یہی بی بی بولیں۔ ہم نے اپنا نام پتہ ولدیت سکونت وغیرہ سب بتائیں۔ وہ بالے بالے (بلے بلے یعنی ہاں ہاں) کرتی رہیں اور ہم مطمئن ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو اُنہوں نے ساری گفتگو کا خلاصہ کُچھ اِس طرح بتایا جس طرح کسی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی کہانی کا ست نکالا تھا کہ پدرے بود۔ پسر داشت گم کرد۔ بازیافت "یعنی کہا تو یہ کہا کہ "کسی پاکستانی آقا نے کہیں سے فون کیا تھا۔ نام میں بھول گئی ہوں۔" اگلے روز ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اُن کے دفتر فون ملایا تب یہ قصّہ معلوم ہوا۔ ہم نے کہا لیکن وہ بی بی تو یُوں ظاہر کر رہی تھیں جیسے ہر

چیز نوٹ کر رہی ہوں۔ بولے دماغ میں نوٹ کیا تھا نہ۔ لکھنا تو بے چاری جانتی نہیں۔ اچھا شام کو آؤ۔ دال روٹی کھاؤ۔ اور تمہیں تماشا دکھائیں۔ ہم نے کہا بائی سکوپ۔ بولے نہیں کُچھ اور۔ تالار رودکی دیکھا ہے نا۔" ہم نے کہا۔ فقط کلامِ رودکی دیکھا ہے جو کُچھ مولیوں وغیرہ کی تعریف میں ہے۔ بولے جوئے مولیاں آید ہمے۔ فرمایا یہ اس سے الگ چیز ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں کنسرٹ ہوتے ہیں۔ ڈرامے ہوتے ہیں۔ بیلے ہوتے ہیں۔ بہر حال ہے دیکھنے کی چیز۔



اور تالارِ رود کی واقعی دیکھنے کی چیز نکلا۔ ہم نے اُسے بھی دیکھا اور جو اُسے دیکھنے آئے تھے اُن کو بھی دیکھا۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

تو کُجا بہر تماشامی رومی

یہ بڑے بڑے پھاٹک، یہ بڑا احاطہ۔ اندر سبزہ اور حوض اور فوّارے۔ چھت کی اونچائی تک پانی پھینکتے ہوئے۔ پھر روشنیوں کی جھِلمل جھِلمل۔ ہم مرمریں فرش کو اپنے پاؤں سے میلا کرتے ہوئے اندر پُہنچے تو ایک عالیشان گُنبد والی نظارہ گاہ تھی اور ہم تھے اور۔۔۔۔۔۔

صفوی خاندان کا ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا ہے۔ ایک خان قالین باف دوشیزاؤں کی ایک ٹکڑی کے ساتھ آتا ہے اور ایک قالین تحفے میں پیش کرتا ہے۔ قالین پر دِلآرام کا نام بُنا ہے اور شہزادہ اُن لڑکیوں سے دِلآرام کو دریافت کرلیتا ہے۔۔۔۔

دِلآرام شہزادے کے سامنے دوزانو جھُک جاتی ہے۔ سازندے اپنے

ساز چھیڑتے ہیں۔ موسیقی کا ایک ریلا آتا ہے۔ دربار کی رسمیں شروع ہوتی ہیں۔ شہزادہ اور اُس کے درباری رُخصت ہو جاتے ہیں۔ لڑکی تنہا بیٹھی رہ جاتی ہے اور خواب دیکھتی ہے۔۔۔

یہ سہانا سپنا کیا ہے؟ جنگل ہے اور جنگل میں اُس کا خیمہ ہے اور خیمے کے باہر وہ سکھیوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ شہزادہ شکار کھیلتے ہوئے راستہ بھول اپنے ہمراہیوں سے جُدا ہو کر وہاں وارد ہوتا ہے۔ وہ تھکا ہوا ہے۔ لڑکی اُس سے اتنی مہربانی برتتی ہے کہ اُس کے دِل میں اُس کی محبّت کا شُعلہ فروزاں ہو جاتا ہے۔ اتنے میں شہزادے کے ہمراہی آ جاتے ہیں اور وہ اُن کے ساتھ رُخصت ہو جاتا ہے۔ہاں جاتے ہوئے اپنی انگشتری نشانی میں دِلآرام کو دے جاتا ہے۔۔۔۔

اِس مرحلے پر درباری بازی گر داخل ہوتے ہیں اور اُس لڑکی سے کہتے ہیں کہ اب جلّاد آکر تمہارا سور قلم کرنے والے ہے۔ جلّاد واقعی آتا ہے اور تیغہ اُٹھاتا ہے۔ وہ اپنی جان سے مایوس اور دِلگیر ہوتی ہے کہ شہزادہ مع ہمراہیوں کے آتا ہے۔ وہ اسے پہچان کر انگشتری اس کے آگے کر دیتی ہے۔ شہزارہ اپنی گُم گشتہ محبوب کو پا کر خُوشی سے وارفتہ

ہو جاتا ہے اور جشن برپا ہوتا ہے اور موسیقی کا ایک بڑا ریلا آتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

اے برِّ عظیم والو۔۔۔ دِلآرام کو جانتے ہو؟ ہمارے بادشاہ ہمایوں۔۔۔ نظام سقّہ فیم۔ جب شکست خوردگی میں اصفہان پُہنچے تو طہماسپ صفوی نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شطرنج کھیلتے میں اُن کی نظر اُس کی ناطورہ دلفریب یعنی۔۔۔ دِلآرام نامی کنیز پر پڑی۔ ہمایوں صاحب بادشاہی میں نہ سہی شطرنج میں تو چابک دست تھے۔ جیتنے کو تھے۔ شرط اُنہوں نے یہ کی کہ اگر میں بازی جیتا تو دِلآرام میری۔ دِلآرام نے اِس موقع پر نغمہ چھیڑا۔ ''شاہا دو رُخ بدہ و دِلآرام رامدہ'' یعنی دو رُخ دے دے۔ دِلآرام کو ہاتھ سے مت دے۔ ہمایوں تو بُدھو آدمی تھے۔ کُچھ سمجھے کہ نہ سمجھے۔ طہماسپ نے یہ چال چلی اور بازی جیتی۔

اِس داستان کی بدولت ہمایوں بادشاہ کے بارے میں بھی ہماری روئے کُچھ بہتر ہو گئی ہے۔ ہم تو یہی سوچتے تھے کہ بس بابر کا بیٹا تھا۔ تخت پر بیٹھا۔ شیر شاہ کی تاب نہ لا کر بھاگا۔ نظام سقّہ کو ایک دِن کی بادشاہی بخشی۔ حمیدہ بیگم سے شادی کی۔ اکبر کو پیدا کیا اور سیڑھیوں سے ِگر کر مر گیا۔ دِلآرام کے قصّے سے پتہ چلا کہ کُچھ نہ کُچھ گزارے لائق دِل زندہ بھی رکھتا تھا۔ حالات سازگار ہوتے تو عاشق ہونے کی صلاحیت بھی

تھی۔ اے ہمایوں بادشاہ اتنی سی بات پر ہم نے تیرے گناہ معاف کئے۔

لیجئے کہاں کی بات تھی ہم کہاں جا نکلے۔ قصّہء دِلآرام کا کسی اور صورتِ حال میں تھا اور مقام تالارِ رودکی۔ اِس سے پہلے کُچھ اور پروگرام بھی تھے۔ ایک بانو نے پری وش ستودہ نام رکھتی تھی مشہور شاعرہ لعبت والا کے دِلگداز عشقیہ اشعار سُنائے۔ پھر فرامرز زیاور نے سنتور نامی ساز بجا کر حاضرین کو مسحور کیا۔ ایک چھوٹا سا رقص بھی ہوا اور آرکسٹرا نے اپنے کمال دکھائے۔ پروگرام فارسی میں چھپا ہوا ہمارے سامنے تھا۔ جو آئٹم ختم ہوتا تھا ہم اُس پر نشان کرتے جا رہے تھے۔ اگلی باری ”آنتراکت“ کی تھی۔ ہم اِسے دیکھنے کے مشتاق تھے کہ لوگ اُٹھ گئے اور باہر نکلنے لگے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کہا یہ ”آنتراکت“ بھی تو دیکھیں۔ بولے۔ ”باہر نکل کے دیکھو۔“ آنتراکت فرانسیسی زبان میں انٹرول کو کہتے ہیں۔ مونگ پھلی اور کوکا کولا والا انٹرول۔

کہ اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا۔

کل بشیر خالد صاحب نے کہا آج شام میرے ساتھ چلو۔ ایک جگہ کھانا ہے اور گانا ہے۔ ہم نے کہا کھانے میں عُذر نہیں لیکن گانا۔ ہمیں گانا نہیں آتا۔ بولے تُم سے کون کہہ رہا ہے گانے کو۔ اور لوگ گائیں گے۔ ہم نے کہا اچھّا لیکن زیادہ پکّا اور زیادہ کچّا گانا ہم نہیں سُن سکتے۔ فرمایا بین بین ہو گا اور تہران کے بہت سے پاکستانیوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

خُدا جانے کتنی راہوں سے ہو کر ہماری ٹیکسی ایک جگہ رُکی۔ جس گھر میں ہم داخل ہوئے وہاں کا نقشہ ہی کُچھ اور تھا۔ لوگ صف بہ صف بیٹھے قرآن خوانی کر رہے تھے۔ ہم بھی سر پر رومال باندھ تھوتھا مُنہ بنا بیٹھ گئے اور ایک پارہ پڑھنے لگے۔ اُسے ختم کر کے ہم نے خالد صاحب کے کان میں کہا۔ دیر ہو رہی ہے اِس گانے والے گھر

میں بھی جاتا ہے اور یہاں کا آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں تھا۔ خُدا بخشے بہت سی خوبیاں ہوں گی مرنے والے میں لیکن وہ غریب الوطن تھا کون؟ حیران ہو کر بولے کس کو پوچھ رہے ہو۔ ہم نے کہا جس کے ایصالِ ثواب کا یہ سامان کیا گیا ہے۔ خالد صاحب نے کہا خُدا نخواستہ میاں تمہارے خیال میں قرآن شریف صرف کسی کی موت پر پڑھنے کی چیز ہے۔

ہم نے کہا: "ہم نے تو اکثر اپنے ہاں یہی دیکھا ہے۔"

بولے: "یہاں کے پاکستانی بڑے متدیّن ہیں، مذہب کے پاس دار بلکہ والا و شیدا۔۔۔۔ یہ صادق بٹ صاحب جن کا یہ گھر ہے مہینے میں ایک بار برکت کے لئے قرآن خوانی ضرور کراتے ہیں۔ احباب کو بلاتے ہیں۔ کھانا کھلاتے ہیں۔ محبّت اور مودت بڑھتی ہے۔ دِل بہلا رہتا ہے۔ اچھّا، پارہ پڑھ چُکے۔ اب نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔"

"نماز؟" ہم نے کہا۔

بولے۔ "ہاں مغرب کا وقت ہے۔"

ہم نے کہا: ”ہاں! ہاں!! بے شک مغرب کا وقت ہے۔ ہمیں خیال ہی نہیں تھا۔ جو نیّت امام کی سو ہماری۔ مُنہ طرف قبلہ شریف۔ اللہ اکبر۔“

اس محفل میں ہمارا مزہ تھوڑا سا کِر کِرا ہوا اور ہم نے بشیر خالد کا مزا کِر کِرا کیا۔ ایک صاحب حافظ یونس کہیں اپنا قصّہ لے بیٹھے کہ اہواز میں ایک ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ گرمی کے دِن تھے۔ کمرے کو تالا لگا کر سامنے چارپائی ڈال سو رہے۔ صُبح اٹھے تو اندر جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ تالا اُسی طرح لگا ہوا تھا۔ ہوٹل والوں سے شکایت کی تو بولے۔ نمی دانیمَ دایئم ہم کیا جانیں؟ یہ بیچارے اُسی سلیپنگ سوٹ میں تہران پہنچے۔۔ اُن کا قصّہ تو تہران بعد میں پہنچا۔ ہم نے اِس سے پہلے ہی اپنی جیب پر ہاتھ رکھا جس میں اپنا زادِ راہ تومانوں کی صورت رکھتے تھے۔ کیسہ خالی تھا۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ رقم تو دوسرے کوٹ میں رکھی ہے۔ ہم نے سوٹ بدلا لیکن جیبوں کی موجودات نہ بدلیں۔ بس پھر کیا تھا۔ دیوانہ راہوئے بس است۔ ہمارا آوارہ گرد ذہن بھی اہواز پہنچا۔ ہوٹل کے بل کا خیال آیا۔ یہ کون ادا کرے گا۔ بشیر خالد نے کہہ تو دیا کہ بابا میں ادا کروں گا، چنتا نہ کرو۔ محفل ختم ہونے کے بعد ہوٹل میں جا کر اپنی ہمیانی ٹٹولنا۔۔۔ لیکن ولے کہ عاشق وصابر بود گر سنگ است۔

ہم نے حاضرین سے معذرت چاہ بشیر خالد کو گھسیٹ ٹیکسی لے ہوٹل کا رُخ کیا۔ اُس

دِن ہمیں ٹیکسی لینے کا بہت تلخ تجربہ ہوا۔ پورا گھنٹہ سڑک کنارے کھڑے رہے۔ آخر ایک پرائیویٹ ٹیکسی سے استمداد کی۔ ہمارے واپس آنے تک نہ صرف کھانا ہو چکا تھا بلکہ گانا بھی شروع ہو گیا تھا۔ ہم نے میز پر بیٹھ کر کھُرچن کھانی شروع کی لیکن چونکہ اب اپنا مال عرب پیش عرب تھا لہٰذا ایکسوئی اور اطمینان سے سُننے لگے۔

یہ سرور سیّال صاحب تھے۔ عجیب باغ و بہار آدمی تھے۔ تہران میں شاید کوئی بزنس کرتے تھے۔ ایک آدھ غزل بھی اُنہوں نے گائی لیکن محفل کا رنگ دیگر تھا۔ حاضرین میں اکثر زندہ دلانِ پنجاب تھے۔ اُن کی فرمائش ٹپّوں اور بولیوں کے لئے تھی۔ ”ہاں تو سردار صاحب ذرا وہ ہو جائے۔ چِٹّا کُکڑ بنیرے تے۔ نی کاسنی دوپٹے والیئے منڈا عاشق تیرے تے۔“ سچ یہ ہے کہ جس طرح ہندی اور بھاشا میں زنانہ پن غائب ہے، پنجابی لوک شاعری میں مردانہ پن بھرا ہے۔ ایسا کہ پھٹا پڑتا ہے۔ بہر حال اُس رات تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا۔ سرور سیّال کی آواز اور لوگوں کے قہقہوں اور چہچہوں نے سارے ایرانی محلے کو جگائے رکھا ہو گا۔

مینوں لے سے سلیپر کالے

وے جے توں میری ٹور دیکھنی

(مجھے کالے سلیپر دے اگر میری چال دیکھنی ہے)

تینوں لے دیاں سلیپر کالے

نی چاہے میری مَجھ وِک جائے

(تُجھے کالے سیپر ضرور لے کر دوں گا خواہ اِس کے لئے میری بھینس کیوں نہ بِک جائے)

لڈّو ونڈ دی کچہریوں نکال جے

ڈاکے وچّوں یار چھُٹ جائے

(میں لڈّو بانٹتی ہوئی کچہری سے نکلوں اگر میرا یار ڈاکے کے الزام سے بری ہو جائے)

کُتّی مر جائے گوانڈنے تیری

نی بُوہے کولوں ہار موڑیا

(اے پڑوسن خُدا کرکے تیری یہ کُتیا مر جائے جس نے دروازے پر آئے ہوئے

میرے یار کو لوٹا دیا)

حضرات توجّہ! پنجابی شاعر کو دیکھا بھینس کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ آپ اس سے پوچھیں عقل بڑی کہ بھینس تو یقین سے کہنا مُشکل ہے کہ کیا جواب دے گا آپ خود ہی مُنصفی کر لیجئے۔ عقل والے در بدر ٹھوکر کھاتے دیکھے ہیں۔ بھینس دودھ دیتی ہے جس کے سو فائدے ہیں۔ خود پیجئے، دوسروں کے ہاتھ پانی ڈال کر بیچئے۔ اِس کا گوبر بھی بڑی کار آمد چیز ہے۔ بھینس کے آگے موسیقی کے بعض سازوں کی مشق بھی کی جاسکتی ہے۔ عقل کے سامنے ایسی کوئی بات آپ نہیں کر سکتے۔ پڑوسن کی کُتیا یا بنئے کی کُتّیا پنجابی شاعروں کی ولین ہے۔ حضرت بُلھے شاہ نے بھی ایک عورت کی زبانی اُسے بد دُعا دی ہے۔ ”ایہ کُتّی مرے کراڑ دی جہری چوں چوں نت کرے۔“ یہ اس لئے کہ اہلِ دِل کے مُراد پانے کی راہ میں حارج ہوتی ہے۔ پڑوسنوں پر بھی پنجابی شاعر اکثر نامہربان رہتا۔ ہے حضرت بُلھے شاہ اِسی گیت میں کُتّیا کے ساتھ اُن کا گھُن بھی پس گیا ہے۔ ”اور یہ پڑوسنیں بھی اللہ کرے مر جائیں۔ جو نہ مریں اُن کو تَپ چڑھ جائے تا کہ پابندِ مسکن ہو جائیں۔ گھر سے باہر نہ نکلیں۔“

آخر میں سرور صاحب نے مختلف علاقوں کے لوگوں کی بولیوں کی نقل بھی اُتاری۔ مسافر پشاور پشتو سُنتا اور کانوں میں تیل ڈلواتا چلتا ہے۔ لاہوریوں کی خاص بولی بلکہ

بنکار سُنتا ہے۔ پھر پٹیالے کی بولی، دِلّی کی خنداری زبان، کلکتے کی بنگلہ اور آخر میں مدراس کی اگڑم بگرم، ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دُکھنے لگیں۔ ہم نے گھڑی دیکھی۔ آدھی رات کا عمل تھا۔ ٹیکسی کی مُشکل کا خیال کر کے ہم نے خالد کو دامن سے کھینچ گھسیٹا اور ہوٹل اٹلانٹک کی راہ لی۔ یہ محفل جانے کب تک جاری رہی ہو گی، بہر حال اِس نے بہت سا غُبار مسافر کے دِل کا دھویا۔ کرم کر دی عزیزم زندہ باشی۔



ڈاک، لسّی، قیلولہ

ہمارے ایرانی بھائی ترقّی کی دوڑ میں اِتنا آگے نکل گئے ہیں کہ اُن کی بعض چیزیں اُن کا ساتھ نہیں دے سکیں، بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ مثلاً ڈاک کا انتظام، تار کا انتظام، ٹیلی فون وغیرہ کا انتظام۔ ہمیں ایک دوست سے ملنا تھا، سوچا ایک خط لوکل ڈاک سے لکھ دیں کہ ہم ہوٹل اٹلانٹک میں مُقیم۔ ہیں کرم نماز فرود آکہ خانہ خانٹ تست۔ اُس روز نہ سہی اگلے روز مل جائے گا۔ اوّل تو پتا چلا کہ جابجا ڈاک خانے نہیں ہیں۔ لیٹر بکس بھی سڑکوں پر نہ ملیں گے۔ ٹکٹ لفافے بھی دُکانوں وغیرہ پر نہیں ملتے۔ بہت ضرورت ہے کسی ڈاک خانہ میں جاؤ۔ خط لکھ کر وہیں ڈالو اور پھر اللہ کی قُدرتِ کاملہ کا تماشا دیکھو۔ ہم نے ایک ڈاک خانہ ڈھونڈ نکالا۔ سیڑھیوں پر بیٹھے ایک آدمی سے دو آنے کا کاغذ، خط لکھنے کے لئے۔ اُسے بند کر کے احتیاطاً ”مقامی“ بھی لکھ دیا۔ یہ خیر ایک غَلَطی ہماری تھی۔ وہاں مقامی یا مہاجر کو کوئی نہیں سمجھتا۔ شہری لکھنا چاہیئے تھا۔

خط لکھ کر ہم انتظار کرنے لگے کہ اب فون آتا ہے میاں بشیر احمد اختر کا۔ ہوٹل والے سے پوچھتے تھے کہ کوئی بھلا مانس تو نہیں آیا ہمیں ملنے کے لئے۔ یہ خط گرتا پڑتا چوتھے روز اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا اور بشیر صاحب مل گئے ورنہ ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ کتنا بے اخلاق آدمی ہے۔ ہم سے ملتا نہیں کہ کسی کام کو نہ کہہ دیں۔ تار بھی کراچی سے دو دِن میں پہنچتا ہے۔ ایک بات یہ کہ تہران خط لکھئے تو پتہ انگریزی میں نہ لکھئے۔ ایسے خط وہاں دار الترجمہ میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ وہ اُس پتے کو فارسی حروف میں مُنتقل کرتا ہے۔ یونیورسٹی میں ایک پاکستانی طالبِ علم ہیں، عبد القیوم قریشی۔ اُن کا خط گیا۔ انگریزی میں پتہ لکھا ہوا دار الترجمہ میں جو شخص تھا اُس نے اُس انگریزی کی فارسی یُوں بنائی۔ ”ابو القاسم مویشی“ وہ خط اُن کے بورڈنگ ہاؤس کی میز پر ہفتہ بھر پڑا رہا۔ قریشی صاحب خط اُٹھاتے تھے اور حیران ہو کر واپس رکھ دیتے تھے کہ چوپایوں کے خط یہاں کیوں آنے لگے۔ کسی سلوتر خانے یا کانجی ہاؤس میں کیوں نہیں جاتے۔ اور گھر سے میرا خط کیوں نہیں آتا۔ کئی دِن بعد کہیں اُنہوں نے اصل انگریزی پتہ پڑھا اور مکتوب الیہ آدمی کی جُون میں آیا۔

بے شک ڈاک کا نظام ہمارے ہاں بہتر ہے۔ بات یہ کہ ہم نے انگریزوں کے دور صد سالہ سے بہت فیض پایا۔ ایران میں پہلی جنگِ عظیم تک بڑی ابتری تھی۔ بلکہ

قاچاروں کا آخری دور تو سِکھّا شاہی دور تھا۔ محلاتی سازشوں کا، امیروں کے استبداد کا، نفسا نفسی کا، ایک امریکی ماہرِ مالیات مسٹر شوستر پہلی جنگ کے آس پاس، شاید کُچھ پہلے ایران بلائے گئے اور وزیرِ خزانہ بنائے گئے تو حیران ہوئے کہ کسی نے بجٹ کا نام ہی نہیں سُنا۔ آمد و خرچ کا کُچھ حساب ہی نہیں۔ پہلی فائل جو اُن کے پاس آئی یہ تھی کہ شُتر خانے کے لئے تیل چاہیئے اور موٹر خانے کے لئے بھوسے کی ضرورت ہے۔ یہ بہت جُز بُز ہوئے کہ یہ کیا مذاق ہے۔ بعد ازاں کھُلا کہ کوئی مذاق نہیں۔ سیدھی بات تھی۔ تیل اونٹوں کی مالش کے لئے چاہیے تھا اور موٹر خانے کے ملازمین کو تنخواہ بھوسے کی صورت میں ملا کرتی تھی۔ یہ ساری اصلاحات اُن پچاس سال میں ہوئیں بلکہ زیادہ تر رضا شاہ پہلوی کے بعد سے۔ اب تو خیر عالم ہی اور ہے۔ لباس پہلے جبراً مغرب کیا گیا تھا۔ اب اختیاری طور پر ہے۔ جا بجا عورتیں مغربی اسکرٹ پر کالی یا چار خانے کی چادر اوڑھے نظر آئیں گی۔ یہ یا تو دیہاتی ہوتی ہیں یا پُرانی چال کی۔ قاچاروں اور زندوں کے زمانے کے ایرانیوں کی تصویریں دیکھئے۔ کیا شاندار سر سیّدی داڑھے ہوا کرتے تھے۔ اب وہاں داڑھی کا رواج نہیں۔ ہاں سِکھّوں کے ضرور نظر آئیں۔ اور سِکھ تہران میں بہت ہیں۔ موٹروں کے پُرزے بیچتے ہوئے پٹ پٹ فارسی بولتے ہوئے، اِس میں پنجابی کا رَس گھولتے ہوئے۔

ہم جتنے دِن تہران میں رہے لسّی پیتے رہے۔ دوغ کہلاتی ہے۔ تُرکی میں بھی لسّی ہمارا مَن بھاتا مشروب رہا ہے۔ وہاں اِسے آئرن کہتے ہیں۔ کھٹاس لئے ہوئے۔ بوتل میں بند۔ بقدر ذائقہ نمک ڈال لیجئے۔ اے پاکستان لوگو سُنو کہ ایران میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔ لوگوں کو موبل آئل یا بھُٹّے کی اینٹیں یا لکڑی کا بُرادہ نہیں کھلایا جاتا۔ دودھ، دہی اور مکھّن سب خالص۔ تُرکی میں بھی ملاوٹ کا تصوّر نہیں۔ اتّحادِ ثلاثہ میں یہ فخر بس ہمیں کو حاصل ہے۔ صفائی کا حال بھی سُن لیجئے۔ ہمارے لوگوں نے ڈنڈے کے خوف سے چند دِنوں دُکانوں پر جالیاں لگائیں۔ جب دیکھا کہ کوئی نہیں دیکھتا تو اُتار پھینکیں۔ تہران میں کسی شخص کو گوشت کی دُکان کھولنے کی اجازت نہیں ملتی جب تک اُس کے پاس ریفریجریٹر، ڈیپ فریزر نہ ہو۔ یہی انقرہ میں دیکھا۔ قصبات میں جہاں فریج نہیں وہاں بھی صفائی اور جالی کا انتظام ضرور ہے۔ چلو کباب تو خیر ایرانیوں کی مشہور ڈش ہے۔ اُبلے چاول، اُس میں مکھّن کی ٹِکیہ ملایئے۔ ایک انڈا بھی کچّا توڑ کر ڈال لیجئے اور کباب چپٹا چپلی کباب کا سا۔ ساتھ پیاز اور بہت سا سلاد۔ لیکن عام خوراک کباب اور روٹی کہہ سکتے ہیں اور روٹی یہاں کئی بھانت کی ہوتی ہے۔ نرم اور موٹی سی لے کر پتلی کاغذی سی تک۔ یہ رواج اب صرف پاکستان اور ہندوستان میں ہے کہ میاں کو گرم گرم روٹی چاہیئے۔ آدھی رات بھی آئے تو بی

بی چولھے کے پاس کھڑے ہو کر پھُلکے اُتارے گی۔ ایران، افغانستان یا عرب میں کہیں یہ رواج نہیں۔ سالن گھر میں پکاؤ لیکن روٹی نان بائی کے ہاں سے لاؤ۔ سینڈوچ کا رواج بھی یہاں بہت ہے۔ اِسے ساندویچ کہتے ہیں۔ لمبی سی گول ڈبل روٹی کو چیر کر اُس کے اندر جو جی چاہے بھر دو۔ ایرانی سبزیاں بہت کھاتے ہیں۔ کھیرے تو ایک طرح سے قومی غذا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی بھانت بھانت کی ککڑیاں، جڑی بُوٹیاں اور سلاد۔ سب مزے کی چیزیں ہیں۔ ایرانی شام کا کھانا گھر پر نہیں کھاتا۔ شام ہوئی اور بیوی بچّوں کو لے کر گھر سے نکلا۔ کسی باغ میں، کسی حوض پر، کسی نہر کے کنارے یا کسی اور پُر فضا مقام پر ڈیرہ جاڈالا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائی۔ پاس کوئی ریستوران ہو گا، وہاں جا بیٹھے۔ جیسی جیب ویسا کھانا۔ روپے بھر کا یہ لمبا سینڈوچ کہیں سے بھی لے لیجئے۔ پیٹ بھر جائے اور پھر بھی بچ رہے۔ ورنہ گھر سے ساتھ لے لیجئے۔ کسی ایرانی سے شام کو اُس کے گھر پر ملنے کا طے نہ کیجئے۔ اُسے تکلیف ہو گی۔ اُس کے معمول میں فرق آئے گا۔ دوپہر کے بعد بھی ملنے کا طے نہ کیجئے۔ یہ اُس کے قیلولے کا وقت ہے۔ قیلولے کا احوال ہم نے ایران میں دیکھا اور انڈونیشیا میں دیکھا کہ آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ قیلولہ، تو وہ ڈھال تلوار پھینک یہ شعر پڑھتا ہوا لمبا لمبا لیٹ جائے گا۔

تیرے زانو پہ میں سر رکھ کے ابھی سوتا ہوں

انقلاب آئے تو مجھ کو بھی جگانا ساقی

ترکی

۱۹۶۸ء

بیروت کی ایک رات

ہمارا یہ سفر پڑا آپا دھاپی کا ہے۔ جمعے کی دوپہر ڈھل چکی تھی کہ ہمیں انقرہ جانے کا اذن مِلا۔ اِتنی فُرصت بھی نہ تھی کہ پان کل کے لئے لگاتے جائیں۔ میٹنگ جس میں ہمیں شریک ہونا ہے، پیر کی صبح سے ہے لیکن ہوائی جہازوں کی پرواز کا حساب ایسا ہے کہ ہمیں ستائیس گھنٹے بیروت میں رُکنا اور اِنتظار کرنا ہے۔

اتوار کا دِن ہونے کی وجہ سے کوچہ و بازار بند تھے۔ ہم نے پی آئی اے میں ایک صاحب کو فون کیا کہ کیا کریں۔ اُنہوں نے مشورہ دیا یہاں کا شبینہ کلب ”کاسینو لیبان“ ضرور دیکھنا۔ ہوٹل والے سے بات کی۔ اُس نے بھی کہا کہ ”کاسینو لیبان“ نہ دیکھا تو کُچھ نہ دیکھا۔ ایک اور غیر جانبدار مُبصّر تھے وہ بھی بولے کہ کیا کاسینو لیبان دیکھے بغیر چلے جانے کا ارادہ ہے۔ مت تو نہیں ماری گئی۔

لیکن اِس کے لئے تو ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل سے چلنے کا وقت تھا۔

ہم نے نقشہ لیا اور از خود بازار میں نِکل گئے۔ اطلس ہوٹل سے دو تین ٹیڑھی گلیاں طے کر کے الحمرا بازار میں پہنچ گئے کہ مرکزی سڑک یہی ہے۔ پی آئی اے کا دفتر، تھیٹر، سینما وغیرہ بھی یہیں مرکوز ہیں۔ ہم نے ناک کی ساحل سمندر کا رُخ کیا۔ دو تین میل چلے ہوں گے کہ سمندر آگیا۔ بحیرۂ روم جِس کے ساحلِ سمندر کے ساتھ جنوب رویہ چلتے جایئے تو پورٹ سعید پہنچ جایئے۔ ہائے وہ زیتون کے درختوں اور تاک کی بیلوں والا ہرا بھرا ساحل جس پر حیفہ بھی ہے اور العریش بھی جو سارا اپنا تھا اور اب اپنا نہیں۔۔۔۔



ساڑھے پانچ بجے تھے لیکن خاصی دھوپ تھی۔ اِس کے باوجود سیر کرنے والوں

کے غول ساحلی سڑک کے فٹ پاتھوں پر جمے تھے۔ زیادہ پیسے والے لوگ تو اتوار کے روز پہاڑیوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ساحلِ سمندر پر آنے والے غریب غربا تھے اور اُن کی ہی بی بیاں، بہنیں، بچّے، ریڑھی والوں سے روٹیاں، مرمرے بھُٹّے اور تربوز وغیرہ لے کر کھا رہے تھے۔ اِس ہجوم میں عرب دیہاتنیں بھی تھیں اور عرب شہری بھی کہ نیچے کوٹ پتلون ہے اور سر پر عقال باندھے ہیں۔ کئی بزرگ بُڈھے پھونس کی تُرکی ٹوپی میں بھی دیکھے کہ تُرکی میں اِس کا نام کوئی جانتا بھی نہیں۔ پاکستان میں کُچھ وضع دار اِسے ابھی تک سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ یا پھر یہاں یہ نظر آئی۔ ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ مونگ پھلی بیچنے والے سب کے سب افریقی، آبنوس فام، غالباً سوڈانی ہوں گئے۔

الحمرا سے دہنے ہاتھ کو چکّر کاٹ کر ہم نے شارع پیرس پکڑی کہ سمندر کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ بڑی لمبی سڑک ہے۔ لیکن کہاں تک ہماری پیدل بازی کا ساتھ دیتی۔ آخر ختم ہو گئی۔ دو گھنٹہ ہمیں مسلسل چلتے ہو گئے تھے اور اب ہوٹل واپسی کے لئے کسی قریب تر راستے کی تلاش تھی۔ ایک بزرگ نے پوچھا۔ اُس نے کہا "فرانسہ بولتے ہو؟" ہم نے کہا۔ "نہیں۔" بولا۔ "پھر مُجھے معاف رکھو۔ کسی اور سے پوچھو۔" اِس مُلک میں کیا سارے مشرقِ وسطےٰ میں ابھی تک فرانسیسی کا خاصا چلن

ہے۔ آگے بڑھے تو ایک سپاہی پولیس کی وردی میں کھڑا دکھائی دیا۔ سوال یہ تھا کہ اِس سے کیسے راہ پوچھیں۔ عربی ہمیں نہ آئے۔ فرانسیسی سے ہم ناچار۔ چلتے ہوئے جمال الدّین عالی نے ٹوٹکا یہ بتایا تھا کہ لبنان کے لوگ پاکستان پر جان چھڑکتے ہیں، لہٰذا سینے پر (اپنے سینے پر) ہاتھ رکھ کر کہنا انا فی الباکستان، عربی کی لیاقت ہماری بھی اُتنی ہی ہے جتنی عالی صاحب کی ہے۔ تاہم عربی حروفِ جار (سے۔ میں۔ کا۔ کو) وغیرہ کے معنی ہمیں آتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے کہا من الباکستان تو ہو سکتا ہے لیکن فی الباکستان کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں پاکستان میں ہوں۔ بولے اچھّا علامہ صاحب آپ من الباکستان کا مطلب ہی کہہ لیجئے گا۔

پولیس کے بزرگ کے جذبۂ خیر سگالی کو یُوں تحریک دینا تو ہمیں پسند آیا لیکن اپنے ہوٹل کا کارڈ ہم نے سامنے کر دیا جس پر عربی اور انگریزی دونوں حروف میں پتہ لکھا تھا۔ مزید سمجھانے کے لئے کہ آیا یہ سڑک جاتی ہے ہم نے اُنگلی سے اُدھر اشارہ کر کے کہا ہذا؟ یعنی یہ سڑک اِس پر اُس شخص نے نہایت مسالے دار انگریزی میں ہمیں بتایا کہ برادرم یُوں جاؤ اور دوسرے چوک سے یُوں مُڑ جاؤ۔

ہم نے شکریہ ادا کیا اور یُوں روانہ ہو گئے لیکن وہ دوسرا چوک جس سے یُوں مڑنا تھا کہیں نظر نہ آیا۔ آخر ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ ڈرائیور انگریزی داں تھا۔ بولا

جناب میں لئے چلتا ہوں آپ کو اطلس ہوٹل اور بھی ٹور کرا دوں گا۔ میرا نام جوزف ہے۔ فقط تیس پونڈ لبنانی عطا فرمائیں تو آپ کو ایسا تماشا دکھاؤں کہ آپ عُمر بھر یاد رکھیں۔

بات کے مالی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے پوچھا: ”کون سا تماشا؟ کیسا تماشا؟“

فرمایا: ”کاسینو لیبان لے چلوں گا۔ پریوں کے پرے، حوروں کے جمگھٹ اور ہاں اگر وہ تماشا دکھاتے دکھاتے ایک کے بعد ایک اپنے کپڑے اُتار پھینکیں تو کُچھ حیران نہ ہو جایئے گا کیونکہ موسم گرمی کا ہے۔“

لیکن یہ گرمی تو عالمگیر ہے۔ اِس کا تعلّق موسم سے کم، جسم سے زیادہ ہے۔ ہم نے اپنی نظم دیوارِ گریہ میں دو مصرعے یہ بھی لکھے تھے۔

کوئے بیروت و بصرے کے بے آستینو

اپنے جلووں کو اتنا نہ ارزاں کرو

کوئی بات آنکھوں دیکھے بنا لکھ دی جائے تو غَلَط تو ہونی ہوئی۔ آستین اور بے آستینی

دونوں کے لئے پیراہن کی شرط ہوتی ہے۔ کاسینو لیبان میں تولباس بے لباسی کا فینسی ڈریس شو تھا۔ کیا ڈھنڈار عمارت ہے۔ ایک طرف جوا خانہ۔۔۔ دوسری طرف یہ تجلّی گاہ۔ روپے ہاریئے یا نقدِ دِل ہاریئے، دونوں کا معقول انتظام ہے۔ یہ تو خیر ہمیں گمان تھا کہ حالیہ قیامتِ صغریٰ کے بعد ہم کسی عرب مُلک میں جائیں گے تو وہاں ہر شخص سر پر کفن باندھے ہتھیار سجائے لفٹ رائٹ کرتا اور مشین گن کی باڑھ مارتا ملے گا۔ ہاں یہ خیال نہ تھا کہ ہمارے عرب اب بھی مَے پرستی، عُذرِ مستی اور پیش دستی وغیرہ غالبؔ کے تمام قافیوں کو بحُسن و خوبی نِبھا رہے ہوں گے۔ ایک دوست قاہرہ سے آئے ہوئے ملے۔ ہم نے اُن سے کہا کہ اے اُس دیس سے آنے والے بتا۔ وہاں کا کیا حال ہے؟ وہاں تو جہاد کے جیکاروں سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی ہو گی۔ وہاں لہو و لعب والوں پر کیا گزری۔ ابریقِ مَے مستاں کیسے بشکست ہوا۔ قاہرہ کے اُن خوباں کا کیا حال ہے جن میں سے ایک کے متعلّق کرنل محمد خاں نے لکھا ہے کہ اُس شوخ نے آکر دروازہ کھولا تو اُس کے ہونٹوں پر تو مُسکراہٹ تھی لیکن باقی جسم پر کُچھ نہ تھا۔

وہ مُسکرا کر رہ گئے۔

ویسے آپ کا گُزر بھی بیروت سے ہو تو کاسینو لیبان دیکھئے ضرور۔ بے شک تن کی

عُریانی سے بہتر نہیں دُنیا میں لباس۔۔ لیکن یہ اُس تماشے کا فقط ایک پہلو ہے اور زیادہ بھی نہ للچایئے کیونکہ ہوا وہوس کے جھونکے کتنا ہی اُڑانا چاہیں انجیر کا پتّہ اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ بھان متی کے تماشے اِس بازی گاہ میں دلچسپی کی اصل چیز ہیں۔ ظالم ایسے بڑے بڑے سیٹ اسٹیج پر لاتے ہیں اور یُوں منٹ بھر میں بدلتے ہیں کہ دیکھنے والا آنکھیں ملتا رہ جاتا ہے۔ کبھی زمین پھٹتی ہے۔ کبھی چھت شَق ہوتی ہے۔ جہاں کُچھ بھی نہیں تھا آنکھ جھپکتے ہیں وہاں ایک چوپہیّہ گاڑی اسٹیج پر نمودار ہے۔ اِس کے جاتے ہی ایک شیشے کا بڑا حوض اسٹیج پر آتا ہے جس میں کئی عورتیں تیر رہی ہیں۔ ایک موقع پر ایک مرتبان بھی آتا ہے جس میں ایک آرام جان مچھلی کی صورت بند ہے اور شناوری کرتی ہیں۔ اور پھر تو سالم ریل گاڑی چھک چھک کہیں سے نمودار ہو جاتی ہے۔ انجن چھکا چھک چلتا، دھواں چھوڑتا اور سیٹی بجاتا۔ پیچھے ڈبّے لگے ہیں۔ اور یہ عین حاضرین کے درمیان کے پلیٹ فارم سے گُزر جاتا ہے۔ حوریں چھت میں سے نکلتی ہیں اور فرش غائب ہو جاتی ہیں۔ دو منزلہ مکان اسٹیج پر آتا ہے۔ اُس کی دونوں منزلوں پر کمرے ہیں۔ کمروں میں چھپر کھٹ ہیں اور چھپر کھٹوں پر حسینائیں ہیں۔ پھر عین آپ کے سروں کے اُوپر سے ایک بہت بڑا گولہ یا غُبارہ کوئی پندرہ فٹ قُطر کا چھت میں سے نکل کر نیچے آتا ہے اور پنکھڑیوں کی صورت کھِل

جاتا ہے۔ اب دیکھئے تو اِس میں سے بھی کئی رہزنانِ تمکین و ہوش نکلتی ہے اور جلوہ دِکھا کر اُسی غُبارے میں بند ہو کر جہاں سے آئی تھیں ادھر کو غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ کہنا مُشکل ہے کہ اصل مقصود اِس کا سینو کا یہ شُعبدہ کاریاں ہیں یا۔۔۔

خیر میاں آزاد

؎ آج کی رات کا نہ چھیڑ و مذکور

قدر ایمان سمجھتے ہیں مگر آج کی رات

عبرت پکڑنے کا فلسفہ پرانا ہوا۔ متروک ہوا۔ انقرہ و استنبول تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اِس وقت خود حِظ اُٹھاؤ۔۔ دوسروں کو اُٹھانے دو۔

؎ دیکھنا ہے شب عشرت کی نہایت کیا ہے

بزم اُٹھتی ہے کہ ہوتی ہے سحر آج کی رات



از روم و از یارانِ روم

ہم کسی نئے شہر میں جائیں تو ایک مُدّت ذہن نشین کرنے میں لگ جاتی ہے کہ ہم اگر بازار میں ہیں تو ہمارا گھر کہاں ہے۔ کِس طرف کو ہے۔ کِدھر ہے۔ مشرق اور مغرب کا کُچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ ایک روز ہم یہ عزم کر کے صُبح اُٹھے کہ دیکھیں انقرہ کا سورج کیسا ہے؟ ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کئے لیکن سورج میاں نے یہ چال کی کہ پیچھے سے نکل آئے۔ ہمیں خبر اُس وقت ہوئی جب ہمارا سایہ سامنے پڑنے لگا۔ آفاق میاں نے گھر اپنا ایک جگہ لیا ہے کہ اُس کے آگے پیچھے، دہنے بائیں اُوپر نیچے سڑکیں ہیں۔ ہم نے کئی بار اِس خیال سے کہ کبھی تنہا بھی آنا پڑ جاتا ہے اِس گھر کے نواحات کی کوئی نشانی مقرّر کرنے کی کوشش کی۔ پہلے روز ہم نے یہ یاد رکھا کہ گلی کے سِرے پر ایک ٹھیلے پر تربوزوں کا ڈھیر ہے اور پاس ایک گھوڑا گاڑی کھڑی ہے۔ دوسرے روز اُس کی تلاش میں ہم آدھ فرلانگ کا غچّہ کھا گئے۔ تربوز والے نے محض ہمیں

بھٹکانے کے لئے اگلے روز اپنا ٹھیلا کہیں اور جا کھڑا کیا۔ ایسی حرکت گھوڑا گاڑی والے نے بھی کی۔ آفاق نے کہا۔ ایسی چلتی پھرتی چیزوں کی نشانی تو مُلّا نصر الدّین مقرّر کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے ریگستان میں ایک جگہ روپے دبا دیے تھے اور نشانی یہ رکھی تھی کہ عین اُس جگہ بادل کا سایہ تھا۔ اگلے روز دیکھا کہ نہ بادل ہے، نہ اُس کا سایہ ہے اور نہ روپے ہیں۔ پکّی چیز کی نشانی رکھو۔ ہم نے بات گرہ میں باندھی۔ عین گلی کے سامنے ایک دُکان پر پیپسی کولا کا اشتہار لگا تھا۔ پکّا دیوار میں جڑا ہوا تھا لیکن شام تک پیپسی کولا والوں نے اِس قسم کے اشتہار شہر میں جا بجا ہزاروں جگہ پر جڑ دیے۔ آفاق میاں کا کہنا ہے کہ یہ تو پہلے سے جڑے ہیں۔ تمہاری آمد سے اِس کا کُچھ تعلّق نہیں۔ ایسا ہی ہو گا۔ علاقے کا نام بھی کُچھ ٹیڑھا سا تھا۔ ہم نے بہت یاد رکھنے کی کوشش کی لیکن حافظے سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ اِس سے مُشابہ فارسی کا لفظ "کبک دری" معلوم ہوا۔ اِسے بنگالی لہجے میں ادا کیجئے "کوبکو دوری" تو صحیح تو پھر بھی نہ ہوتا تھا لیکن سُننے والا اندازہ کر لیتا تھا کہ مراد kvakli dere سے ہو گی۔ گھر کی دوسری نشانی امریکن ہسپتال ہے جو آفاق کے گھر سے دو گھر چھوڑ کر ہے۔ ہم نے اُسے نوٹ کر لیا اور ایک بار ایک تُرک ڈرائیور کو دکھایا تو اُس نے کہا "اے میری جان مُجھے نہیں معلوم۔" اُس وقت تو ہم اُس کی بے تکلّفی پر گھبرائے۔ بعد معلوم ہوا کہ تُرکی

میں کا ’c‘ مطلب ’ج‘ ہے۔ American کو کوئی تُرک پڑھے گا تو اِس عاشقانہ انداز میں پڑھے گا۔ اِن کے رسمِ خط میں amerikan لکھنا چاہیئے۔ اور بھی آوازیں اِن حروف کی ایسی ہیں جن سے ہم مانوس نہیں۔ ’چ‘ کے لئے ’G‘ کے نیچے ذرا سا شوشہ ڈال دیتے۔ g اور t دال کی آواز دیتا ہے۔ ایک بادشاہ کی تصویر کے نیچے لکھا تھا Abdul mecit۔ خاصا غور کرنے کر پر کھُلا کہ مُراد سُلطان عبدالمجید سے ہے۔ مسجد والدہ سُلطان استنبول میں ہمارے ہوٹل کے پاس ہی تھی۔ اُس کا نام yeni came لکھا جاتا ہے yeni کا مطلب نئ لیکن came کو جامع پڑھنے میں خاصی دقّت ہوئی۔

فارسی ہم نے اسکول میں ماسٹر پچھمن سنگھ اور لالہ مکندی مَل اگروال سے پڑھی تھی۔ دونوں فاضل شخص تھے۔ ایران میں اِسے استعمال کرنا چاہا تو وہاں بڑے بڑے پڑھے لکھے اِس سے کورے نکلے۔ ہمارا مُنہ تکنے لگے۔ پھر بھی کُچھ گزارہ اِس سے چل گیا۔ فرانسیسی ہم اچھّی طرح گھر پر پڑھ کر یورپ گئے تھے۔ لیکن اہلِ فرانس کا لہجہ کُچھ ایسا ناقص ہے کہ کُچھ پلّے نہ پڑا۔ یہ دیکھ کر تو اور بھی افسوس ہوا کہ وہ ہماری فرانسیسی سے نابلد ہیں۔ جب ہم لب کُشا ہوتے وہ ایک بھی لفظ نہ سمجھ پاتے۔ چین میں ہمارے ساتھ ترجمان تھے لہٰذا چینی کے دو تین لفظوں شکریہ،

مزاج شریف اور خُدا حافظ وغیرہ سے کام چل گیا۔ جاپانی کے معاملے میں ہم نے حضرت بُلھے شاہ کی نصیحت پر عمل کیا کہ ایک ہی الف تجھے درکار۔ فقط شکریے کے لئے "آری گاتو گزاری مشتا" پر اِکتفا کی جو خود کئی لفظوں پر مُحیط ہے۔ انڈونیشی کے باپ میں ذہن پر بہت زور دینے کے بعد صرف ایک لفظ یاد آتا ہے۔ "ناسی کورنگ" یہ بھی شاید کسی مسالے دار کھانے کا نام تھا۔ ہم فلپائن، لنکا اور ڈنمارک بھی گئے لیکن وہاں کی مقامی زبانوں کو چنداں قابلِ اعتنا نہ جانا۔ فقط اُن کے نام معلوم کر لئے۔ لنکا میں سنگھالی بولی جاتی ہے۔ ڈنمارک میں ڈینش۔ اور فلپائن میں۔۔۔۔۔ کچھ بھلا سا نام ہے اِس وقت ذہن سے اُتر گیا۔

لیکن تُرکی چونکہ ہمارا دوست اور اسلامی مُلک ہے اِس سے ہمارا تہذیبی اشتراک بھی ہے، لہٰذا تُرکی کی زبان کی طرف ہم نے بطور خاص توجّہ دی۔ ایوت (ہاں) اور یوق (نہ) تو پہلے ہی دِن ہماری زبان پر رواں ہو گئے۔ چوق گزیل (بہت اچھّا) کو ذہن نشیں کرنے میں بھی زیادہ دِن نہ لگے۔ استنبول پہنچتے پہنچتے تو اِس زبان میں جِسے لوگ مُشکل کہتے ہیں ایسا درک ہو گیا تھا کہ بے تکلّف اپنے کمرے سے ہوٹل کے ریستوران کو فون کرتے "آفندم آکّی، شیشہ سوک یعنی اے مسٹر دو بوتل ٹھنڈا پانی۔" اِکّی کا مطلب ہے دو۔ ایک کو بھی تُرکی میں کُچھ کہتے ہیں اور ہمیں بتایا بھی گیا

تھا لیکن وقت پر کبھی یاد نہ آیا۔ نتیجہ جہاں ہمیں ایک بوتل پانی کی ضرورت ہوتی دو آتیں۔ لیکن ہم یہ کرتے کہ بیرے کو ایک بوتل ہاتھ کے ہاتھ واپس کر دیتے کہ یوق (نہیں) یعنی ہمیں درکار نہیں۔ بس ایک رکھ لیتے۔

انسان ہوشیار ہو تو تھوڑے لفظوں سے بہت کام چلا سکتا ہے۔ مُختصر گفتگو میں تو ہم بھی مخاطب کو تُرکی بہ تُرکی جواب دیتے لیکن جہاں بات لمبی ہوئی ہماری تُرکی تمام ہو گئی اور پھر ہمیں اشاروں کی زبان سے مدد لینی پڑتی۔ سیّد آفاق احمد تو ایسے موقع پر اُردُو سے بھی کام لیتے تھے اور تُرکی بولتے بولتے بیچ بیچ میں ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔ بھی کہتے جاتے تھے۔ کیونکہ فقرہ بنانے میں کُچھ وقت لگتا ہے۔ صرف و نحو کا معاملہ ہے مذاق کی بات نہیں۔

احوال آفاق میاں کے گھر کا

انقرہ پہاڑوں میں گھِرا ہوا ایک صاف سُتھرا شہر ہے۔ نیا انقرہ زیادہ پرانا نہیں۔ چالیس برس کا سمجھئے۔ انگورہ البتّہ پُرانا ہے جسے اتاترک نے اپنے انقلاب کا مُستقر بنایا۔ انگورہ کا حِصار اور اُس کے اندر کی آبادی اپنی جگہ ہے لیکن نیا شہر اُس کے دامن میں میلوں تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کُشادہ گلی کوچے۔ صاف مُجلّا دُکانیں۔ شارع اتاترک جو شہر کے بچّوں بیچ گزرتی ہے، بہت خوبصورت ہے اور چوڑی۔ پھر دورویہ کشادہ فُٹ پاتھ سیر کے لائق اور اُن کے ساتھ سرِ راہ ریستوران۔ اُوپر کرمچ کا سائبان تنا ہوا۔ اکثر لوگ اِنہی سرِ راہ ریستورانوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ ہم نے بازار بھی دیکھا۔ سبزی اور پھلوں کی مارکیٹ بھی۔ صفائی دیکھ کر جی خوش ہوا۔ استنبول میں تو اتنا زیادہ الزام نہیں لیکن انقرہ میں تو آپ کو ایک تِنکا بھی سڑک پر پڑا نہ ملے گا۔ آپ نے سگریٹ جلائی تو تیلی سڑک پر پھینکنے کو جی نہ چاہے گا۔ تھوڑے

تھوڑے فاصلے پر ڈرم رکھے ہوئے ہیں۔ اِن میں ڈالئے۔ قصائی کی دُکان بھی آئینہ خانہ ہے۔ گوشت فریج میں بند ہے یا شیشے کے پیچھے لٹکا ہے۔ گرد اور مکھّیوں کا گُزر نہیں۔ سبزی اور پھلوں کی مارکیٹ میں ہر چیز کے بھاؤ کی تختی لگی ہے۔ پوچھنے اور جھک جھک کرنے کی ضرورت نہیں۔ بیچنے والے نے ایک نیلے کپڑے کا ایپرن باندھ رکھا ہے جس میں دو بڑی بڑی جیبیں ہیں۔ ایک میں نوٹ اور نقدی دوسری میں کاغذ کے لفافے سودا ڈال کر دینے کے لئے۔ دودھ نہایت عمدہ ملتا ہے۔ بوتل میں بند۔ میٹھا ڈالے بغیر پی جائیے۔ دہی بوتل بند اور لسّی جو ہر کھانے کے ساتھ پی جاتی ہے۔ اور آئرن کہلاتی ہے۔ بوتل میں جتنی لسّی ہم نے اب کے ترکی میں پی پنجاب میں عُمر بھر میں پی ہو گی۔ نہایت مُفرّح اور خوش ذائقہ۔ مکھّن اور پنیر بھی قسم قسم کا، باافراط، شہد بھی۔

"کیا یہ سب چیزیں خالص ہوتی ہیں؟" ہم نے آفاق سے پوچھا۔

"بالکل۔۔ ناخالص کا یہاں تصوّر ہی نہیں ہے۔"

"لکڑی کا برادہ یہ لوگ پھینک دیتے ہوں گے۔۔۔ اُس سے مِرچیں نہیں بناتے؟"

"نہیں۔"

"لال اینٹیں تو بے کار نہ جاتی ہوں گی۔ ضرور ہلدی کی تعمیر میں کام آتی ہوں گی۔"

"بالکل نہیں۔"

"اور موبل آئل۔"

"موبل آئل موٹر میں ضرور استعمال ہوتا ہے۔ مکھّن یا گھی کے طور پر نہیں۔"

اب اُنہوں نے اشتیاق سے وطنِ عزیز کا حال پوچھا تو ہم نے بتایا کہ ہمارے ہاں تو بھینسوں نے بھی خالص دودھ دینا بند کر دیا ہے۔ کم از کم ہمارے گوالے کا یہی بیان ہے۔ جب کبھی دودھ کے پتلے پن کی شکایت کریں وہ یہی عُذر کرتا ہے کہ حضور کیا کریں۔ بھینسیں ہی نابکار اور بے ایمان ہیں۔ ایسا ہی دودھ دیتی ہیں۔ قُربِ قیامت کی نشانی ہے۔

انقرہ میں بہت سی چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ مثلاً میوزیم، اولوس چوک، گیما کا اسٹور، انگورہ کا قلعہ، اتاترک کا مزار، اور سیّد آفاق احمد کا گھر۔

باقی چیزیں تو ہم نے ایک نظر دیکھیں۔ اِس آخری مقام سیّد آفاق احمد کے گھر کو ذرا تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آفاق ہمارے بہت پُرانے دوست ہیں۔ انگریزی کے انشا پرواز ہیں۔ اِن کے مضامین جو مزاحِ لطیف کی صِنف میں ہوتے ہیں ڈان میں اکثر آتے رہے ہیں۔ صاحبِ طرز آدمی ہیں۔ صرف اندازِ نگارش میں نہیں، زندگی گزارنے میں بھی۔

دیکھا کہ ایک گھر ہے فرش فروش سے آراستہ۔ یہ بڑے بڑے قالین اور مکلّف صوفے، ریسنگ ٹیبل کے نیچے بھی ایک قالین تھا۔ لیکن بیٹھنے کی جگہ کوئی نہ تھی۔ ایک صوفے پر ہم نے تشریف رکھنا چاہا وہاں چنوں اور نمک پاروں کی تھیلیاں رکھی تھیں۔ دوسری پر ٹافیوں اور بسکٹوں کے لفافے دھرے تھے۔ ڈرائینگ روم کے آدھے قالین پر بڑی بڑی لکڑی کی پیٹیاں پڑی تھیں۔ آدھے پر یہ خود صوفے کی گدیاں سر کے نیچے رکھے استراحت کر رہے تھے۔ صوفوں کے دوسرے سیٹ پر اُن کی پتلونیں، قمیص سوٹ پھیلے ہوئے تھے۔ وارڈروب اِس گھر میں کئی ہیں لیکن اُن میں کپڑے رکھنا اور پھر نکالنا بے شک ایک طویل عمل ہے۔ ہمیں دیکھ کر اُنھوں نے ایک کرسی پر سے ایک تربوز اُٹھایا، دوسرے پر سے آڑوؤں کی ٹوکری اور کہا اب بیٹھ بھی جاؤ۔



”یہ کیا ہے؟“ ہم نے لکڑی کے ایک بڑے بکس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ائیر کنڈیشنر ہے اس میں اور کیا ہوتا۔“

”کاہے کے لئے۔“

”گرمی سے بچنے کے لئے۔“

”لگوایا کیوں نہیں؟“

”یہاں گرمی ہی نہیں پڑتی۔ بس احتیاطاً لے لیا تھا۔“

”یہ ریڈیو گرام بھی بڑا شاندار ہے۔ ذرا سنوائیے تو۔“

”مُجھے کہاں لگاتا آتا ہے۔“ آفاق نے کہا۔ ”کوئی آ جاتا ہے تو اُس سے کہتا ہوں کہ بھیّا خبریں سُنوا دو۔ بڑی مہربانی ہو گی۔“

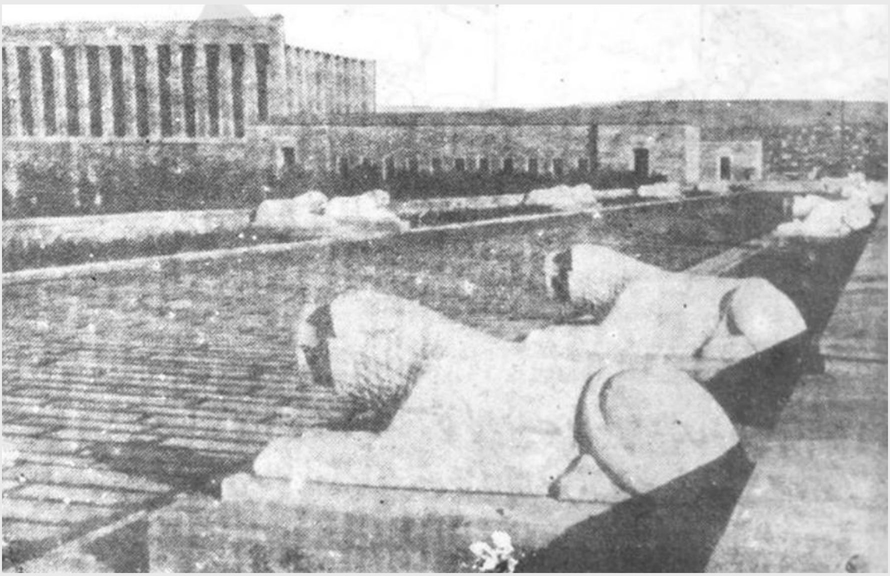
”وہ کیا ہے کونے میں؟“

”سنگر مشین ہے۔ مصرف تو اِس کا کوئی نہیں لیکن پسند آ گئی ہے۔“

ایک واشنگ مشین بھی دھری تھی۔ بولے۔ ”میں تو آئس کریم بنانے کی مشین سمجھ کر لے آیا تھا۔ دھوکا ہو گیا۔“

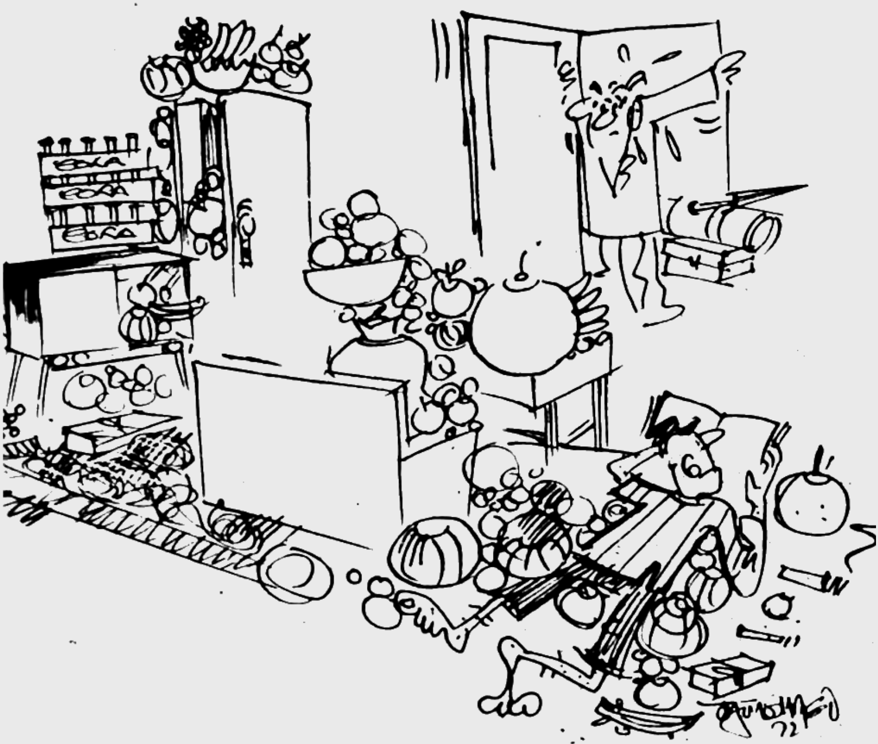
اب ہم نے باورچی خانے میں جھانکا۔ کوکا کولا، دودھ اور دوسرے مشروبات کی کوئی دو سو بوتلیں زمین پر دھری تھیں۔ فریج کا دروازہ بھی آدھا بند تھا۔ اُس میں خربوزے جو مُنہا مُنہ بھرے تھے۔

”یہ بوتلیں یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ ہم نے پوچھا۔



اکثر تو خالی تھیں۔ محض سُستی کی وجہ سے دُکاندار کو واپس نہ کی تھیں۔ بعض میں لسّی

یا دودھ بھی تھا لیکن امتدادِ زمانہ سے بگڑ گیا تھا۔ چند ڈبّے تھے۔ خوبصورت لیبل دیکھ کر اُٹھالائے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا اِن میں جھینگے ہیں اور جھینگے آفاق صاحب نہیں کھاتے۔ بعض بوتلیں دُکانداروں نے واپس لینے سے انکار کر دیا کہ جناب ہم نے تو چھ ماہ ہوئے اِن کا اِستعمال ترک کر دیا تھا۔ اب ہم نئے ڈیزائن کی بوتلیں استعمال کر رہے ہیں۔



تب مہتاب ظفر نے بتایا کہ آفاق صاحب دریا دِلی سے مجبور ہیں۔ کوئی چیز تھوڑی خریدنے کے قائل نہیں۔ چنوں سے اِنہیں خاص شوق ہے۔ بازار گئے اور پانچ سیر چنے اُٹھا لائے۔ پاؤ بھر یا آدھ سیر کھائے۔ باقی خراب ہو گئے۔ ان کو پھینک دیا اور پانچ سیر کی نئ تھیلی ان کی جگہ لا رکھی۔ پھلوں کے باب میں بھی ان کو یہی اصول ہے۔ انگور تین چار سیر اکٹھے لاتے ہیں۔ دو دن کے بعد وہ خراب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو خراب ہو جائیں ان کو پھینکتے جاتے ہیں۔ باقی کے خراب ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ مشروبات وغیرہ خود تو چاہت سے نہیں پیتے، لوگوں کی تواضع کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ کسی ہفتے لوگ نہ آئیں یا اتنا زیادہ پی سکیں تو اِن کا کیا قصور۔ مہتاب ظفر نے کہا۔ ”آفاق صاحب کا گھر تو کباڑی کی دُکان ہے۔“ تب ہم نے اُنہیں سمجھایا کہ ایسا نہیں کہتے۔ کوئی کباڑی سُن لے گا تو مرنے مارنے پر اُتر آئے گا۔ کباڑی کے ہاں بھانت بھانت کی چیزیں بے شک ہوتی ہیں لیکن ترتیب سے خانوں میں لگی ہوئی۔ وہ تربوزوں کو کُرسی پر نہیں رکھتا۔

انقرہ سے جس روز استنبول روانہ ہونا تھا چونکہ پروگرام آٹھ دس روز میں واپسی کا تھا لہٰذا یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ فریج میں جو اتنا کُچھ ٹھُنسا ہے اُس کا کیا ہو گا۔ ہم نے طبیعت پر جبر کر کے خاصا تربوز کھایا۔ ایک پورا خربوزہ بھی کھا گئے۔ آدھ سیر تین

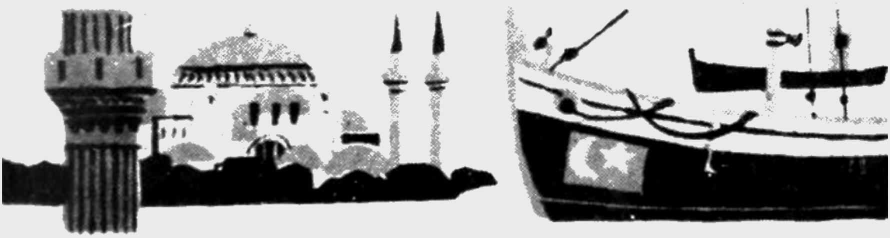
پاؤ آڑو بھی، کُچھ انگور، تین تین چار چار بوتلیں کوکا کولا اور آرینج کی پیں۔ شمیم صبائی متھراوی آ گئے تھے۔ اُن کو بھی زبردستی کھلایا۔ کُچھ پلایا، پھر بھی پورا دستر خوان بھرا تھا۔ فریج می چھ سات درجن انڈے بھی تھے۔ بعضوں میں تو پڑے پڑے بچّے بھی نکل آئے تھے۔

"اب اِس کو اُٹھواؤ۔" ہم نے کہا۔

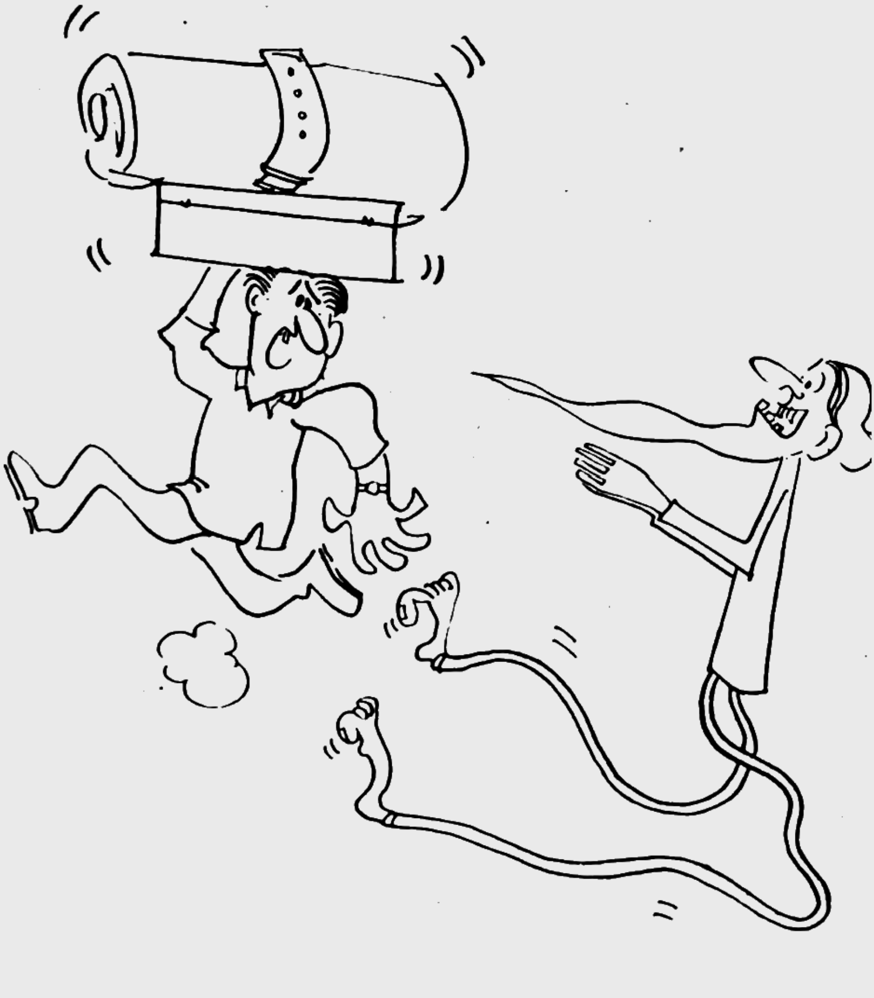
دربان کے لئے گھنٹی بجائی۔ وہ یہ سمجھ کر گول ہو گیا کہ کوئی کام ہو گا۔ آخر نیچے جا کر اُسے تُرکی میں سمجھانا پڑا تب وہ آیا اور سب کُچھ سمیٹ کر لے گیا۔ تین چار پھیرے کئے۔ ڈبل روٹیوں کا انبار پھر بھی باورچی خانے میں پڑا رہا، جو آتی باقاعدگی سے ہیں لیکن استعمال نہیں ہوتیں۔ بعض تو ایک مہینے سے یونہی کاغذ میں لپٹی رکھی تھیں۔

یہ شوق آفاق صاحب کا پرانا ہے۔ کراچی میں تھے تب بھی چنوں، دال، سیبوں، جلیبیوں لڈوؤں، آڑوؤں اور آلوچوں، کھارے اور میٹھے بسکٹوں کی پوٹلیاں لا لا کر گھر میں سجاتے رہتے تھے۔ ایک بجلی کا ٹیبل فین تھا جسے وہ ایک پیپے میں بند رکھتے تھے۔ ہم اُن کے ہاں جائیں تب نکالتے تھے۔ دواؤں کا بھی اِن کو شوق ہے۔ صُلحِ کُل آدمی ہیں۔ کسی طریقۂ طلب سے تعصّب نہیں رکھتے۔ ڈاکٹری دوائیں، یونانی حکیموں

کی معجونیں، ایور ویدک کی پُڑیاں۔ ہومیوپیتھوں کی گولیاں سب لا لا کر اپنی دراز میں بھرتے تھے۔ دو تین ماہ بعد اِن سب کو نکال کر پھینک دیتے تھے تا کہ نئی دواؤں کے لئے جگہ پیدا ہو۔ آج تک ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ ڈاکٹروں، حکیموں کے ہاں جا کر کِس مرض کا بہانہ کرتے ہوں گے۔ لوگ اِن کی انہی اداؤں کے تو قتیل ہیں۔



۱۹٦۸ء کا سفر



کیا دُنیا واقعی گول ہے؟

ہم اِس دھرتی کا گز بنے اور بحرِ ظُلمات میں گھوڑے دوڑا آئے لیکن ہمیں تو ہر چیز چپٹی ہی نظر آئی۔ دُنیا سے زیادہ تو ہم خود گول ہیں کہ پیکنگ سے لُڑھکے تو پیرس پہنچ کر دم لیا۔ اور کوپن ہیگن سے پھسلے تو کولمبو میں آ کر رُکے۔ بلکہ جا کر تا پہنچ کر دم لیا۔ دُنیا گول ہونے پر اصرار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یقین نہ ہو تو مشرق کی طرف سے جاؤ۔ چکّر کاٹ کر مغرب کی طرف سے پھر اپنے تھان پر آ کر کھڑے ہو گے۔ اِس میں ہمیں ہمیشہ ایک بدیہی خطرہ نظر آیا کہ کہیں گولائی کے دوسری طرف رینگتے ہوئے نیچے نہ گر پڑیں کیونکہ ہم کوئی چھپکلی تھوڑا ہی ہیں۔ اس لڑکے کا قصّہ آپ نے سُنا ہو گا کہ آدھ سیر تیل لینے کے لئے کٹورا لے کر گیا تھا۔ کٹورا تھا چھوٹا۔ بھر گیا تو دُکاندار نے کہا "باقی کس چیز میں ڈالوں۔" برخوردار نے کٹورا اوندھا کر کے کہا "اِدھر پیندے کے حلقے میں ڈال دو۔" پیندا اُوپر کئے ہوئے گھر گیا تو ماں نے کہا "بیٹے

میں نے آدھ سیر تیل کو کہا تھا بس اتنا سا؟ بس یہی؟" اس دانشمند نے اُسے بھی اُلٹا کر کہا۔ "نہیں اِدھر بھی تو ہے۔" ہم سوچتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ نہ مشرق ہاتھ میں رہے نہ مغرب۔ کیا عجب سندباد کی طرح کسی نادیدہ جزیرے میں جا نکلیں جہاں کسی پیر تسمہ پا سے مُڈ بھیڑ کا بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا کسی شہزادی مہر افروز کے ہم پر ہزار جان سے عاشق ہونے کا۔ بلکہ پہلا امکان کُچھ زیادہ ہی ہے۔ تاہم اے دوستو اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو ہم دُنیا کے گول ہونے کا ثبوت لینے کو چل دیے۔ گھر سے نکل پڑے جیسے حاتم طائی منیر شامی کی محبوبہ کی فرمائش پر انڈے کے برابر موتت اور کوہِ ندا کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ کل صبح ہم کراچی میں تھے۔ دوپہر ڈھاکے میں۔ رات ہماری بنگال میں گزری اور دمِ تحریر سنگاپور میں ہیں۔ اِن سطور کے زیرِ طبع سے آراستہ ہونے تک جانیے

کون سی وادی میں ہو کون سی منزل میں ہو

عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

رشک آتا ہے کہ دُنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں کہ کبھی قید مقام سے نہیں گُزرتے۔ گوجرانوالہ تک گئے بھی تو دوسرے روز گھر لوٹ آئے۔ ہم سے پوچھیۓ تو جو مزا اور

تھرِل ململ کا کُرتا پہن قوام والا پان کلّے میں دبا، ٹانگ پر ٹانگ دھرے گھر میں داستان امیر حمزہ پڑھنے اور لمبی تان کر سونے میں ہے وہ جگہ جگہ مارے مارے پھرنے میں کہاں۔ قیام کی راحتیں اور برکتیں کہاں تک بیان کی جائیں۔ نہ پاسپورٹ کی فکر۔ نہ ویزا کے لئے بھاگ دوڑ۔ نہ فارن ایکسچینج کا ٹنٹا۔ نہ ہوائی کمپنیوں کے دفتروں کے پھیرے کہ بھائی ایک سواری ہم بھی ہیں۔۔۔۔ بٹھالو۔۔۔ ہمیں کہیں چندے قیام کا تجربہ ہو تو ایسا زبردست قیام نامہ لکھیں کہ لوگ حریفوں کے سفر ناموں کو بھول جائیں۔۔۔ اے ناظرین۔۔۔ کبھی سفر کا ارادہ نہ کرنا۔ اجنبی دیس میں طرح طرح کے خطرات ہوتے ہیں۔ ٹیکسی والے ہیں۔ چور اُچکّے ہیں۔ سامان لوٹتے والے۔ صبر و قرار لوٹنے والے وغیرہ۔۔۔۔۔ قُلی وغیرہ قسم کی چیز بھی باہر کے مُلکوں میں کم ہی ملتی ہے۔ انسان کو اپنے سوٹ کیس اور بقچیوں کے علاوہ اپنے ناز بھی بالعموم خود ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔ پھر ہمیں اپنے اسلام کی سلامتی کی بھی فکر ہوتی ہے۔ اوروں کی ہم نہیں کہتے، ہمارا اسلام کُچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ زمینداروں کی حمایت۔ زرداروں کی کاسہ لیسی۔ گھی میں موبل آئل اور ہلدی میں اینٹیں ملانے۔ جھوٹ بولنے۔ کم تولنے وغیرہ سے اِسے کوئی گُزند نہیں پہنچتا۔ ہاں مشین کا کٹا ہوا گوشت اِس کے لئے سخت مُضِر ہے۔ خود ہمارے شہر میں ہزاروں

لوگ ایسے ہوں کہ شام کو شراب پینے بیٹھتے ہیں تو اُس کے ساتھ فقط ذبیحہ کھاتے ہیں۔ رشوت کا پیسہ بھی بغیر بسم اللہ کئے اپنی جیب میں نہیں رکھتے اور جوئے کا داؤں بھی دُعائے قنوت پڑھے بغیر نہیں لگاتے۔ بے شک ایمان کسے عزیز نہیں ہوتا۔ اپنی سی احتیاط تو کرنی ہی چاہیے۔

اور کراچی یونیورسٹی والو۔۔۔ نہ دو ہمیں ڈاکٹر کی ڈگری۔ ہم ڈاکٹر ہو ہی گئے۔ یہاں کے لوگوں کا ہمیں ڈاکٹر انشا کہتے ہوئے مُنہ سوکھتا ہے۔ ہم بھی اپنے دستخط کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا نہیں بھولتے۔ اجمال اِس تفصیل کا یہ ہے کہ ہم جس قافلۂ سخت جان میں سفر کر رہے ہیں اُس میں کُچھ تُرک ہیں، کُچھ ایرانی۔ قریب قریب سبھی ڈاکٹر۔ پاکستانیوں میں فضل الباری صاحب۔ مشرقی پاکستان کے وزیرِ صحت ہیں یعنی ڈاکٹروں کے بھی ڈاکٹر۔ مسئلہ فقط بیگم وجیہہ ہاشمی کا تھا کہ اپوا کی انٹر نیشنل سیکریٹری ہیں اور اسلام آباد کی رہنے والی ہیں، یا پھر ہمارا۔۔۔ لوگوں سے تعارف میں بڑی دقّت ہوتی تھی۔ آخر ایک مُختصر سی اور سنجیدہ سی کانوکیشن میں ہم نے اُنہیں اعزازی ڈاکٹر کی ڈگری پیش کی اور اُنھوں نے ہمیں ڈاکٹریٹ کے خریطے سے نوازا۔۔۔ اُنہیں اتنی دواؤں کے نام یاد ہیں اور اُن کے نُسخے کہ ڈاکٹر بھی اُن کے تلمّذ میں فخر محسوس کریں۔ لہٰذا اُن کی ڈاکٹری بے غُل و غشی چل جاتی ہے۔ ہم

میڈیکل ڈاکٹروں کے سامنے علم و ادب کے ڈاکٹر بنتے ہیں اور کوئی ادب و فلسفہ کا سوال کر بیٹھے تو میڈیکل ڈاکٹر ہونے کا عُذر کرتے ہیں۔ ایک بزُرگ نے دونوں طرح کے سوالات شروع کر دیئے تو ہمیں ہومیوپیتھی میں امان ملی اور ہمیں اُس کے فضائل پر تقریر کرنی پڑی۔ ایک بار تو دانتوں کا ڈاکٹر بھی بننا پڑا اور ڈاکٹر طیب محمود کی بتائی ہوئی اصطلاحیں کام آ گئیں۔ بہر حال ہم پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ ہم اور ڈاکٹر وجیہہ ہاشمی پاکستان لوٹیں تو ہمیں باقاعدہ ڈاکٹر کہہ کر بُلایا جائے۔ جب دوسرے مُلکوں کے لوگوں نے قبول کر لیا ہے تو ہمارے پیارے ہم وطنوں کو اِس پر ہرگز اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔

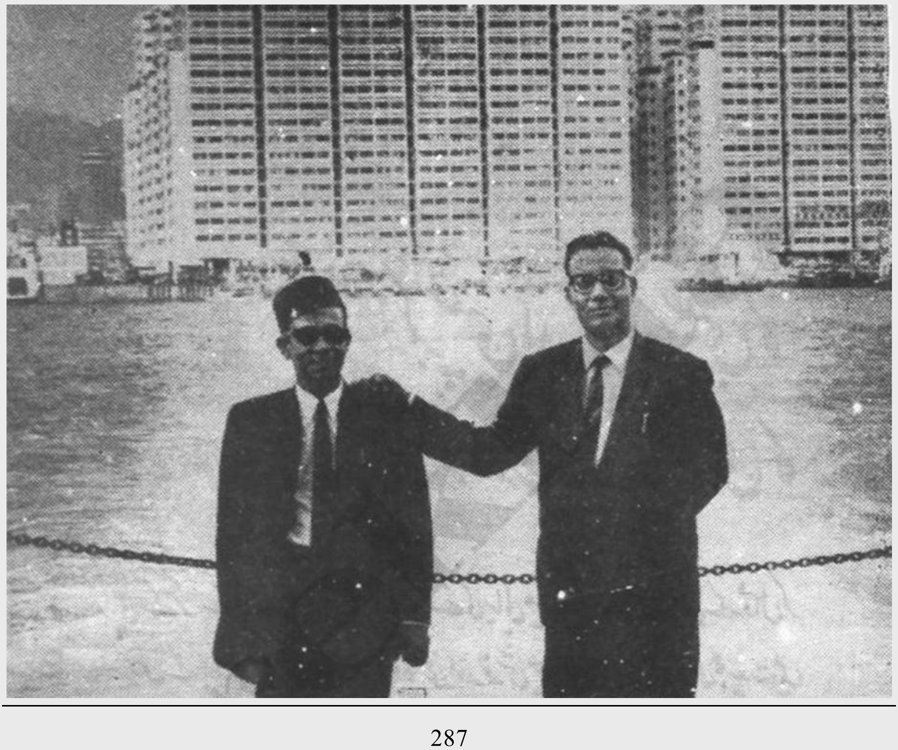
ذکر چینی اور خوبانِ چینی کا،
بوری کا اور باری کا

کراچی کے ترسے ہوئے ہم آج کل اپنی چائے کی پیالی میں چار چار چمچے چینی کے ڈال کر پیتے ہیں اور اِس کے بعد پھانکتے الگ ہیں۔ وہ تلخی اور تُرشی جو پچھلے دِنوں ہماری طبیعت میں پیدا ہو گئی تھی میٹھا کھانے سے رفتہ رفتہ زائل ہو رہی ہے۔ وطنِ عزیز میں ہم نے کیا کیا کھکھیڑیں نہیں اٹھائی۔ گُڑ پیا، نمک پیا، خُونِ جگر پیا، اُس شہد کی بوتل تک ختم کر دی جسے کبھی کبھی اپنی غزالوں کے دیوان پر لگا کر چاٹا کرتے تھے کہ اِس کا اور تو کوئی مصرف نہیں۔ ابھی کُچھ روز پہلے تک بازار میں ایسا شہد بخوبی مل جاتا تھا جس میں چینی کے ڈلے تیر رہے ہوتے تھے۔ اب دُکاندار کے پاس جایئے تو کہتا ہے حضور اُسے اب بھول جایئے۔ خالص لینا ہے تو لے لیجئے۔ سو وہ ہمارے کِس

کام کا۔ ہمارے ایک کالم میں شربت بزوری اور شربت دینار کا ذکر پڑھ کر ہمارے ہمدرد حکیم محمد سعید دہلوی نے ہمیں اُن کی ایک ایک بوتل بھجوادی تھی اور ایک ڈبیہ خمیرہ عنبری جواہر والا کی۔ اُنہیں ہم نے ایک طرف ڈال رکھا تھا۔ اِن دِنوں یہ بھی خوب کام آئیں۔ چائے میں ایک ایک چمچہ اِن شربتوں کا ڈالئے اور جی کڑا کر پی جایئے۔ لوگوں نے ثواب کے شکّر نہ ہونے سے شبِ برات تک نہیں منائی۔ لیکن ہماری شبِ برات دھوم دھام سے ہوئی۔ گھر میں سب نے ایک ایک چمچہ خمیرہ

عنبری جواہر والا نوش کیا اور الحمد پڑھی۔

کیتھے ہوٹل سنگا پور۔۔۔ جس میں ہم فروکش ہیں، یہاں کے مُمتاز ہوٹلوں میں سے ہے۔ نیچے اِس کے کیتھے سینما ہے اور سوئمنگ پول اور نہ جانے کیا کیا۔ رومانی جوڑوں کے پرے کے پرے اِن گلیاروں میں گھومتے ہیں۔ اگر کوئی تنہا چلتا ہے تو یہ اُس کا قصور ہے۔ شاعر تو دراز دستی کو تہ آستیناں کو روتا تھا۔ یہاں لباس پر بے لباسی



رشک کرتی ہے کیوں کہ اشارہ اور استعارہ ہمیشہ تشریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ یہ چینی اکثریت کا شہر ہے لہٰذا خوبان بھی یہاں کے چینی ہی ہیں۔ اُوپر کے لباس کی بالائی حد روز بروز نیچے کھِسکتی ہوئی اور نیچے کا لباس روز بروز سکڑ تا اُوپر چڑھتا ہوا۔ اِس ندی کے دونوں کنارے جب بالکل ہی مل جائیں گے تو دیکھئے اِس میں کتنے سفینے ڈوبتے ہیں۔ ایک سے ایک دُشمنِ ایمان و آگہی۔ پِلّا مار کے دیوا بجھاتا ہوا۔ لیکن آزاد، آنکھیں ہماری باقی ان کا۔

اس دِل کو نہ لو گو بھٹکاؤ

یہ دِل ہے کسی کے بندھن میں

ہوٹل کی لابی میں ایک بڑے میاں تھوڑا لنگڑاتے چھڑی ٹیکتے کسی نہ کسی کو گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کسی نے بتایا کہ یہ کراچی میں جج رہ چکے ہیں تو ہم نے بھی اُن سے کلام کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ عُمر اپنی ۷۳ سال بتائی اور نام مسٹر ڈیوس۔ کراچی میں یہ کلکٹر تھے۔ کوئی آدھی صدی پہلے ۱۹۲۳ء میں۔ ہم سے سندھی بولنے لگے۔ ہمیں اُنہوں نے ہدایت کی اُن کا پیغام دُنیا کو پہنچا دوں۔ کامن ویلتھ کا ایک وزیرِ اعظم ضرور ہونا چاہیے۔ جس روز ہو گیا اس روز تمام جھگڑا ختم۔ ہم نے پیغام پہنچا دیا

اب اُس کا مطلب کیا ہے آپ جانیں یا مسٹر ڈیوس جانیں۔ کیتھے ہوٹل ہی میں رستے میں کارڈ لکھ کر پوچھ لیجئے۔

فضل الباری صاحب مشرقی پاکستان کے وزیرِ صحت کہ ہمارے ساتھی اور ہم سفر ہیں، بہت نیک آدمی ہیں۔ ایسے کہ چائے تک نہیں پیتے۔ زیادہ تر اپنے میں کھوئے رہتے ہیں۔ پاجامہ اور شیروانی پہن کر نکلتے ہیں تو سبھی کی آنکھیں اُن ہی پر ہوتی ہیں۔ کبھی روپے پیسے کا حساب نہ کر سکے۔ آج سنگاپور سے روانگی ہے لیکن سنگاپور کا ڈالر آج تک اُن کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم نے کئی بار بتایا کہ ایک امریکن ڈالر میں تین سنگاپوری ڈالر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ہر بار سنگاپور کے ڈالر کو امریکہ کے ڈالر میں بدلتے ہیں اور پھر اُسے روپوں میں نوٹ نکال کر دکھاتے ہیں کہ دیکھو تو کتنے کا ہے۔ ایک روز تو قُلی کو سو ڈالر کا نوٹ ٹِپ دے چلے تھے۔ ایک ڈالر کا سمجھ کر۔ ہم نے بروقت روک لیا۔ فرماتے ہیں کہ یہ تو ڈالر ہیں، وطن میں روپے کبھی نہیں گِن سکا۔ ہم نے ایک بار گِن دیئے تو بولے تُم تو بہت لائق آدمی ہو۔ بڑا حساب جانتے ہو۔ اُنہیں کیا معلوم کہ ہم بھی اپنے روپے دوسروں سے گِنواتے ہیں۔ اِس لحاظ سے فضل الباری صاحب کو اپنے صوبے کا وزیرِ خزانہ ہونا چاہیئے۔ کیا عجب ہو ہی جائیں۔ حلم اور خاکساری کے ایسے پُتلے بہت کم ہم نے دیکھے ہیں۔ پاکستان کا سفارتی نمائندہ اُن کو

لینے پہنچتا ہے۔ وی آئی پی روم کھلواتا ہے۔ اپنے ہاں ٹھہرانے کی پیش کش کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں گئے۔ چونکہ اپنے کمرہ کا نمبر بھول جاتے ہیں اِس لئے ہمیشہ اپنا کمرہ ہمارے کمرے کے برابر لیتے ہیں اور کہتے ہیں مُجھے ساتھ لے کر باہر نکلنا۔ بھولنا ہمارا بھی مشہور رہے۔ ایک روز فون پر ناشتے کا آرڈر دیا تو کمرہ نمبر باری صاحب کا بتا دیا۔ جب ہمارے کمرے میں ناشتہ نہ آیا تو مینجر کو ڈانٹا۔ اصل میں ناشتہ ہمارا باری صاحب کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ اپنا ناشتہ کھا چُکے تھے۔ یہ دوسرا بھی بے خیالی میں چٹ کر گئے۔ ہم نے صورتِ حال بتائی تو بولے وہ میں بھی حیران تھا کہ مُجھے بھوک کیوں نہیں ہے۔

سنگاپور میں چوکیدار کا مطلب ہے سِکھ اور سِکھ کا مطلب ہے چوکیدار۔ اگرچہ بہت سے بزنس بھی کرتے ہیں۔ جس دُکان یا بینک کو دیکھئے سامنے اسّی نوّے برس کا کوئی دقیانوسی سِکھ بابا بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ بھویں لٹکی ہوتی ہے نہ ہاتھ میں طاقت۔ نہ آنکھوں میں دم۔ پاس پڑی لٹھیا بھی نہیں اُٹھا سکتے لیکن شاندار داڑھی اچھّی لگتی ہے۔ سجاوٹ کے لئے بِٹھا رکھے ہیں۔ ایک دو سے ہم نے بھی بات کی اور جی خوش



ہوا۔ ملائی بھی بول لیتے ہیں اور چینی بھی لیکن پنجابی کی ملاوٹ اُن میں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اِن سے راستہ مت پوچھیئے۔ پتہ غَلَط بتاتے ہیں کیونکہ خود اُنہیں بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ایک سے ہم نے دریافت کیا کہ باباجی یہ کیا دفتر ہے جس کے

سامنے آپ بیٹھے ہیں۔ بولے ”آپاں نوں تے پتہ نہیں۔ آپاں تے اتھے نوکر ہاں۔ تنخواہ لیندے ہاں۔“یعنی ہماری جانے بلا۔ ہم تو یہاں نوکر ہیں۔ تنخواہ لیتے ہیں۔

ہم ٹھہرے میلوں ٹھیلوں میں گھومنے والے سیلانی دہقانی، پیدل چلنے کا ہمیں ہوکا ہے۔ صحرا کی خاک مجنوں سے چھنوایئے اور پھر ہم سے چھنوایئے۔ پھر منصفی کیجئے کہ کون زیادہ اچھّی اور باریک چھانتا ہے۔ کراچی کی سڑکیں جو روز مرمّت کی محتاج رہتی ہیں اُس میں ہماری ترکتازی کو بہت دخل ہے۔ جتنی جلدی ہمیں جوتا بدلنا پڑتا ہے اُتنی جلدی تو صاحبِ فہم سیاست دان پارٹی بھی نہ بدلتے ہوں گے۔ القصّہ شائستہ اور آرام طلب لوگوں کے ساتھ ہمارا گزارا نہیں۔ یہاں ہم نے اپنے ہمراہیوں سے کہا یار چلو تمہیں پاسامالم میں گھمالائیں۔ سنگاپور کی شبینہ گُزرہی دِکھا لائیں۔ لیکن کوئی بروئے کار نہ آیا۔ سنگاپور میں انگریزی عام سمجھی جاتی ہے لیکن بالعموم غَلَط اور اُلٹی لہٰذا اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے جب ہم نے کہا میاں ہمیں پاسامالم میں چھوڑ آؤ تو اُس نے ہمارے ساتھ وہی کیا جو خضر نے سکندر کے ساتھ کیا تھا۔ ایک چکّر ہمیں دیا اور پھر ہمارے ہوٹل کے سامنے لاکھڑا کیا۔ طبیعت بہت بے مزہ ہوئی۔ میاں محفوظ یاد آئے۔ یہی سنگاپور تھا اور یہی گلیاں۔ ستمبر کی چاندنی میں رَت جگا ہوتا ہے۔ اب ہم ہیں اور ہماری تنہائی ہے۔ اے غمِ دِل کیا کریں۔ اے وحشتِ

دِل کیا کریں۔ آج ہم نے اپنا گرم سوٹ اُتار پھینکا۔ قمیص پتلون میں نکل گئے۔ یہ بازار۔ وہ بازار۔ اور جب لوگ باگ دُکانیں بند کر گھروں کو سدھارے تو ہم نے ایک سِکھ بھائی کو پکڑا اور کہا سردار جی اب کِدھر جائیں۔ اُس عزیز نے جانے ہمیں کیا سمجھا کہ ہماری اچھّی بھلی پنجابی کے جواب میں اُردو میں مُنہ مارنا شروع کیا کہ ”اِدھر سے سجے کو جایئے۔ اگاں جا کے کھمبے کو بھوں جایئے۔ جتھّے لائٹاں نظر آئیں اوتھے رُک جایئے اوہ چائنا ٹاؤن ہے۔ دُکاناں ساری رات کھُلی رہندی ہیں۔“ خریدا ہم نے چائنا ٹاؤن میں کُچھ نہیں بس بھاؤ پوچھتے رہے۔ ایک جگہ البتّہ پھنس گئے۔ ایک قمیص کے ایک بھلے مانس نے ساڑھے بارہ روپے لگائے۔ ہم نے پانچ روپے کہے وہ ہنسا۔ ہم آگے چل دیئے لیکن اُسے ہماری خاطر منظور تھی۔ تھوڑی دور آکر پکڑا اور کہا لایئے چھ روپے دے دیجئے۔ ساڑھے پانچ سہی۔ اچھّا تو پانچ ہی لایئے۔ قمیص کی ایسی بات نہیں اُس کا دامن تو زود یا بدیر چاک ہونا ہی ہے۔ آگے سے ہو یا پیچھے سے ہو۔ ہاں پاؤں کے چھالے گھاتے میں رہے۔ جنھیں ہم ابھی ابھی پھوڑ کر بیٹھے ہیں۔ دِل کے پھپھولوں کا ذکر اخبار میں کیا کریں۔ سارے لوگ پڑھتے ہیں۔



تری گٹھڑی کو لاگا چور رے

ہم نے ہوٹل والوں سے حضرت مجذوب مرحوم کی زبان میں بہت کہا:

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ

یہ عشق کی توہین ہے، اعزاز نہیں ہے

لیکن اُن لوگوں نے کیا تو اتنا کہ ہمارا کمرہ تیسویں منزل سے اُتار کر انیسویں منزل کا کر دیا۔ اس سے نیچے ہمیں جگہ دینا ہماری شان سے فروتر سمجھا۔ اِس کے علاوہ جگہ بھی نہ تھی۔ ہانگ کانگ میں یہ ٹورسٹ سیزن ہے۔ آدمی پہ آدمی چڑھا ہوا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہانگ کانگ کے دو حصّے ہیں۔ ایک تو سرزمینِ چین کی جنوبی نوک جِسے کولون کہتے ہیں۔ خریداری کا مرکز یہی ہے۔ دوسرا وکٹوریہ کا جزیرہ جس

تک کے لئے فیری (بیڑی) سے سمندر عبُور کرنا پڑتا ہے۔ یُوں سمجھئے کہ کولون کراچی کی کیماڑی ہے اور وکٹوریہ یعنی اصل ہانگ کانگ منوڑا۔ لیکن اِس مشابہت کو بس یہیں پہ ختم جانئے۔ ہم پہلے دوبار ہانگ کانگ آچکے ہیں لیکن کولون ہی میں ٹھہرا کئے۔ اب کے ہمارا ہوٹل پیشگی بُک تھا۔ یہ جزیرہ ہانگ کانگ پر ہی ہے جو فیشن ایبل آبادی کا مرکز ہے۔ بڑے بڑے بینک یہیں ہیں۔ سرکاری دفتر بھی قریب قریب سارے اِدھر ہی جانئے۔ انگریزوں کی عظمتِ رفتہ کے نشانات بھی یہیں ہیں۔ وہ بُلند و بالا عمارتیں کہ انیسویں صدی کی انگریزی صولت کی علامتیں تھیں۔ انگریز ہونے کو اب بھی یہیں ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ چینیوں کی مہربانی یا مصلحت جانئے کہ طرح دیئے جا رہے ہیں ورنہ وہ جس دِن چاہیں اپنی اِس متاعِ گُم گشتہ کو جو انگریزوں نے کوئی سوا برس پہلے دھوکے دھڑی اور دھونس سے ہتھیا لی تھی کسی بھی وقت واپس لے سکتے ہیں۔

ہانگ کانگ ہلٹن بلادِ مشرق کے ہلٹن ہوٹلوں کا سرتاج ہے۔ آدھی رات کا عمل ہے اور ہم اِس کی کھڑکی میں سے دُور پہاڑی کی جگ مگ روشنیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ نظّارہ بھولنے والا نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے دیکھے جایئے۔ پہاڑی کی چوٹی تک دولت والوں کے مکانوں اور بنگلوں اور بیس بیس پچیس پچیس منزلہ عمارتوں کا سِلسِلہ چلا گیا ہے۔

سمندر کی کھاڑی کا ایک حصّہ بھی یہاں سے نظر آتا ہے۔ جاگنے والے نیچے لابی میں بیٹھے ہوں گے یا نائٹ کلب میں اپنے غموں کو غَلَط یا صحیح کر رہے ہوں گے۔ جو کمروں میں ہیں وہ پڑھتے پڑھتے سو گئے ہوں گے۔ اِلّا اِس مسافر تنہا کے جو رفتہ اور آئندہ کی فکروں کا اسیر اور خوابوں کا مبتلا ہے۔ ریڈیو پر بڑا سافٹ میوزک بج رہا ہے جو ہوٹل کے بال روم سے آ رہا ہے۔ صُبح کے جھٹ پٹے تک یونہی بجتا رہے گا۔ نیم روشن کمرے میں سے بھی یادوں کے غُبار اُٹھ رہے ہیں۔

جانے اِس کمرے میں کیا لوگ تھے ہم سے پہلے



اِس کمرے میں ہم کیسے رہتے ہیں اور کتنے پیسے ہیں یعنی جاتے وقت دے کر اپنا سامان اُٹھا پائیں گے اِسے جانے دیجیئے۔ اتنا جان لیجیئے کہ ہمارے مُلک میں اچھّے خاصے ملازمین کی ماہوار تنخواہ یہاں کے روزانہ خرچ سے کم ہے۔ کل ہم نے بیرے کو بُلا کر کہا میاں ہمارا کوٹ ذرا استری کرا دو۔ بولا ضرور ضرور۔ ہم نے کہا ہدیہ اِس کام کا کیا ہو گا۔ معلوم ہوا گیارہ روپے۔ ہم نے کہا ہم سوٹ خریدنا نہیں چاہتے، نہ ڈرائی کلین مقصود ہے۔ فقط استری کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ بولا جی ہاں استری ہی کی بات ہے ویسے ڈرائی کلین تو بہتر ہے۔ ساڑھے بیس روپے میں ہو جائے گا۔ ہم نے کہا آج دیر ہو گئی کل دیں گے۔ اُس کے جاتے ہی ہم نے اُسے تہہ کر کے تکیے کے نیچے رکھا۔

نرخ نامہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹائی ڈرائی کلین کرانے کے بھی ساڑھے چار روپے ہوتے ہیں۔ہاں اس پر استری آپ فقط سوا روپے میں کرا سکتے ہیں۔ قمیص بھی ہم ہر دوسرے روز دھو کر ڈال دیتے ہیں اور صُبح بیرے آمد سے پہلے اُٹھا لیتے ہیں کیونکہ قمیص دُھلائی تین روپے ہے۔ ریشمی قمیص کی پونے چار روپے۔ بنیان ڈیڑھ روپے میں دُھلتا ہے اور موزہ بھی۔ فقط رومال کے معاملے میں رعایت کی جاتی ہے۔ بس بارہ آنے۔ اگر ہمیں یہاں کُچھ دُھلوانا پڑا تو شاید ایک آدھ رومال دھلوا لیں۔ اپنی اپنی استطاعت کی بات ہے۔ انڈے ہم نے ڈھاکہ میں کھا لئے۔ اب پاکستان واپسی کے بعد پھر سہی۔ کیونکہ ناشتے میں لیں تو وہ ساڑھے بارہ روپے کا ہو جاتا ہے۔ ہم کانٹینینٹل بریک فاسٹ لے لیتے ہیں۔ ایک بند قسم کی چیز۔ تھوڑا سا مکھّن اور چائے۔ ساڑھے سات روپے۔ کہیں بیرے نے سلام کر دیا تو ٹِپ ملا کر آٹھ روپے۔ قرض کی پیتے ہیں مَے لیکن سمجھتے ہیں کہ ہاں۔۔۔ ہم نے یہ مانا رہیں ہلٹن میں پر کھائیں گے کیا۔ واضح رہے کہ یہ رونا اپنی بے زری کا ہے۔ ہوٹل کے گراں ہونے کا نہیں۔ کیونکہ اپنے ہاں انٹر کانٹینینٹل کا بھی یہی حال ہے۔ جس کو ہو دین و دِل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔

فضل الباری صاحب جو اپنے پیسے ہم سے گِنواتے ہیں اور ہانگ کانگ کی کرنسی سے

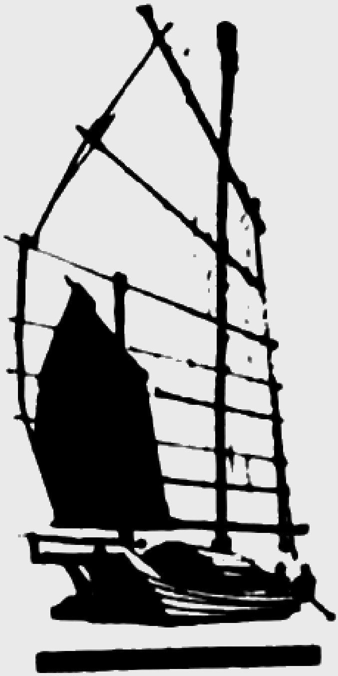
ابھی تک سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ وزیرِ خزانہ ہوں نہ ہوں کامرس منسٹر بہت عمدہ ہو سکتے ہیں۔ اِن کے جوہر آج کھُلے۔ ویسے تو وہ کوئی چیز خریدنے کے قائل نہیں اور ہم اُن کی حُبّ الوطنی کو قابلِ تقلید جانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کوئی چیز مت خریدو۔ پاکستان میں مہنگی سستی مل جاتی ہے۔ کیوں اپنا زرِ مبادلہ گنواتے ہو۔ مُلک کو اِس کی ضرورت ہے۔ لیکن آج ہم اُنہیں بازار کھینچ لے ہی گئے۔ فرمانے لگے چیزیں پسند تُم کرو بھاؤ تاؤ ہم پر چھوڑ دو۔ جانے کون سی چیز تھی دُکاندار نے اُس کے نوّے ڈالر مانگے۔ ہم نے باری صاحب سے اُردُو میں کہا کہ پچاس سے شروع کرنا چاہیئے لیکن اُنہوں نے چالیس ڈالر دام لگائے۔ دُکاندار نے بہت زور مارا کہ یہ ساٹھ کر دیں۔ پچاس کر دیں۔ پینتالیس کر دیں۔ اکتالیس کر دیں۔ لیکن باری صاحب نے کہا چالیس سے ایک دھیلہ زیادہ نہیں۔ آخر اُس نے ہتھیار ڈال دیئے تو باری صاحب نے کہا ایسے بد معاملہ لوگوں سے چیز خریدنی ہی نہیں چاہیئے اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے۔

سنگاپور کے بازاروں سے ہم واقف تھے۔ وہاں چیزیں اچھّی خاصی مل جاتی ہیں بلکہ کپڑا زیادہ اچھّا وہیں ملتا ہے۔ لیکن باری صاحب نے کہا ہانگ کانگ سے لینا۔ ہانگ کانگ میں قیمتوں کا تعیّن اپنے ذمّے لے لیا تو ہمارے کُچھ خریدنے کا سوال ہی نہ رہا۔

ایک روز ضرور جب وہ آرام کر رہے تھے ہم چوری چھُپے بازار سے چند چیزیں مول لے آئے۔ ورنہ اُن کا تو کہنا ہے کہ ٹوکیو میں دیکھیں گے۔ بلکہ ڈھاکہ آنا وہاں یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہم ہانگ کانگ سے اُسی شان سے جائیں گے جس طرح سکندر دُنیا سے گیا تھا۔ یعنی خالی ہاتھ۔

سنگاپور کی طرح یہاں بھی سکھوں کو لال وردی پہنا کر ہوٹلوں کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ مُسافروں کے لئے دروازے کھولنا، ٹیکسی بُلانا وغیرہ اِنہی کا کام ہے۔ سنگاپور کے پرائم اور از کارِ رفتہ بُڈّھوں کے مُقابلے میں یہاں کے سِکھ دربان جوان اور درشنی لوگ ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ اپنی لال وردی میں بہت خوش ہیں۔ دوسرے ہندوستانی بھی ہیں اور راہ چلتے چند ساڑھی پوش خواتین ضرور نظر آ جاتی ہیں۔ آج کوئینز روڈ کے چوک پر ایک پاکستانی جوان بھی ملے۔ اُنہوں نے باری صاحب کو شیروانی پاجامے اور جناح کیپ میں دیکھ کر خود ہی سلام کیا۔ ہم لوگ اُن سے بات کرنے کو رُک گئے۔ ہم نے کہا یہاں کب سے ہو؟ معلوم ہوا چار سال سے۔ کام کیا کرتے ہو؟ فرمایا وہ سامنے کی نائٹ کلب میں نوکر ہوں۔ ہم نے دیکھا کہ اُن کے کالے کوٹ کے اُوپر پیتل کے حروف میں کلب کا نام بھی لکھا تھا۔ اِس سے آگے ہم نے نہیں پوچھا۔ اُنہوں نے خود ہی بتایا کہ کراچی کا

ہوں۔ بوہری خاندان سے تعلّق ہے۔ فلاں خانوادہ سے قریبی عزیز داری ہے۔ یعنی میرے کزن ہیں۔ اب اِس میں خانوادے کا نام کیا لیا جائے۔ پاکستان کے ہیں۔ سب سے اُونچے قسمت والے خاندانوں میں اُس کا شمار خاصے اُونچے درجے پر ہوتا ہے۔ کپڑے کی مِلیں ہیں۔ سیمنٹ کے کارخانے ہیں۔ دولت کے انبار ہیں۔ لیکن یہ صاحبزادے اپنے موجودہ حال میں بہت خوش تھے۔ جانے نائٹ کلب میں اُنہیں تنخواہ کے علاوہ کیا ملتا ہو گا۔ ہمارے پرانے رئیس زادے اور نوّاب زادے بھی تو کوٹھوں پر پڑے رہا کرتے تھے۔ خیر میاں آزاد تو اِن لذّتوں کو کیا جانے، ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اِن صاحب کو اِس حال میں دیکھ کے افسوس ہوا کیونکہ نام لیوا تو پاکستان کے ہیں۔





ہانگ کانگ کے سوٹ بنانے والے

ہانگ کانگ میں چوبیس گھنٹے میں سوٹ بنا کر دینے والے درزی سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے۔ ہر جگہ اُنہوں نے گماشتے چھوڑ رکھے ہیں جو لوگوں کو گھیر کر لاتے ہیں۔ ہوٹلوں سے ایئر پورٹ سے۔ اسٹیشن سے۔ کسی کو بہت ہی جلدی ہو تو ایسا بھی کرتے ہیں کہ صُبح آٹھ بجے آرڈر لیا، گیارہ بجے پہلی ٹرائی لی۔ تین بجے دوسری اور پانچ بجے پورا سوٹ تیّار۔ ہانگ کانگ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں دو چیزوں سے مُفر نہیں۔ ایک موت سے۔ دوسرے درزی سے۔ ہانگ کانگ آنے والا ایک نہ ایک درزی کی قینچی تلے آتا ہی ہے۔ جِن کی قوّتِ آزادی کمزور اور مالی حالت مضبُوط ہو وہ تو دس دس سوٹ بنواتے ہیں۔ ہم بھی پہلی بار ہانگ کانگ گئے تو ہمیں دو سوٹ بنا کر دوسرے دِن دے دیئے گئے۔ بلکہ اندر کڑھا ہوا تھا۔

SPECIALLY MADE FOR MR. IBNE INSHA

دوسری بار گئے تو ایک اور سوٹ بنوایا۔ جن سے ہم نے بنوائے یہ تو خیر پنجاب کے ہیں۔ دُکان بھی اِن کی پنجاب ہاؤس کہلاتی ہے۔ اب کے ہمیں سوٹ نہیں بنوانا تھا۔ یونہی ملنے گئے تھے۔ فضل الباری صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ اِن سے ہم نے کہا۔ ”آپ چاہیں تو بنوا لیں۔“ اُنہیں کپڑا پسند آیا لیکن دام پسند نہ آئے۔ یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اِس سے اچھّا اور سستا کپڑا تو ڈھاکے میں ملتا ہے۔ ہم بھی جلدی میں تھے۔ ہاں میں ہاں ملائی کہ بے شک ملتا ہے۔

باری صاحب کے سے سادہ طبع آدمی ہم نے بہت کم دیکھے ہیں۔ لیکن خریداری اور پیسے کا معاملہ اور ہے۔ اِس سے سادگی اور شرافت کا کیا تعلّق۔ پھر ہانگ کانگ سے آنے سے پہلے یہ تہیّہ کر کے آئے تھے کہ کسی کے دام میں نہ آئیں گے۔ بھاؤ تاؤ ضرور کریں گے۔ کوئی دس مانگے تو دو بتائیں گے۔ خریداری کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن ہانگ کانگ میں تو اُنہوں نے کسی بھی چیز پر اعتبار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حتّیٰ کہ اپنی آنکھوں پر بھی نہیں۔ ہلٹن ہوٹل میں لِفٹ پر چھوٹے چھوٹے چینی لڑکے کام کرتے ہیں۔ گول مٹول سے۔ اور اِس میں شک نہیں کہ چینیوں کی عُمر کے بارے میں ہم بھی زخم خوردہ ہیں۔ چین کے سفر میں ایک صاحبہ کا سِن بیس بائیس کا سمجھ کر

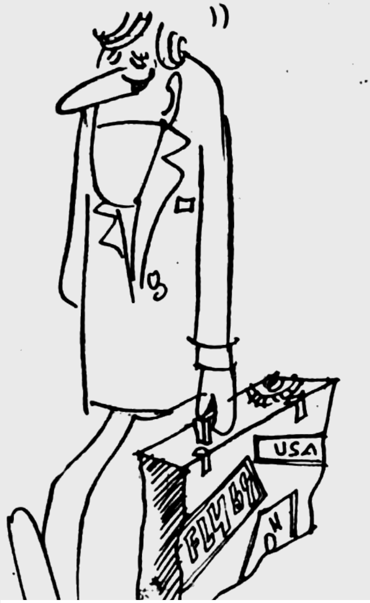
اُس سے اخلاق برتنا شروع کیا تھا۔ پتہ چلا کہ اڑتالیس برس کی ہیں۔ انچاسواں لگنے کو ہے۔ لِفٹ میں چڑھتے ہی باری صاحب ہم سے پوچھتے کہ معلوم ہے یہ لڑکا کس عُمر کا ہو گا؟ ہم نے کہا۔ "تیرہ چودہ سال کا لگتا ہے۔ مُمکن ہے اٹھارہ بیس کا ہو۔ چوبیس پچیس سال سے زیادہ کا تو ہو ہی نہیں سکتا۔" ہنسے اور بولے۔ "کم از کم چالیس سال کا ہے۔"

آخر ایک روز ہم نے اُس سے پوچھ ہی لیا۔ برخوردار کتنے برس کے ہو گے۔ کہنے لگا۔ "جی تیرہ برس کا ہوں۔" دوسرے لڑکے کی عُمر اُنہوں نے سینتیس اڑتیس تشخیص کی تھی۔ ہم نے کہا۔ "دیکھئے اتنا فرق نہیں ہوتا۔ یہ تو بالکل ہی بچّہ سا ہے۔" فرمایا۔ "بس اِنہی باتوں سے تو لوگ دھوکا کھاتے ہیں۔" آخر باری صاحب کے سامنے اُس کی عُمر بھی ہم نے پوچھ لی۔ وہ گیارہ برس کا تھا۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ چینی عُمر چور ہیں۔ جو شخص تیس سال کا نظر آتا ہے وہ یا تو ساٹھ سال کا ہو گا یا پھر دس برس کا۔

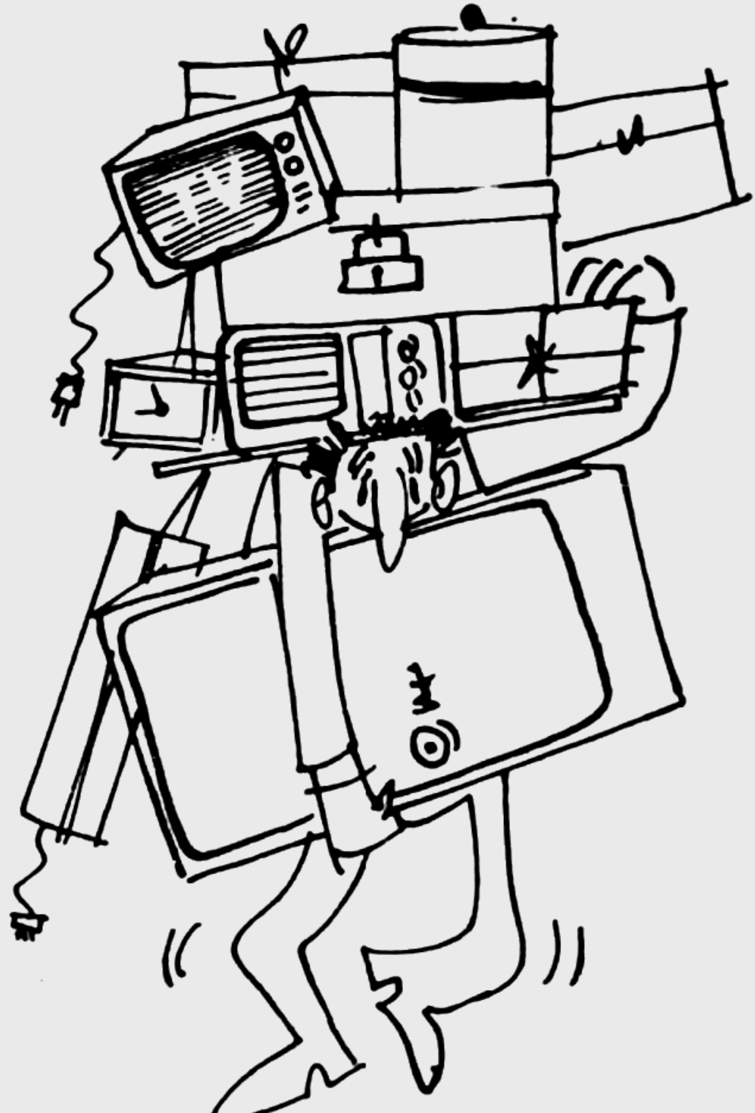
ہانگ کانگ میں لوگ دو دن کو آتے ہیں۔ کولون میں ٹھہرتے ہیں اور خریداری کر کے چلے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں حکیم لوگ اشتہار دیا کرتے تھے۔ باتصویر۔ ایک طرف ایک سوکھے کا مارا آدمی جس کے نیچے رقم ہے۔ "دوا استعمال کرنے سے

پہلے۔" دوسری طرف ایک کسرتی اور ورزشی پہلوان دوا استعمال کرنے کے بعد۔ ہانگ کانگ میں قدم رکھنے والے مسافر کا بھی یہی احوال ہوتا ہے کہ آتا ہے تو ایک پچکا ہوا سوٹ کیس اٹھائے۔ جاتے ہوئے شان دیکھئے کہ دو دو سوٹ کیس پھولے ہوئے۔ اُس ہاتھ میں ڈبّے۔ دوسرے میں تھیلے۔ گلے میں کیمرہ حمائل ہے اور ایک اُنگلی میں ٹرانزسٹر اُٹھائے ہیں۔ پہلے دو سفروں میں ہم خود اِسی ہئیت میں آئے اور گئے تھے۔ کولون میں ناتھان روڈ کے پھیرے کئے۔ ایک دو سفر فیری کے اور جزیرہ ہانگ کانگ کے بڑے اسٹوروں پر نظرے خوش گزرے۔ اب کے ہانگ کانگ میں قیام تھا اور مقصد خریداری نہیں کام تھا۔ لہٰذا مقدور بھر ہانگ کانگ کا شہر بھی دیکھا اور کولون بھی۔ اور اُس کے پیچھے جو علاقے نئے علاقہ جات کہلاتے ہیں اُن کا ایک چکّر بھی کاٹا۔ ہانگ کانگ اور چین کی سرحد بھی دیکھ آئے۔ کولون کے پیچھے کے اِن علاقوں میں گاؤں بھی ہیں، قصبے بھی، فصلیں بھی، کھیت بھی۔ ہانگ کانگ اور کولون تو خیر انگریزوں کے باقاعدہ مقبوضے ہیں۔ اِنہیں وہ باداکا مال سمجھتے ہیں۔ نئے علاقہ جات ننانوے برس کے پیٹے پر لیے گئے تھے۔ جس کی میعاد ۱۹۹۷ء میں ختم ہوئی۔ اچھّا خاصا علاقہ ہے۔ ساڑھے تین سو مربّع میل سے زیادہ (ہانگ کانگ کا جزیرہ اور کولون دونوں مل کر کُل ۳۳ مربّع میل بنتے ہیں۔) راستے میں مشہور ریستوران

ڈریگن اِن میں لنچ بھی کیا۔ وہاں بیٹھے آپ خیال بھی نہیں کر سکتے کہ یہ پُر فضا جگہ ہانگ کانگ کے تجارتی مرکز کا حصّہ ہے جو محض سیمنٹ کی عمارتوں کا جنگل ہے اور جس میں بیس بیس، پچیس پچیس منزل کی عمارتوں کے سوا کُچھ نہیں۔ پھر ایک روز ایبرڈین کا قصبہ بھی دیکھا جس میں زیادہ آبادی ماہی گیروں کی ہے۔ اچھّا خاصا بازار بھی ہے اور کم آمدنی لوگوں کے لئے فلیٹوں کی بُلند و بالا عمارتیں۔ یہاں کے دو ریستوران مشہور ہیں جو بیچ دریا کے کھڑے ہیں۔ یعنی اصل میں کشتیاں ہیں۔ لوگ دُور دُور سے اِن میں کھانا کھانے آتے ہیں۔ پھر وکٹوریا چوٹی کو بھی ہم نے سر کیا۔ بالکل مری کا سا نقشہ ہے۔ پہاڑ کو گردشوں میں کاٹتی ہوئی سڑک۔ اِس ڈھلوان پر ایک کیبل ٹرین بھی چڑھتی ہے۔ اپنے انجن کے زور پر نہیں بلکہ ایک کیبل کے سہارے۔ کچّے دھاگے سے بندھی آتی ہے سرکار مری۔



ہانگ کانگ سے پہلے



ہانگ کانگ کے بعد

ہم چڑھے تو کار سے لیکن اُترے اُس سے۔ وکٹوریا کی چوٹی سے شہر کا منظر دیکھنے کا ہے۔ افسوس کہ پُرتگالی کالونی میکاؤ میں اب کے بھی ہمارا جانا نہ ہو سکا۔ ہم کتنے دِن یہاں قیام کریں ضرورت سے ہمیشہ ایک دِن کم رہتا ہے اور وہ دِن وہی ہوتا ہے جس میں ہمارا میکاؤ جانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ خیر میکاؤ زندہ، صُحبت باقی۔ پچھلی بار تو یُوں بھی یہاں فساد اور ہنگامے ہو رہے تھے۔ ہمارے خیر اندیشوں نے ہمیں روک لیا تھا۔

دُنیا کا کون سا کونا ہے جس میں یہ ہپّی خانہ خراب نہیں پُہنچے۔ یہاں ہلٹن کی کافی بار میں بھی بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب نے مونچھیں بڑھائی ہیں جو لٹکتی ہوئی اُن کی چھاتی پر آرہی ہیں۔ دوسرے نے چہار ابرو کا صفایا کرا رکھا ہے اور جٹا دھاری بنے ہیں۔ سائنس نے اتنی ترقّی کی ہے کہ پیٹ کے اندر بچّے کی جنس معلوم کر لی جاتی ہے اور انڈے کے اندر کے چوزے پر حکم لگا دیا جاتا ہے کہ اولادِ نرینہ ہے یا مُرغی کی نورِ چشمی ہے۔ ہم کہ سائنس سے بہرہ ہیں۔ پہپّیوں کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ مس کہیں یا مسٹر کہہ کر بُلائیں۔ دوسرے ہم پکچر کارڈ اور تحفے بیچنے والوں کے ہاتھوں زِچ ہیں۔ اہرامِ مِصر پر جائیے تو یک لخت ایک شخص کارڈ لئے نمودار ہوتا ہے جیسے تابوت کا ڈھکن اُٹھا کر نکل آیا ہو۔ دمشق میں غازی صلاح الدّین ایّوبی کے مزار کے

مجاور نے فاتحہ میں ہمارا ساتھ دیا اور ہمارے ہاتھ کارڈ بیچے۔ ہانگ کانگ اور چین کی سرحد پر بھی اِس کے کارڈ موجود، بلکہ ہانگ کانگ کے بعد ایک کنفیوشس نما بُڈّھا بھی گیان دھیان میں بیٹھا تھا۔ ہم نے اُس کی تصویر لینی چاہی تو بھاگا بھاگا آیا کہ پہلے پیسے دو تب تصویر اُتارنے دوں گا۔ اور سر، یہ کارڈ بھی ہیں۔ ٹوڈالر ففٹی ایچ۔۔ ویری گُڈ۔ ویری گُڈ۔

ایک خط: چڑھتے سورج کی دھرتی سے

ہجوم جا کر گُم ہو جانا ہماری ہمیشہ سے کمزوری یا عشرت رہی ہے، ارو یہ ٹوکیو کا شہر تو کہنے کا شہر ہے۔ ایک کروڑ دس لاکھ کی آبادی، اقوامِ متحدہ کے اراکین میں بھی ایسے ایسے مُلک ہیں کہ ٹوکیو شہر کی آبادی میں سے کم از کم بیس پچیس بن سکتے ہیں۔ اور اندورا جیسے مُلکوں کو لیجئے تو دو سو بنا لیجئے۔ عمارتوں کے لحاظ سے یہ شہر سراسر مغربی ہے۔ ہم بچپن میں پڑھا کرتے تھے کہ ٹوکیو میں مکان لکڑی کے بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ زلزلے سے گِر نا جائے۔ بھلا لکڑی ایسے مُلکوں کی ترقّی کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے جو دُنیا بھر کو پیچھے چھوڑے جا رہے ہوں۔ صنعتوں کی ترقّی میں اور بابر بہ عیش کوش میں بھی۔ ہمارے یہاں یہ تصوّر ہے کہ یہاں گناہ کرو گے تو دوسری دُنیا میں ڈنڈے کھاؤ گے۔ اللہ میاں کان پکڑوائیں گے۔ لیکن جِن لوگوں کے مذہب اور روایات میں اِس قسم کی عقوبت کا ذکر نہ ہو، بلکہ حیات بعد ممات کا تصوّر نہ ہو وہ

کیوں ہاتھ روکیں۔ دولت انسان کو کُچھ زیادہ ہی بے باک بنا دیتی ہے۔ اور جاپان میں تو امریکیوں نے ایسے آداب سکھائے ہیں کہ معاشرے کا ڈھانچہ ہی بدل گیا ہے۔ پچھلی بار کے سفر میں ہم نے جاپان کے ایک بڑے آدمی سے شکایت کی تھی کہ دیکھے جاپانی خواتین کی عِفّت پر کھُلم کھُلا ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ آپ کا مشرقی اور قومی وقار کیا کہتا ہے اِس باب میں۔ ہم یہ بات اِس لئے کہہ دی تھی کہ جاپان دیکھ کر آئے تھے، جہاں کوئی غیر مُلکی کسی جاپانی لڑکی کو میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اِس کے لئے اُسے سنگاپور جانا پڑتا تھا۔ وہ جاپانی بزرگ مُسکرائے اور بولے میاں کِن چکروں میں پڑے ہو۔ پیسہ سب چیز ہے۔ ڈالر آتے ہیں، آنے دو اور یُوں تمہارے سمجھانے سے یہ گنگا اُلٹی تو بہنے سے رہی۔ آگے ہی کو بہے گی۔ تُم بھی چاہو تو اِس میں نہاؤ۔ تھائی لینڈ کا احوال بھی یہی ہے۔ سنگاپور اور ہانگ کانگ کا بھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پومپیائی یُوں ہی تباہ ہوا تھا۔ روم پر اِس لئے آفت آئی تھی۔ خیر اُس زمانے میں قُدرت کُچھ زیادہ سخت گیر ہو گی۔ ہمارا ذِکر کرنے کا مطلب بھی قُدرت کو اِس طرف توجّہ دِلانا نہیں ہے، ہم قُدرت کے پھڈّے میں ٹانگ اڑانے والے کون۔ بس ذکر کر دیا ہے۔ پرانی چال کے آدمی ہیں نا۔ رہا نہیں جاتا۔

ایک بات ہم ابھی سے کہے دیتے ہیں، جاپان بڑا اور ترقّی یافتہ مُلک تو بن گیا ہے لیکن

جلد ہی دوبارہ خطرناک مُلک بھی بن سکتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جِس مُلک کے پاس زیادہ دولت ہو جائے اُسے وہ ہضم نہیں ہوتی اور اِدھر اُدھر نظر ڈالنے اور ہاتھ پھیلانے لگتا ہے۔ جاپان نے دوسری جنگ میں شکست کھا کر بیس بائیس برس تو گزار لیے اور چونکہ دفاع کا ٹنٹا نہیں تھا۔ سارا انتظام خدائی فوجداروں امریکہ والوں اپنے سر لے لیا تھا۔ لہٰذا یہ اپنی اقتصادی اور صنعتی ترقّی میں لگے رہے۔ لیکن اب جاپانیوں کی نئی نسل پرانے مقبوضات کے بارے میں پھر پہلے کی طرح سوچنے لگی ہے۔ دوسری جنگ کے جاپانی ہیرو کہ اب تک مردود تھے اب پھر محبوب ہوئے جارہے ہیں۔ منچوریا پر حملہ جائز نظر آنے لگا ہے۔ مشرقِ بعید منڈی کی طرف نظریں اُٹھنے لگیں ہیں۔ ایٹم کی ترقّی اور پھر ایٹم بم اور دوسرے بموں کی ترقّی کی نوبت آرہی ہے۔ بحریہ اور فضائیہ تو یہ لوگ دو تین دِن میں ایسی بنالیں گے کہ بڑی طاقتوں کی ٹکّر کی ہو گی۔ بے شک اِس وقت اوکی ناوا کے جزیرے میں کہ امریکہ کا اڈّہ ہے، ایک سوشلسٹ کی فتح ہوئی ہے لیکن آنے والا جاپان امریکہ کا مُہرہ بلکہ حریف ہو گا۔ امریکہ اُسے شِشکارتا رہے گا اور اُسے چین اور روس کے مُقابلے میں کھڑا کر دے گا۔ اور پھر یہی لوگ سونی اور سانیو بنانے والے فقط ٹرانزسٹر ریڈیو ہی نہیں بنائیں گے، توپیں، بندوقیں بھی ڈھالیں گے۔ ساری بات نظام کی ہے۔ مغربی جرمنی میں

پھر نازیت کا احیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ جرمنوں کی شائستگی اور علم اور فلسفے سے شغف مشہور ہے۔ امریکہ ہی کو لیجئے۔ دُنیا کا سب سے امیر اور ترقّی یافتہ مُلک اور آزادی کی روایات کا امین لیکن جب وہ جنگی مشین کا پُرزہ بن جائے اور اُس پر وحشت سوار ہو جائے تو۔۔۔۔؟

کتابوں میں اہلِ مشرق کی حیا اور عِفّت کا ذکر اکثر آتا ہے لیکن سچ جانئے تو اِس برصغیر سے مشرق کی طرف جایئے، یا مغرب کی طرف، فاصلے کے ساتھ ساتھ اِن چیزوں کا تصوّر معدوم ہوتا جاتا ہے۔ اور شراب سے اِبا کرنے والے تو شاید فقط ہم پاکستانی قوم ہیں لیکن سنگاپور اور ہانگ کانگ اور ٹوکیو تو تعیش کے کارخانے ہیں۔ یہاں مہمان کو اپنے گھر میں نہیں بار میں یا گیشا گھر میں لے جانے کا رواج ہے۔ بار میں آپ ساقی سے شراب کا سودا کیجئے یا شباب کا، یہ آپ کی ہمّت اور توفیق پر مُنحصر ہے۔ گیشا گھر میں بے شک اچھّے بھی ہیں۔ گیشائیں کہنے کو تو امراؤ جان ادائیں ہیں کہ روایتی لباس میں روائتی گانے گا کر آپ کو روائتی طریقے سے شراب پلاتی ہیں۔ لیکن بہت کم گیشا گھر ایسے ہوں گے کہ محض شائستگی کا کاروبار کرتے ہوں گے۔ آپ جتنا گُڑ ڈالیں اتنا ہی معاملے کو میٹھا کر سکتے ہیں اور لُطف اور صحبت کو طول اور گہرائی بخش سکتے ہیں۔

البتّہ جس گیشا گھر میں ہمارے ایک جاپانی میزبان نے ہمیں دعوت دے کر ہماری عزّت افزائی گی وہ نرم قسم کا تھا۔ اُس میں ہمارے میزبان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ لوگوں کے ایمان کی سلامتی میں ایک بات یہ ممد ہوئی کہ گیشائیں بے چاری ریٹائرمنٹ کی عُمر کو پہنچی ہوئی تھیں۔ اِس پارٹی میں تین پاکستانی تھے اور تینوں اللہ میاں کی گائے۔ محض کوکا کولا نوش۔ لہٰذا گیشاؤں کی ساقی گرد دھری کی دھری رہ گئی اور وہ اُنہیں چھوڑ دوسروں کے گرد جمع ہو گئیں۔ کھانے میں بھی کیکڑے ہماری وحشت کا سامان تھے۔ جاپانی کھانوں میں الا بلا چیزیں بہت ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں نے تو چکن اور چٹنی پر اِکتفا کی۔ کھانے کے بعد گانا بجانا بھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ سماں پیدا نہ ہوا۔ ساکوراساکورا کا الاپ بے جان سا تھا۔ اُن کے سازوں کی تناتن سے محفوظ ہونے کے لئے بھی کانوں کو برسوں کی تربیت چاہیئے۔ ایک مبتدیانہ سے رقص میں اور سب لوگ شریک ہوئے۔ پاکستانی مُلّا لوگ بیٹھے دیکھا کئے۔ یکایک ہمیں کُچھ خیال آیا اور ہم نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”حضرت آج کل ہمارے حساب سے رمضان شریف ہے۔ اِس مبارک مہینے کا آغاز کُچھ اچھّا نہیں ہوا۔“ وہ بے چارے ایسے بوکھلائے کہ کوکا کولا بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بولے۔ ”دیکھو ہم یہاں آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ تاہم کسی سے اِس کا ذکر نہ کرنا۔ اللہ ہمیں معاف

کرے۔‘‘ ہم نے کہا۔ ’’آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ ہم کسی سے کیوں ذکر کرنے لگے۔ قارئین کرام آپ سے تو کیا پردہ۔ کسی اور سے نہ کہیئے گا۔

جاپان میں چار دِن

گیچوئن کانکو ہوٹل۔۔ جیسا عجیب نام، ویسا عجیب ہوٹل۔ خاصا عُمر رسیدہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے جدِّ امجد جنّت سے نکالے گئے تھے تو ایک دو روز تو ضرور یہیں قیام فرما رہے ہوں گے۔ کیا عجب اِسی کمرے ۴۱۱ نمبر میں فروکش ہوئے ہوں۔ بچا کھچا گیہوں یہاں بھی کھایا ہو گا کیونکہ کمرہ ڈبل بیڈ ہے۔ مُمکن ہے کمرے کا رنگ اور روغن نسبتاً تازہ ہو یعنی محض حضرات نوحؑ یا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانے کا ہو لیکن غُسل خانہ اور اُس کا ٹب ضرور پرانا اور یجنل ہے۔ نل بند ہی نہیں ہوتا۔ قطرہ قطرہ گِر کر ہر آدھے گھنٹے بعد دریا ہو جاتا ہے اور پھر لوگ کہتے ہیں جاپان بڑا ماڈرن مُلک ہے۔ کیا یہ شہر ٹوکیو ہو سکتا ہے؟ لوگ بھی کیا مضمون کی ہوا باندھتے ہیں۔

کسی شہر میں آپ کا واسطہ جن لوگوں یا مکانوں سے پڑے آپ انہی کی روشنی میں ایک مُلک کے متعلّق رائے قائم کرتے ہیں۔ پچھلی بار ہم ٹوکیو پرنس ہوٹل ٹھہرے تھے بالکل ٹوکیو ٹاور کے زیرِ سایہ واقع ہے۔ کیا کہنے۔ دام اُس کے اُس زمانے میں تو بہت معلوم ہوتے تھے لیکن گیجوئن نامی بھٹیار خانہ کے دام اور آرام کو دیکھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ بالکل مُفت تھا۔ ٹوکیو پرنس میں رہنے اور وہاں سے جانے کے بعد ہم نے جاپان کے متعلّق ہمیشہ یہی کہا کہ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ یہاں کے حُسن کے متعلّق بھی ہم نے یاروں کو یہی بتایا کہ فی مربّع گز حسن جس قدر جاپان میں ملتا ہے کہیں اور نہیں ملے گا۔ لیکن گیجوئن والوں نے ایسی طبیعت منغّض کی کہ ہمیں اب کے یہ رائے بھی بدلنی پڑی۔ جاپانی دوشیزائیں بس واجبی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ پیلی پیلی رنگت۔ سپاٹ آنکھیں۔ ہم نے اتنی ساری دیکھیں لیکن دِل دینے کا سوال پیدا ہوا تو بالکل انکار کر دیا۔ یہاں کے سبزے اور آب و ہوا کی بھی ہم نے تعریف کی تھی۔ معلوم ہوا مبالغہ کر گئے تھے۔ بس ہرے ہرے پودے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ ہم آئے کہاں سے تھے۔ ہانگ کانگ کے ہلٹن سے۔ ہائے اُن لوگوں کے انداز۔ ایک ایک مسافر کی بلائیں لینے کو دس دس آدمی موجود ہیں۔

بیرے بھاگے آتے ہیں۔ یس سر یس سر کرتے مُنہ سوکھتا ہے۔ چھ چھ لِفٹ ہیں۔ اُن میں وردی پوش لڑکے جا و بے جا سلام کرنے والے کھڑے ہیں۔ ایکسلریٹر ہیں کہ اور کوئی کام نہ ہو تو چڑھتے رہو، اُترتے رہو۔ سامان چڑھانے اُتارنے کا الگ محکمہ ہے۔ دروازے کھولنے والے سردار جی مُفت میں دیکھئے۔ کیا معلوم تھا کہ فلک کج رفتار ہماری تاک میں ہے۔ اُس نے ہلٹن میں ہمیں دیکھ لیا اور کہا بچّو ٹوکیو چل، تُجھ سے سمجھتا ہوں۔ پُرانی داستانوں میں گُستاخ مسافر اور عاشق کی مشکیں کس کر اُسے تہہ خانے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ہم ایسے خوش قسمت نہ تھے۔ لٰہذا گیجوئن میں ڈال دیئے گئے۔ تہہ خانے اور گیجوئن ہمیں بنیادی فرق یہ ہے کہ تہہ خانہ مُفت ہوتا ہے اور روٹی کپڑا بھی کُچھ نہ کُچھ ملتا ہی ہے۔ یہاں بیّش قرار ڈالر روز۔ سامان بھی بیروں نے عین نیم شب کے وقت اُتار کر کاریڈور میں لار کھا اور چمپت ہو گئے۔ آدھ میل لمبی کاریڈیو ہے۔ آخر ہمیں خود اُٹھا کر لانا پڑا۔ کمرے میں چپل ضرور رکھی ہے لیکن ہمارے پاؤں سے اُس کو یہ نسبت ہے کہ اندر کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں۔ ہم اپنا پاؤں تو اِن کی چپل کے سائز کا کرنے سے رہے۔ بس اُنگلیوں کے بَل چلتے ہیں پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ ہلٹن میں شام کو بیرا بستر کا کونا ہٹا کر رکھ جاتا ہے اور ایک گول سی کاغذ کی ٹکّی پر جس پر گُڈ نائٹ وغیرہ لکھا رہتا تھا ایک چاکلیٹ ٹافی

بھی دھری ملتی تھی۔ یہاں کوئی پھٹے مُنہ بھی کہنے نہیں آتا۔ ہانگ کانگ ہلٹن کے روم بوائے مسافروں کا ایسا خیال رکھتے تھے کہ بعض اوقات بِن بُلائے بھی ایسے عالم میں جب کہ آپ کیمرے کی پرائیویٹ حالت میں ہوں چابی سے دروازہ کھول کر اندر گھُس آتے تھے کہ سر آپ نے بُلایا تھا؟ ورنہ اُدھر ہم نے گھنٹی کا بٹن دبایا، وہ الہ دین کے جِن کی رفتار سے آن موجود۔ گیجوئن کانگو ہوٹل میں بیرے کے لئے گھنٹی ہی نہیں ہے۔ ٹیلی فون بے شک ہے لیکن کون اُٹھائے۔ آپریٹر کی خوشامد کرے۔ ایک روز ہم نے سوچ کر کہ اتنے سارے ڈالر دینے ہیں تو جوتا تو پاش کرا لیں، جوتا دروازے کے باہر رکھ دیا۔ صُبح بیرا بولا حضور ایک سو ین (Yen) مرحمت ہوں۔ ہم نے کہا کِس بات کے؟ بولے جوتا پاش کرنے کے۔ مُفت تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اِس ہوٹل میں کوئی کام مُفت نہیں۔ آپ پانی بھی مانگیں گے تو ایک سو ین لیں گے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہماری شکایت ہوٹل کی گرانی کی نہیں، نہ اِس مکان کے کہنہ ہونے کی ہے۔ کیونکہ کہنہ تو ہمارا اپنا گھر بھی ہے اور گراں ہلٹن بھی تھا۔ غصّہ ہمیں اِس بد معاملگی پر ہے کہ اصل نِرخ ہمارے کمرے کا ۲۲۰۰ ین یعنی ساڑھے سات یا آٹھ ڈالر ہے۔ ہمارے کمرے میں یہی لکھا لگا ہے۔ ٹورسٹ کتابچوں میں بھی یہی ہے کہ ایک آدمی ٹھہرے تو ڈھائی ہزار ین دے۔ دو آدمی

ہوں تو انیس سو۔ لیکن ہمیں چھتیس سو دینے پڑے، بلکہ سروس اور ٹیکس ملا کر چوالیس سو۔ ہوٹل والوں نے کہا جناب یہ ہمارے سیزن کا زمانہ ہے۔ خیر لے لو میاں لیکن ہم بھی تمہیں دُنیا میں مُنہ دِکھانے کے لائق نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ یہ کالم بطور 'زمیندار' کے ادارے کے لکھ دیا ہے۔ قصّہ اِس تلمیح کا یہ ہے کہ 'زمیندار' مولانا اختر علی خاں مرحوم ایک بار ولایت گئے۔ برطانیہ کے وزیرِ خارجہ سے ملے اور کہا 'دیکھئے جناب! کشمیر کے معاملے میں ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ ایسی زیادتی کو روکیے ورنہ۔۔۔۔۔"

وزیرِ خارجہ کی چشمِ تصوّر میں ٹینک دوڑنے لگے اور دھائیں دھائیں توپیں چلنے لگیں۔ سراسیمہ ہو کر بولے۔ "ورنہ کیا۔۔۔"

اختر علی خاں صاحب نے کہا۔ "ورنہ میں پاکستان جا کر زمیندار میں آپ کے خلاف اداریہ لکھوں گا۔"

ٹوکیو میں آج کل ہمارا روزانہ ہزاروں کا خرچ ہے۔ چار چار سو چھ چھ سو تو ٹیکسی والے کو تھما دیتے ہیں اور ماتھے پر بل نہیں لاتے۔ اِس کی ایک وجہ تو ہماری طبعی اور خاندانی



سر آپ نے بلایا تھا؟

دریا دِلی اور داد و دہش کی عادت ہے۔ دوسری یہ کہ ین ایک ڈالر میں تین سو ساٹھ ہوتے ہیں۔ روپے میں سترّ پچھتّر۔ جان لیجئے ایک ین کا سِکّہ بہت دِن تو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ ایک روز بڑی جستجو سے ملا۔ کتاب پڑھنے پر معلوم ہوا کہ ایک ین ایک سو سین (Sen) بھی ہوتے ہیں۔ کِسی زمانے میں ہوتے ہوں گے۔ یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا اور ہمارے ہاں بھی پیسے میں دمڑیاں اور دمڑیوں میں کوڑیاں ہوتی تھیں اور اِن کوڑیوں کا سودا بھی بازار سے مل جاتا تھا۔ ہم نے پولینڈ کی زلوٹی دیکھی ہے اور اٹلی کا لیرا دیکھا ہے۔ افغانستان کی افغانی دیکھی ہے اور انڈونیشیا کا روپیہ بھی۔ ایران میں ریالوں میں کھیلے ہیں۔ یہ سب سِکّے دونّی، اکنّی، ادّھے وغیرہ کے برابر ہیں۔ لیکن ین تو سب کو پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ لوگ اپنے سارے حساب انہی سِکّوں میں رکھتے ہیں۔ اگر پاکستان میں بھی بجائے روپے کے پیسے میں رقمیں گنی جائیں تو ہم دیکھتے دیکھتے لکھ پتی بن جائیں۔ اپنی پیاری قوم کو امیر بنانے اور دولت سے مالامال کرنے کا اِس سے بہتر طریقہ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں۔

انگریزی کے بغیر ترقّی کرنے کا کیا فائدہ؟

حُسنِ اتّفاق کہ ہمارے دوست سیّد قاسم محمود بھی ٹوکیو پُہنچے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹریننگ کورس کے لئے مہینے ڈیڑھ مہینے سے وہاں تھے اور جس روز ہم وارد ہوئے اُسی روز اُن کی مصروفیات ختم ہوئی تھیں۔ اب ہم تھے اور قاسم محمود صاحب۔ اِس بازار سے اُس بازار۔ اِس ڈپار ٹمنٹل اسٹور سے اُس مارکیٹ تک۔ کبھی آکا ساکا، کبھی گنزہ، کبھی شبوا، کبھی ٹوکیو ٹاور۔ ایک کروڑ دس لاکھ کی آبادی کا شہر ہے۔ جانے کہاں تک پھیلا ہوا۔ دُکانیں منہا مُنہ بھری ہوئی۔ کرشمہ دامنِ دِل می کشد کہ جا اینجاست۔ ہم کم مایہ سوداگر ہر چیز سے کہتے تھے کہ اِس دیس میں ارزاں ہو۔ آخر دِل مسوس کر رہ جاتے تھے اور اگے بڑھ جاتے تھے۔ فضل الباری صاحب نے ہمیں دیوالیہ ہونے سے بچا لیا۔ ہماری تو ہر چیز پر طبیعت آتی تھی اور ہاتھ جیب کی طرف جاتا تھا۔ وہ روک دیتے تھے کہ یہ چیزیں سب ڈھاکے میں مل جاتی ہیں۔ بیگم

وجیہہ ہاشمی ہم سے بہت تنگ ہیں، فرماتی ہیں کہ عورت تو میں ہوں۔ چیزوں کی طرف لپکنا مُجھے چاہیے۔ لیکن لپکتے آپ ہیں۔ کبھی فہمائش کرتی ہیں۔ کبھی ناراض ہوتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر بیزار اور لاچار ہو کر فرماتی ہیں۔ اچھّا بابا۔ جو جی چاہے کرو۔ لیکن ہماری خریداری کیا ہے؟ نہ ریڈیو، نہ ٹیپ ریکارڈ، نہ کیمرے۔ بس طوطے چڑیاں۔ چھوٹی چھوٹی تصویریں۔ کھلونے اور گڑیائیں۔ ارے بابا یہ بھی نہ خریدیں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے قاسم محمود صاحب ہمیں مائنز ریستوران لے گئے۔ یہ عین گنزہ میں واقع ہے۔ جنوبی ہند کے ایک صاحب نائر اِسے چلاتے ہیں۔ کیرالہ کے رہنے والے۔ آدمی بہت با اخلاق اور مزے کے۔ صلح کُل ایسے کہ گائے کا گوشت پکاتے ہیں نہ سؤر۔ زیادہ تر چِکن، سبزی، دال، چاول، پراٹھا، چپاتی وغیرہ۔ باورچی اِن کے جاپانی ہیں جنہوں نے چند لفظ ہماری زبان کے بھی سیکھ رکھے ہیں۔ مثلاً شکریہ، ٹھنڈا پانی، بہت اچھّا وغیرہ۔ ہم گئے تو لتا منگیشکر کا ریکارڈ لگا ہوا تھا۔ چھوٹی سی تو جگہ ہے تین چار میزیں۔ کُچھ غیر مُلکی بیٹھے دال بھات کھا رہے تھے۔ نائر صاحب نے بڑی عزّت اور آدر سے بٹھایا۔ خود کھانا لا کر ہمیں دیا۔ دام بھی بہت واجبی تھے اور اُن کا کہنا یہ تھا کہ خالص گھی میں چیزیں پکی ہوئی ہیں۔ وہ خالص گھی اور مسالے بیچتے بھی ہیں۔ بہر حال خاصے دِنوں کے بعد دیسی چیزیں کھانے کو ملی تھیں۔

خواہ مخواہ پسند آئیں۔ البتّہ اُسی شام قاسم صاحب نے جو دوسرا ہوٹل ہمیں دکھایا، دہلی ریستوران، وہاں جا کر ہماری طبیعت بے مزہ ہوئی۔ باہر لکھا ہے ہندوستانی اور پاکستانی ریستوران۔ لیکن اندر ہندوستان تو کُچھ کچھ ہے، پاکستان کُچھ بھی نہیں۔ چلانے والے اِسے جاپانی ہی ہیں۔ شُدھ ہندی میں ایک دیوار پر لکھا ہے ”سنسار کے سرومانیہ بھوجن کڑھی کی وشیش دُکان۔ دِلّی۔“ کیا سمجھے آپ۔ دُنیا کے مشہورِ عالم بھوجن کڑھی کی دُکان۔ دِلّی۔ ہم نے جاپانی مینجر صاحب سے کہا یہاں اُردُو میں بھی لکھواؤ ورنہ کوئی پاکستانی یہاں آنے سے رہا۔ خیر ہم نے چکن تندوری کا آرڈر دیا۔ اِس شان سے آیا کہ نیچے لکڑی کی ٹرے پر آدھ انچ دِل کا توا، جلتا سُلگتا ہوا اور اُس کے اُوپر وہ مُرغ۔ نان کے نام سے تلا ہوا نان پاؤ۔ چھُری کانٹے کی جگہ گورکھوں والی کھکریاں۔ خوب معجون مرکب ہوٹل اور معجون مرکّب کھانے ہیں۔ بِل آیا تو ہم نے سانس کھینچ لی۔ اے صاحبو! ٹوکیو میں سب جگہ جانا دِلّی ریستوران میں نہ جانا۔ من نہ کردم شما حذر بکنند۔

بارے باری صاحب کا کُچھ بیان ہو جائے۔ ابھی ہم جاپان پُہنچے بھی نہ تھے، ہانگ کانگ سے آنے والے جہاز ہی میں تھے کہ اُنہوں نے جاپانی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ ائیر ہوسٹس کو بُلا کر کہا۔ ”مس یہاں آؤ۔ میں جاپانی زبان سیکھنا چاہتا ہوں۔

اِن کا ارادہ تو تھا کہ ٹوکیو جہاز اُترتے ہی جاپانی زبان پر پوری طرح حاوی ہو جائیں اور بے تکلّفی اور روانی سے گفتگو کرنے لگیں۔ لیکن ہم نے کہا ہر چہ گرید مختصر گرید۔ اِس بے چاری کو ہمیں چائے وغیرہ بھی بنا کر دینی ہے۔ خیر یہ طے ہوا کہ فی الحال شکریہ کا جاپانی مترادف سیکھیں گے۔ باقی فاضلانہ مہارت ٹوکیو میں چل کر حاصل کریں گے۔ مِس ایئر ہوسٹس نے بتایا "آری گاتو گزائی مشتا۔" اِتنی جاپانی تو ہماری گِرہ میں پہلے سے تھی۔ باری صاحب نے اپنی سہولت کے لئے اُس میں فقط آری گاتو لیا یعنی شکریہ۔ آری گاتو گزاتی مشتا یعنی بہت بہت شکریہ تک دو دِن بعد پُہنچے لیکن آدمی ذہین ہیں۔ موقع ہو یا نہ ہو، جاپانی میزبان کے مُنہ پر آری گاتو کا چھینٹا دے کر اُس کا دِل موہ لیتے ہیں۔ آپس میں اُردُو یا انگریزی میں گفتگو ہو رہی ہے اور باری صاحب بات بات پر فرماتے ہیں آری گاتو گزائی مشتا۔ ہم نے کہا باری صاحب چلیں ناشتہ کریں۔ بولے چلتا ہوں آری گاتو گزائی مشتا۔ اپنے کمرے سے فون کیا۔ باری صاحب اُٹھ جایئے۔ نو بجے فلاں جگہ پہنچنا ہے۔ جواب ملتا ہے اچھّا اچھّا اُٹھتا ہوں۔ آری گاتو گزائی مشتا۔

اس ہوٹل کیجوئن کانکو میں ہمارا کمرہ نمبر ۲۱۱ باری صاحب نمبر ۲۱۰ میں۔ لیکن کاؤنٹر پر آکر چابی ہمیشہ کمرہ ۱۸۲۵ کی مانگتے ہیں۔ اصل میں یہ ہانگ کانگ کے ہلٹن ہوٹل



میں اُن کے کمرے کا نمبر تھا۔ وہاں بھی بڑی مُشکل سے اُنہیں یاد ہوا تھا ورنہ تو آ کر کمرہ ۳۰۳ یعنی سنگا پور والے کیتھے ہوٹل کے کمرے کی چابی مانگا کرتے تھے۔ اب ہم نے اُن کو ۲۱۰ یاد کرادیا ہے۔ آگے سیول پہنچیں گے تو وہاں اِس کی چابی مانگیں گے اور نہیں ملے گی تو معصومیت سے ہم سے پوچھیں گے ۔۔۔ ارے بابا کیا نمبر ہے میرے کمرے کا؟

جاپانیوں کی ایک بات ہمیں پسند آئی۔ یہ لوگ مُصافحے کا زیادہ تردّد نہیں کرتے۔ اِک ذرا گردن جھکائی اور سلام ہو گیا۔ کہیں جایئے یا کہیں سے آیئے، جاپانی مہمان دور ہی دور کھڑا ساٹھ درجے کا زاویہ بنا کر جھُکے گا اور پھر کھڑا ہو جائے گا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اِس میں بھی کئی باریکیاں ہیں۔ کون کِس کے سامنے جھُکے گا۔ آگے کب ہاتھ باندھنے چاہیں۔ کب چھوڑنے چاہیں۔ یہ سارے آداب علمِ دریا ہیں۔ بہر حال ہم تو اب باری صاحب کو بھی اِسی قسم کا سلام کرنے لگے ہیں۔ قوم

اپنی ترقّی کے سامان میں سراسر مغربی ہے لیکن ذہنیت میں مشرقی۔ کپڑے ولایتی، سوچ دیسی۔ مردوں کا لباس تو خیر سراسر سوٹ ہی ہے۔ عورتوں میں بعض کیمونو پہنے نظر آجاتی ہیں۔ اکثراِسے محض رسمی یعنی تقریبات کے لباس کے طور پر پہنتی ہیں۔ کیونکہ اِسے پہن کر اور پیچھے گدّی باندھ کام تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔ بہرحال خوش جمال عورت جب ہی روایتی رنگارنگ ریشمی لباس پہنتی ہے تو واقعی اپسرا معلوم ہوتی ہیں۔ اِس کے ساتھ بالوں کے جُوڑے کا انداز بھی الگ ہوتا ہے اور جوتے بھی۔ چال بھی خاص ہو جاتی ہے۔ دوسری بات ہم نے یہ دیکھی کہ انگریزی سمجھنے بولنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ راستہ معلوم کرنے میں بڑی دقّت ہوتی ہے۔ جاپانی سیٹھ سے ملیے۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتا۔ لیکن اس کی مصنوعات ولایت کہ منڈیوں پر چھائی ہوئی ہیں۔ انہیں انگریزی نہیں آتی باقی سب کُچھ آتا ہے۔ ہمیں انگریزی آتی ہے لیکن اور کُچھ نہیں آتا۔



آری گاتو سے خمسہ حمیدہ تک

جُونہی جہاز ٹوکیو سے اُڑا، ہمارے باری صاحب نے کوریا کی زبان کی تحصیل شروع کر دی۔ ایک ائیر ہوسٹس کے تلطف کے جواب میں آپ نے اُس سے کہا۔ "آری گاتو گزائی مشتا۔" تو وہ تنک کر بولی کہ بندی جاپانی نہیں کوریائی ہے۔ باری صاحب نے کہ تو پھر کوریائی میں شکریہ کیسے ادا کرتے ہیں۔ ترت بتاؤ۔ اُس نے کہا اِس موقع پر ہمارے ہاں "خمسہ حمیدہ" کہتے ہیں۔ کم از کم ہم نے یہی سُنا۔ ہم نے اُس سے کہا اے بی بی پھر تو تُو ہماری ہم زبان ٹھہری۔ خمسہ بھی ہماری زبان کا لفظ ہے جیسے خمسہ نظامی۔ اور حمیدہ بھی۔ جیسے اوصافِ حمیدہ۔ اچھا ایک جُملے اور بتاتی جا کوریائی زبان میں خیریت کیسے دریافت کی جاتی ہے۔ آپ لوگوں کے ہاں خیریت نام کی چیز ضرور ہوتی ہو گی اور اِسے لوگ دریافت کرتے بھی ہوں گے۔ ہر چند کہ اتنے اصرار کے ساتھ نہیں جیسے ہمارے ہاں رواج ہے کہ کیا حال ہے؟ خیریت ہے؟ بالکل اچھّی

طرح؟ بھلے چنگے؟ بال بچّے راضی وغیرہ اور اِس کے بعد گفتگو کے ہر دو فقروں کے بعد اچھّاتے ہور کی حال اے۔" بلکہ ہمارے لوگ تو اتنے خلیق ہیں کہ مخاطب کے ساتھ ساتھ اُس کے دُشمنوں کی خیریت بھی پوچھ لیتے ہیں۔ "سُنا ہے آپ کے دُشمنوں کی طبیعت آج کل ناساز ہے۔"

وہ عفیفہ اِن باریکیوں کو کیا سمجھتی تاہم اُس نے مزاج شریف کا کوریائی بدل ہمیں بتا دیا۔ "اینو ہاشم نیکا۔" ہم نے کہا۔ "لو اِس میں بھی آدھی ملاوٹ ہماری زبان کی نکل آئی۔ ہاشم نہ صرف ہمارے ہاں کا لفظ ہے بلکہ وہ ہمارے عزیز بھی ہوتے ہیں۔ باقی رہے اینو اور نیکا۔ یہ ہماری گرامر کے حساب سے تابع مہمل ہیں۔ یہ بھی ایک بڑی ضروری چیز ہوتی ہے بلکہ بعض لوگ اصل کے بجائے تابع مہمل ہی کے پیچھے پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔"

یہ دو جملے ہماری گرہ میں نہ بھی ہوتے تب بھی سیول یعنی جنوبی کوریا کے دار الحکومت میں ہمارا قیام ایک خواب کے سماں گزرتا۔ اِن لوگوں نے ہماری تکریم کی حد کردی۔ لینے کو بے شمار لوگ آئے ہوئے تھے۔ اِن میں عابد بھی تھے۔ زاہد بھی تھے۔ ہشیار بھی تھے۔ ہار بھی ہمارے حصّے میں ڈھیروں آئے کیونکہ ہماری پارٹی کے کُچھ لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ اُن کا حصّہ ہمیں کو ملا۔ اِن لوگوں نے ایک ایک

شاندار ی چمکیلی کار بھی ہمارے سپُرد کر دی کہ جیسے چاہو برتو۔ ایک کار ہمارے تُرک دوستوں کے لئے۔ ایک ایرانی بھائیوں کے لئے اور ایک ہم تینوں پاکستانیوں کے لئے۔ ہماری کار پر ہمارے مُلک کا پھرُیرا بھی لہراتا تھا اور دو موٹر سائیکل سوار ہمارے قافلے کے آگے آگے چلتے تھے۔ جا بجا کانسٹیبلوں نے ہماری خاطر ٹریفک روک رکھا تھا۔ ہم نے باری صاحب کے بازو میں چُٹکی لے کر کہا۔ "یہ حقیقت ہے یا خواب۔" وجیہہ بیگم نے کہا۔ "ایسے موقع پر اپنے چُٹکی لیتے ہیں، دوسرے کے نہیں۔ میری ناقص رائے میں تو یہ حقیقت ہی ہے اور یہ جلوس سلامی پر سلامی لیتا ہوا ایمبیسیڈر ہوٹل کے احاطے میں جا اُترا۔ اب تک ہمارا واسطہ جن ہوٹلوں سے پڑا اُن میں سب سے اچھّا اور پُر تکلّف اور با تصویر یہی تھا۔ ٹیلی ویژن اور ریفریجریٹر اور نہ جانے کِن کِن آسائشوں سے مسلّح خمسہ حمیدہ، خمسہ حمیدہ کہتے کہتے ہمارا مُنہ سوکھ گیا تھا لہٰذا پہلا کام یہ کیا کہ ریفریجریٹر سے دو بوتلیں کوکا کولا کی نکال کر پئیں۔

سیول کا شہر ہمیں پسند آیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ دُنیا کے اِس کونے میں اتنے بڑے بڑے شہر بھی ہوں گے۔ آبادی اِس کی دمِ تحریر چوالیس لاکھ ہے۔ کراچی سے آٹھ دس لاکھ زیادہ۔ ہوائی اڈّے سے شہر جاتے ہوئے معلوم ہو جاتا تھا کہ راولپنڈی کی مری روڈ سے گزر رہے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ناک نقشہ، ایسی ہی سڑکیں۔ ایسی ہی

دُکانیں۔ ٹوکیو اور ہانگ کانگ کے مُقابلے میں بہت بیّن فرق۔ ایک تو ہمارا جی استقبال ہی سے خوش تھا، یہ منظر دیکھ کر طبیعت اور نہال ہوئی۔ کنکریٹ کے جنگلوں سے ہمیں وحشت ہوتی ہے۔ سنگاپور، ہانگ کانگ، ٹوکیو میں وہی ایک سی اونچی اونچی ماچس نما عمارتیں دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ یہاں کے لوگ بھی ہماری ہی طرح کے دکھائی دیے یعنی ٹھاٹ باٹھ اور خوش پوش نہیں بلکہ درمیانہ سا کام تھا۔ صفائی ایسی نہ تھی کہ آئینہ اُسے دیکھ کر شرمائے۔ لوگ بھی مِلنسار تھے۔

ہمارے دو ڈھائی دِن اِس طرح گزرے کہ صبح وزیرِ صحت ہمیں کھانا کِھلا رہے ہیں شام کو وزیرِ خزانہ چائے پلا رہے ہیں اور پھر معلوم ہوا وزیرِ اعظم صاحب کو بھی ہم سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ ہمیں تو اتنی عزّت افزائی سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہم کوریا کے صدر سے ملنے جائیں گے تو وہ گدّی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہو گا کہ لیجئے حضرات اب یہ راج پاٹ سنبھالیے۔ آپ کی ریاست آپ کے سپُرد کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ تو کھڑاؤں پہن جنگل کی راہ لیتا ہم پھنس جاتے۔ اللّٰہ تعالی کا خمسہ حمیدہ یعنی ہزار ہزار شُکر کہ وزیرِ اعظم سے ملنے کے بعد ہمارا وقت ختم ہو گیا۔ اِن لوگوں کی اسمبلی جاری تھی اور صدر صاحب مصروف تھے۔



کُچھ عجب نہیں کہ لڑائی کے دِنوں میں سیول کا وہی احوال رہا جو آج کل سائیگون یا بنکاک کا ہے اور یہ بڑے ہوٹل اور دُکانیں اُسی زمانے کی یادگار ہوں۔ آبادی بھی

شاید اُسی زمانے میں بڑھی ہو گی لیکن ایک امریکن سے گفتگو ہوئی تو اُس نے کہا: ''ہم لوگ نہ بھی آئے ہوتے تب بھی اِس مُلک نے ترقّی کی ہوتی کیونکہ سبھی لوگ پڑھے لکھے ہیں۔'' شرح خواندگی نوّے فیصدی سے زیادہ ہے جبکہ ہمارے ہاں ایک سو میں فقط سترہ آدمی خواندہ ہیں۔ جاپانی بھی یہاں بہت دِن رہے ہیں۔ دو صنعتیں قائم کر گئے پھر کوریائی خود بہت ذہین اور خوبیوں کے لوگ ہیں۔ جاپان میں تو ہماری انگریزی بیکار تھی۔ وہاں گوروں کی اُردُو کی طرح کی انگریزی بولی جاتی ہے۔ لیکن سیول والے روانی اور لہجے میں کمال پائے۔ اِس کے باوجود تعلیم ساری کوریائی زبان میں ہے۔ کالج اور یونیورسٹی بھی ہے۔ اِن کی زبان دیکھنے میں چینی اور جاپانی کے سِلسِلے کی معلوم ہوتی ہے لیکن اُن سے الگ ہے۔ سہل ہے اور اُس کی لکھائی تلفّظ کے لحاظ سے ہوتی ہے جبکہ چینی زبان تصویری ہے۔ مفہوم ادا کرتی ہے۔

اِس شہر میں ہمارے ایک دوست بھی تھے۔ ایک مسٹر ہان کہ بڑے پبلشر ہیں اگرچہ جواں عُمر ہیں۔ یہ ٹوکیو کی کانفرنس میں اب ڈھائی سال پہلے ملے تھے۔ پچھلے دِنوں ستمبر میں سنگاپور کی کانفرنس میں بھی یہی اپنے مُلک کی طرف سے آئے تھے لیکن اب کے دو اور چُلبلے صاحبان لیو اور منھ اُن کے ساتھ تھے۔ یہاں بازدید میں تعلّقات اور استوار ہوئے لیکن خرابی یہ تھی کہ سیول میں ہمارے پاس وقت بہت کم

تھا تاہم آخری شام ہم نے اُنہیں فون کر ہی دیا کہ میاں ملنا تو مُحال معلوم ہوتا ہے دور سے سلام قبول کرو۔ وہ بولے نہیں جناب اِس کی سہی نہیں، آپ ٹھہریے۔ میں پندرہ منٹ میں لیو مُنھ کو لے کر پہنچتا ہوں۔ وہ بے چارے خلوص کے مارے بھاگم بھاگ واقعی پندرہ منٹ میں آن پُہنچے۔ تھوڑی دیر تو ہمارے ہی کمرے میں سبھا جمی۔ پھر بولے اُٹھو جی۔ مُصلّیٰ گردِ جام کرو۔ ہم نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ پینے کے معاملے میں ہماری دوڑ کوکا کولا تک ہے۔ فرمانے لگے آنکھوں پر تو کوئی پابندی نہیں۔ کھانا کھلائیں گے اور گیشا گھر لے جائیں گے۔ یا کہو تو نائٹ کلب چلیں۔ جی خوش ہو جائے گا۔ ہم نے حوالہ دیا کہ یہ ہمارے یہاں عبادت کا مہینہ ہے اور اِس کی ہمارے ہاں بڑی اہمیت ہے۔ یہ وقت تراویح کا ہے۔ شگفتن گل ہائے ناز کا نہیں۔ لیکن ہماری دلیلیں بودی ہوں یا نہ ہوں۔ ہم خود تو بودے آدمی ہیں۔ جانا پڑا اور یُوں ہم ایک ہفتے کے اندر اندر دوسرے گیشا گھر میں آلتی پالتی مارے سبحان اللہ اور مکرّر ارشاد کرتے نظر آئے۔ ٹوکیو میں تو خیر ہماری گیشا پارٹی سب مل کر بیس بائیس کی ہو گئی تھی۔ اِک تماشا ہوا گلا نہ ہوا۔ یہاں چار آدمیوں کے لئے ایک کمرہ الگ کر دیا گیا۔ پردے کھینچ دیے گئے۔ جوتے اُتار قالین پر گدّوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ چوکی پر انواع و اقسام کے خوان آ گئے۔ ہم نے جو کُچھ محفوظ اور مطابق اپنی شرع کے پایا

ٹھونگا۔ گیشائیں بھی کہ نو عمر اور خوبصورت تھیں۔ خاص کوریائی لبادہ نما لباسوں میں برابر آن بیٹھیں اور دانا ڈالنا شروع کیا۔ ہماری بے کسی کی کُچھ شرم یُوں رہ گئی کہ وہ کوریائی کے علاوہ کُچھ نہ جانتی تھیں۔ سوائے خمسہ حمیدہ اور اینو ہاشم نیکا کے۔ سو یہ فقرے کوچہ و بازار میں تو چل جاتے ہیں معاملاتِ من و تو میں کہاں تک ساتھ دیتے۔ ہمارے دوست ہماری ترجمانی کیا کرتے، اپنے اپنے دِلوں کی ترجمانی سے اُنہیں فرصت نہ تھی۔ بس ایک لفظ کوریائی کا ہمیں رٹا دیا۔ سارنگ حمیدہ۔ ہم نے کہا مطلب؟ بولے مطلب نہ پوچھو۔ طوطے کی طرح بولے جاؤ۔ وہ نیک بیبیاں یہ لفظ ہم سے سُن کر ہنستی رہیں۔ آخر ہمیں معلوم ہوا کہ اِس کا مطلب ہے "مُجھے تُجھ سے محبّت ہے۔"

اور ہم تازہ واردانِ بساط ہوائے دِل انگریزی کے علاوہ کُچھ نہ جانتے تھے۔

ہم دُنیا کے دوسری طرف جا نکلے

یہ ہوائی ہے وہ ہوائی نہیں کہ کسی دُشمن نے اڑائی ہو بلکہ وہ کانِ ملاحت مجمع الجزائر کہ بحر الکاہل میں جاپان اور امریکہ کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ باشندے تو اِس کے دیسی ہیں۔ ہماری ہی طرح کے سانولے کالے لیکن سِکّہ یہاں امریکہ کا چلتا ہے۔ پہلے یہ جزائر آدھی صدی تک امریکہ کے مقبوضات رہے۔ اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پچاسوں ریاست کے طور پر شامل ہیں۔ یہاں امریکہ کا بڑا بحری اڈّہ ہے۔ ہوائی اڈّہ بھی پرل ہاربر نامی بندر گاہ بھی تو یہیں ہے۔ ہمارے اِس ہوٹل سے آدھ میل پر جس پر جاپان نے ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو یک بار گی حملہ کر کے سوئے ہوئے امریکہ کو جھنجھوڑ دیا تھا اور اُسے دوسری جنگ میں کودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم نے ہوائی کا نام شروع بچپن میں رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی مشہور کہانی 'بوتل کا بھُتنا' میں پڑھا تھا۔ وہ شخص انہی جزائر کا رہنے والا ہی تو تھا جسے یہ طِلسمی بوتل ملی تھی۔

ہوائی یونیورسٹی میں ہمارے کئی دوست بھی رہے ہیں اور وہ نظم بھی تو ہماری ہی ہے۔

شام حسرتوں کی شام

رات تھی جُدائی کی صُبح صُبح ہرکارہ

ڈاک سے ہوائی کی

گُم شُدہ محبّت کا

نامۂ وفا لایا

پس ہم نے کُچھ وقت اپنے کوریا کے حصّے سے کاٹا، کُچھ سان فرانسسکو کے پروگرام کی کور دبائی اور ایک دِن رات کے لئے ہونولولو میں آن اُترے۔ یاد رہے کہ جزائر ہوائی نام ایک مجمع الجزائر کا ہے۔ اگرچہ اِس مجمع میں ایک جزیرۂ خاص ہوائی نام کا بھی ہے لیکن مشہور ترین شہر جو اِن جزائر کے گورنر کا مستقر بھی ہے۔ ہونولولو، اوآہو نامی جزیرے پر واقع ہے۔ ہوائی یونیورسٹی بھی یہیں ہے۔ ہوائی کا مطلب ہی ایک طرح سے ہونولولو ہے۔

ہوائی میں امریکہ کے دور دراز کے حصّوں سے وہ لوگ آتے ہیں جو عمرِ رفتہ کو آواز

دینے کی منزل میں ہوں۔ سردی اور پالے کے مارے ہوئے امریکی سیّاح اِس کے دھوپ بھرے ہریالے ساحلوں پر آتے ہیں تو اِن کا غُنچۂ دِل یک لخت کِھل اُٹھتا ہے اور یہ فوراً کپڑوں سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ہم نے خود یہی کیا۔ بہت دِن سے سوٹ لادے لادے پھر رہے تھے۔ یہاں دیکھا کہ ہر شخص مرد و زن پھولدار پوشاک زیبِ تن کئے اِترانا اِٹھلاتا پھر رہا ہے۔ کسی کے سر پر لمبوتری ٹوپی ہے۔ کوئی ننگے پاؤں، ننگے سر ننگے بدن گھوم رہا ہے۔ ہمارا بھی جی چاہا کہ فوراً اک شلوکا بڑے بڑے رنگین پھولوں والا لیں اور اُس میں اپنی کینچلی بدل لیں لیکن پھر خیال آیا کہ جن لوگوں کو ہم پر سنجیدگی اور بُردباری کا گمان ہے اُنہوں نے اِس ہئیت میں ہماری تصویریں دیکھ لیں تو کیا کہیں گے۔ لہٰذا یہی کیا کہ وہ کُرتا پاجامہ نکالا جو عید بقر عید کے لئے ہم



نے سوٹ کیس کے ایک گوشے میں رکھ چھوڑا تھا۔ اپنے قالب پر چڑھایا اور سلیم شاہی جوتا پہن، رومال سے خود کو پنکھا کرتے ہوئے خراماں خراماں اُس ہجوم میں شامل ہو گئے۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد۔۔ اگر ہمارا قیام ہونولولو میں چندے اور رہوتا اور ہوائی کی روح ہمارے مزاج میں پوری طرح سرایت کر جاتی تو ہم کراچی کے ہوائی اڈّے پر پھول دار غرارہ اور فرغل پہنے قلابازیاں لگاتے ہوئے برآمد ہوتے۔ ہم تو خیر مشتاقانہ آئے تھے، ہمارے رفیقِ سفر باری صاحب کو تھوڑی سی مایوسی، ہونولولو دیکھ کر ہوئی کہ کیا خاص بات ہے اِس میں۔ بس سمندر ہے، ریت ہے۔ اُس پر کُچھ لوگ لیٹے ہیں۔ کشتیاں ہیں، دھوپ ہے اور درخت ہیں۔ یہ سب کُچھ مشرقی پاکستان میں بھی ہے بلکہ اِس سے زیادہ ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں نے ہوائی ہوائی لگا رکھا ہے۔



رائل ہوٹل جس میں ہم فروکش ہوئے یہاں کا مُمتاز ترین ہوٹل ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ صدر جانسن بھی یہاں آتے ہیں تو اِسی ہوٹل میں قیام فرماتے ہیں۔ عین سرِ ساحل واقع ہے۔ عقبی دروازہ اِس کا بازار میں جا کھُلتا ہے اور اِس کے سامنے انٹرنیشنل مارکیٹ کا احاطہ ہے جو بجائے خود دیکھنے کی چیز ہے۔ اِس گاؤں نما پینٹھ میں کُچھ دکانیں ہیں۔ کُچھ ریستوران اور چائے خانے، کُچھ سبزہ و گل بھی۔ اِس کی فضا عجیب رومانی ہے۔ میٹھے میٹھے سایہ دار راستے، چھوٹی چھوٹی ندیائیں۔ اُن پر لکڑی کی پُلیائیں۔ درختوں کے اُوپر بھی مچانوں پر کُٹیائیں سی بنی ہوئی جن میں کوئی نہ کوئی دُکان یا بار ہے۔ یہ نقشہ یا تو قدیم ہوائی کا ہے یا پھر میکسیکو کا۔ نام بھی جگہوں کے عجب عجب ہیں۔ داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ کو ایک چھپّر سا ہے۔ یہ ایک ریستوران ہے۔ پُر اسرار اور نیم تاریک سا، جس کا نام ہے 'کرنلز پلانٹیشن' یعنی کرنیل صاحب کا باغ۔ اِس میں ناؤنوش رقص و نغمہ ڈھول ڈھمکا سبھی کُچھ ہوتا ہے۔ شام کا کھانا ہم نے موم بتّیوں کی لَو میں اِس بالا خانے میں کھایا جس کا نام آشیانۂ مُرغ ہے۔ ہے بھی گھونسلے کے سمان، آپ کُچھ بھی نہ کیجئے۔۔۔ بس اِس گاؤں کی گلیوں میں گھومتے رہیئے اور گھومنے والوں کو دیکھتے رہیئے۔ کے را با کسے بنا شُد۔ جسے جو کپڑا ملا اُسے پہن اِدھر آنکلا۔ نہ ملا تو محض لنگوٹ میں گھوم رہا ہے۔ یہاں ہپّی اور غیر ہپّی کی پہچان

دشوار ہے۔ اُدھر ندیا کے اُوپر لکڑی کے پل کے پار غالباً کوئی تھیٹر ہے۔ بس ایک صاحبہ عجیب سا جنگلیوں کا سا جُوڑا بنائے بیٹھی نظر آ رہی ہے۔ لباس کے نام سے فقط محروم آب رواں ہے۔ کوئی بلانے کو نقّارہ بھی پیٹ رہا ہے۔ چل اے عمرِ رفتہ کے خریدار چل۔۔۔ لیکن نہیں جس کو ہو دین و دِل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔





ہونولولو میں وائی کیکی کا ساحل

الوہا۔۔۔یا مسافر۔۔۔الوہا

ہمارے دوست میر نسیم محمود کہ اور باتوں کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ آج کل ہونولولو میں ہیں۔ ہم سے یہ نہ ہوا کہ ان کو پہلے سے آنے کی اِطّلاع کر دیتے۔ پہنچ کر ڈھونڈنا شروع کیا۔ جس سے بات کریں وہ کوئی آگے کا نمبر بتا دیتا تھا۔ آخر مایوس ہو گئے لیکن اسی میلہ گھومنی۔۔یعنی انٹر نیشنل مارکیٹ کی ایک دُکان میں جہاں مالائیں، منکے اور جاپان سے لے کر میکسیکو تک کے نوادر بِکتے تھے ایک خاتون نے ہمیں دریافت کر لیا۔ خود ہی فرمانے لگیں، آپ کی شکل ابنِ انشا سے ملتی جلتی ہے۔ ہم نے کہا جی ہاں اِس مشابہت کی وجہ بھی بتائی کہ ہم ہی ابنِ انشا ہیں۔ لیجئے فوراً گھر کی سی بات پیدا ہو گئی۔ یہ بی بی یہاں وومن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ آج کل اپنے میاں کے ساتھ یہاں ہیں۔ میاں اِن کے اکبر خاں، وظیفے پر یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اِس اخلاقِ مجسّم نے اپنے میاں کو ٹیلی فون کیا اور وہ فوراً گاڑی لے کر آ گئے اور ہم

ہونولولو کی دوسری جگہوں میں گھومتے پھرے۔ یہ یونیورسٹی ہے۔ یہ پرل ہاربر ہے۔ یہ الموآنا مارکیٹ ہے۔ یہ جدید اور خوبصورت مارکیٹ دُنیا بھر کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے۔ یہاں کی سیکڑوں خوبصورت اور دِلاویز دُکانوں سے آپ فلپائن کی مہاگنی کی چوبی مصنوعات لے لیجئے یا بمبئی کے منقّش برنجی ظروف، جاپان کی خُشک مچھلیاں، آسٹریلیا کے منجمد خرگوش، بھُنے ہوئے ریشم کے کیڑے، پیکنگ کی مُرغابی، چڑیائیں، مکڑیوں کا اچار بھی۔ خریدارو بتاؤ کیا خریدو گے۔ باہر فوّارے اور بچّوں کے مطلب کے جھولے، گھوڑے اور دوسرے کھیل لیکن ہمارے دِل کا کنول تب کھِلتا اگر اس ہمدمِ دیرینہ میر نسیم محمود سے ملاقات ہو جاتی۔ دمے چند صحبت رہتی۔ آخر اکبر خان نے ذمّہ لیا۔ میر صاحب کو خبر ہوئی لیکن افسوس ایسے وقت کہ ہم رختِ سفر باندھ ہوائی اڈّے پر جانے کے لئے تیّار ہو چُکے تھے۔ جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔

کیا رات؟ کیا رات؟ کیا رات ہے اللہ۔ رائل ہوائی ہوٹل کی دوسری منزل کی بالکونی سے ساحل نظر آرہا ہے۔ دُھندلا دُھندلا اور ویران۔ احاطے ہے درختوں میں سے ہوا سنسناتی گُزر رہی ہے۔ دور سمندر میں ایک چٹّان سر اُٹھائے کھڑی ہے اور اِس چٹّان پر یہ کیا ہے؟ کوئی سمندر کی بلا ہے؟ ہو گی۔۔۔ موجوں کے تھپیڑوں کے

آہنگ پر دھیمے دھیمے گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ وحشت ناک سے

حشر کے دِن تک دھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

اور یہ کہاں کا شعر کہاں یاد آیا:

کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا

گاہ بالد چوں صنوبر، گاہ نالد چوں رباب

انہی ساحلوں پر ایسی ہی کسی رات کو مشہور مُہم باز کپتان کُک آج سے دو برس پہلے آن کر اُترا تو مقامی لوگوں نے اُسے لونو دیوتا سمجھ کر عقیدت کے ہار پہنائے۔ لیکن پھر وہ یہیں اِنہی لوگوں کے ہاتھوں ایک جھڑپ میں مارا گیا اور اِن ساحلوں پر فقط اپنا مجسمہ چھوڑ گیا۔ کہیں یہ سراپا اور یہ آواز اُسی کی تو نہیں۔ یا پہلے بادشاہ کامی ہا کی ہو گی جس نے اِس دھرتی کو روسیوں اور ہسپانویوں کی ترکتاز سے تو بچایا لیکن امریکی مشنریوں اور اُن کے پیچھے پیچھے آنے والے بحری بیڑے سے نہ بچا سکا۔ چاند اِس وقت ناریل کے اُونچے درختوں کے ایک جھنڈ میں پھنسا ہوا ہے۔ رات آدھی گئی ہو

گی۔ نیند آتی ہے پر نہیں آتی۔ کل ہم اِس دریا سے ہزاروں میل دور مشرق میں تھے۔ کل پھر ہزاروں میل دور مغرب میں ہوں گے۔ جانے کیسے کیسے ہم سے پہلے اِس کہنہ بالکونی میں بیٹھے کیا کیا یاد کر کے مسافر ہو گئے ہوں گے۔ کتنی محبّتیں ہمارے اِس حُجرے میں پروان چڑھی ہوں گی اور پھر قتل ہو گئی ہوں گی۔ وقت ایک دِن کو ہمارے لیے تھم گیا ہے۔ لیکن نہیں یہ ایک دھوکا ہے۔ حساب کا گورکھ دھندا ہے اور بس۔ وہ گُزرے ہوئے سال جن میں ہر جگہ ہوائی کی طرح حسین نظر آتی تھی اب ہوا ہوئے۔ اِن آنے والے سالوں کا خیال آتا ہے جن میں یہ پُر فسوں جزیرے بھی سرورِ رفتہ اور گزرا ہوا چونچال پن واپس نہ لا سکیں گے۔ لیکن آج کی رات وہ کیا نظم تھی؟

لوٹ کے نہ آؤ گے

موجۂ صبا ہو تم

سب کو بھول جاؤ گے

سخت بے وفا ہو تم

دشمنوں نے جتلایا

دوستوں نے سمجھایا

پھر تمہارا خط آیا۔

ساتویں سمندر کے

ساحلوں سے کیوں تُم

پھر مجھے صدا دی ہے

دعوتِ وفا دی ہے

تیرے عشق میں جانی اور ہم نے کیا پایا

درد کی دوا پائی

دردِ لا دوا کی

۔۔۔ کیوں تمہارا خط آیا

لیکن یہ تو بیتے دِنوں کی بھولی بسری باتیں ہیں۔ اے مسافر اب نیند کی چادر اوڑھ کہ نیا سفر سر پر ہے۔

الوہا۔ یا مسافر۔ الوہا

الوہا، جزائر ہوائی کا کلمہ کھل سِم سِم ہے۔ اِس میں السّلام اور اہلاً سہلاً کے معنی بھی آتے ہیں۔ شاد باش و شادزی کے بھی اور نہ جانے کیا کیا؟ اِس رعایت سے ہمارے ایک دوست نے کہ ہوائی میں رہے ہیں۔ لاہور میں اپنا گھر بنایا تو اُسے الوہا کاٹیج کا نام دیا۔ یہاں ہم تو عمرِ رفتہ کو آواز نہ دے سکے۔ ہاں وقت ایک دِن کو ضرور ہماری خاطر سے ٹھہر گیا تھا۔ گردشِ ایّام پیچھے کی طرف لوٹ چکی تھی۔ ہم ۲۹ کی صبح سیول یعنی کوریا سے چلے تھے۔ وہ شام دوبارہ ٹوکیو میں گزار شام کے آٹھ بجے جہاز میں بیٹھے۔ راستے میں شب بھر سوتے آئے۔



صُبح دم ہونولولو میں اُترے تو معلوم ہوا ابھی ۲۹ تاریخ ہے۔ وہ بین الاقوامی خط جس پر تاریخ بدلتی ہے ہم نے جاپان اور ہوائی کے راستے میں عبور کیا تھا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایک دِن اور ایک تاریخ کو ایک ہی وقت مثلاً صبح کے دس بجے کوریا میں بھی ہو اور اُسی دِن اُسی تاریخ کو اُسی وقت پانچ ہزار میل دور ایک دوسرے شہر میں بھی۔ ہمارے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ ہم نے پیر ایّام کے ہاتھ سے ایک پورا دِن چھین لیا تھا۔ اب ہم دُنیا کے دوسری طرف تھے۔ پاتال دیش میں۔ پاؤں زمین پر ٹِکائے چھپکلی کی طرح چل رہے تھے۔ یہ اس دیش کا بابِ داخلہ تھا جہاں کے لوگوں کو ہر چیز اُلٹی نظر آتی ہے۔ اخلاق میں بھی تھوڑی تخفیف یہیں سے شروع ہو گئی۔ اب تلک ہر جگہ باتھ روموں پر جنٹلمین یعنی شُرفا اور لیڈیز یعنی خواتین کے بورڈ نظر آتے رہے تھے۔ ہونولولو میں gentlemen کی جگہ men ہو گیا اور ladies کی جگہ Women۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ اے کولمبس تو نئی دُنیا میں داخل ہونے والا ہے۔ سونے کے بچھڑے پوجنے والے کاہنوں کی اقلیم میں۔ اپنے نقد ایمان سے خبردار۔ اپنی جیب پاکٹ سے ہوشیار۔

ہم نے امریکہ کو امریکہ نے ہمیں دریافت کرنا شروع کیا

سان فرانسسکو۔ صاحبان سان فرانسسکو۔ با ادب بلا ملاحظہ ہوشیار۔ یُوں تو ہوائی بھی امریکہ تھا لیکن اصلی وڈّاتے باتصویر امریکہ آج سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ اس اقلیم زرّیں نہاد کا مغربی دروازہ ہے اور دُنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں گنا جاتا ہے۔ ایک تو اِس لئے کہ اس کی کھاڑی خوبصورت ہے دوسرے اِس لئے کہ پہاڑیوں پر واقع ہے۔ سڑکیں اور گلیاں چڑھتی ہیں تو چڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اُترتی ہیں تو اُترتی چلی جاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ امریکہ میں واقع ہے۔ بھلا ترین چیزوں کا ذکر ہو اور اُس میں امریکہ نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خوبصورت ترین، قابل ترین، امیر ترین، جدید ترین۔۔۔ ہر شمار کا آنا ضرور۔۔ حتّٰی کہ بد ترین میں بھی۔ یہ

ریاست کیلیفورنیا کا صدر مقام بھی ہے۔ یہاں کا چائنا ٹاؤن اِس لئے مشہور ہے کہ اِس میں اتنے چینی آباد ہیں کہ چین سے باہر کسی شہر میں نہ ملیں گے۔ مشہور شاعر وین پی تُو جسے کامنتانگ والوں نے بعد میں گولی ماردی تھی یہاں رہا ہے اور یہیں اُس نے اپنی مشہور نظم دھوبی کا گیت لکھی۔ وہ یُوں کہ چینی لوگ امریکہ میں اکثر دھوبی کا کاروبار کرتے ہیں جیسے ہمارے ہاں موچی یا دندان ساز کا۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ چین سے کوئی شاعر یا پروفیسر بھی جائے تو اُسے تحقیر سے دھوبی کہہ کر بُلاتے ہیں۔ وین پی تُو نہایت آزردگی سے کہتا ہے کہ ہاں میں دھوبی ہوں۔ میں صرف تمہارے تر دامنوں کو۔ تمہارے پیراہنوں اور لباسوں ہی کو نہیں۔ تمہاری روح کو بھی دھو سکتا ہوں۔ یہ آلودہ روح زیادہ محتاج ہے دھلائی کی۔ بہ نسبت تمہارے کپڑوں کے۔ لاؤ مُجھے اپنے کپڑے دو۔ اپنی روح دو۔ چھُوا چھُو! یہ ہلٹن ہوٹل بھی ترین شامل ہے۔ وسیع ترین اقامت گاہوں میں اِس کا شمار ہوتا ہے۔ ایک ہزار کمرے اِس وقت ہیں۔ چند دنوں بعد پندرہ سو ہو جائیں گے۔ ہر طرف دبر دبڑ ہو رہی ہے۔ کوئی ہزار لڑکے کسی کنونشن میں شریک ہونے کے لئے آ گئے ہیں۔ تمام کاریڈوروں میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔ لیکن آج شب بھی سو چُکے ہم۔ ہمارے ساتھی تو یہاں آتے ہی اپنے کمروں میں مقیّد ہو گئے۔ حالانکہ ساڑھے آٹھ نو بجے ہی تھے۔ لیکن ہماری

طبیعت کو ہمیشہ سے وحشت ہے کہ کیسا ہی عالم اور کیسا ہی موسم ہو نئے شہر میں پہنچتے ہی ایک چکّر آس پاس کی گلیوں کا ضرور لگاتے ہیں۔ پس دوسروں کو سوتا اور اونگھتا ٹیلی ویژن دیکھتا چھوڑ ہم نے کوٹ کاندھوں پر ڈالا، دربان سے پوچھا کہ مارکیٹ اسٹریٹ کدھر ہے کیونکہ فقط اِسی کا نام ہم جانتے تھے اور یہ بھی کہ سان فرانسسکو کی کھاڑی کی طرف جاتی ہے اور پھر تیز قدم مارتے رات کے دُھندلکے اور سردی میں نکل گئے۔

یہ علاقہ ہوٹلوں اور کلبوں اور تھیٹروں کا علاقہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلی چیز جو ہوٹل سے نکلتے ملی وہ topless go go girls کا ٹھکانا تھا۔ اندر ہم نہیں گئے۔ جانے کا اتّفاق ہو گا تو آپ کو بتا دیں گے۔ ہاں بطور نمونہ جو تصویریں لگی تھیں اُنہیں ضرور نظر بھر کے دیکھا۔ رات کے گیارہ پونے گیارہ بجے کا عالم تھا۔ سڑکوں پر صرف اِکّا دُکّا راہ گیر ملتے ہیں اور جو ملتے ہیں اُن سے بچ کے چلنا چاہیئے۔ اِن میں جان کے دُشمن، ایمان کے دُشمن، سبھی طرح کے لوگ ہیں۔ یُوں اکیلے ایسے ہی باہر نکلنا دانشمندی نہیں لیکن ہم سے اور کتنے کام دانشمندی کے سرزد ہوتے ہیں۔ خیر اِس کلب سے تھوڑا آگے ایک غول لڑکے لڑکیوں کا کھڑا تھا جو ہر طرح کے گفتنی اور ناگفتنی اشغال میں مصروف تھے۔ یہاں سے ہم بائیں ہاتھ مارکیٹ اسٹریٹ پر مُڑ

گئے۔ یہ بھی اِس وقت ویران تھی اور آج کل مرمّت کے لئے بند بھی ہے۔ بہرحال دونوں طرف کی سپر دیکھتے اور پڑھتے۔ لوگوں کو شیشوں کے ختم لنڈھاتے دیکھتے خاصی دور نکل گئے۔ ایک جگہ سے اخبار خریدا اور اُلٹے پاؤں دوسری سمت نکل گئے۔ اِدھر زیادہ بار، زیادہ سینما، زیادہ تھیٹر، زیادہ کھانے کے اڈّے اور go go لڑکیوں کی تماشا گاہیں تھیں۔ ایک جگہ ایک نوجوان آگے بڑھا اور بولا کیا آپ مُجھے دس سینٹ عطا فرما سکتے ہیں، ہم نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ آگے ہپیوں کے غول تھے۔ یہ خانہ خراب یہاں بھی بھرے ہوئے ہیں۔ یا پھر بد مست کالے اور گورے۔ کالے زیادہ گورے کم اور مزید تماشا گاہیں، گو گو ٹاپ لیس گرلز، جانے ہم کہاں تک گئے ہوں گے اور آگے کہاں تک جاتے لیکن ویرانی نے راستہ روک دیا اور سلامتی کا خیال اپنی جگہ بالخصوص اس لیے کہ ہم ٹیلی ویژن پر ایک عجیب ہولناک سی فلم دیکھتے اُٹھ کر گئے تھے۔

JOURNEY INTO THE UNKNOWN

اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں، اور سارا عالم سوتا ہے۔ چاند جانے کس تاریخ کا ہے۔ اداسی سی بکھیرتا ہوا چمک رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن میں والوں نے بھی خُدا حافظ کہہ کر پروگرام تہہ کر دیئے۔ اچھّا تو اب ہم اخبار پڑھیں گے۔ ابھی

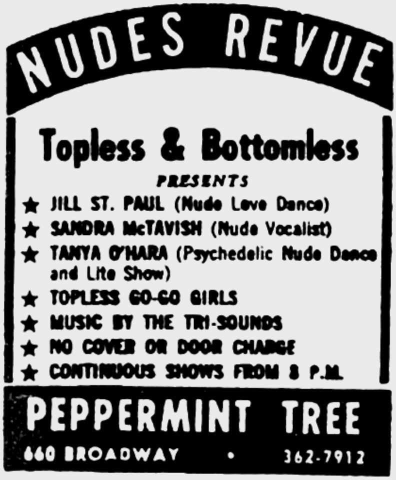
ہم سان فرانسسکو کرانیکل کا آخری ایڈیشن لے کر آئے ہیں۔ پس اے صاحبان گُڈ نائٹ۔ آپ کے ہاں تو ابھی دِن کے دس گیارہ بجے ہوں گئے۔ یعنی وہ وقت جب مردم بہ کاروبار روند اور بلا کشانِ محبّت بہ کوئے یار روند۔ ہم اس دُنیا کی اُلٹی طرف ہیں۔

ہم الٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا۔ اب سمجھ میں آیا کہ ہماری اور امریکہ والوں کی سمجھ میں فرق کیوں ہے۔ کیوں اِن کو ہر معاملے میں اُلٹی سوجھتی ہے۔ دِن کو رات اور رات کو دِن کہتے ہیں۔ وہ کُرّۂ ارض کے دوسری طرف جو واقع ہوئے اور اِن لوگوں کی کھوپڑی جو اُلٹی ہوئی۔

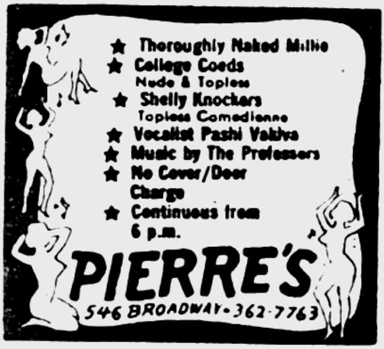
یہ کیا ہے؟ Key کا تازہ شمارہ ہے۔ ذرا دیکھے تو اِس میں سان فرانسسکو کی اِس ہفتے کی دلچسپیوں کا احوال ہے اور اشتہارات بھی:

ARE YOU A GENTLEMAN ALONE?

بے شک ہیں تو سہی۔ یہ ایک عنوان ہے، ایک حسینہ کی تصویر بھی ہے۔ ہاں تو کیا کہتی ہیں۔



برہنہ رقص کا اشتہار



برہنہ رقص کا ایک اور اشتہار



ٹاپ لیس کا اشتہار

INVITE A DELIGHTFUL COMPANION

PHONE NO 775،5900یعنی بس فون کر دیجئے اور اپنی تنہائی سے سبکدوش ہو جایئے۔ المشتہرین ہیں:

AMERICAN, ---GLAMOROUS ESCORTS

EUROPEAN, ORIENTAL GIRLS

لکھا ہے کہ یہی انتظام تنہائی کی وحشت دور کرنے کا، نیویارک اور لاس اینجلز میں بھی ہے۔ قارئین کرام کارِلائقہ سے یاد فرمائیں---

(۲)

گیگی کلب ۵۵۲ براڈوے میں تشریف لایئے۔ ۶ بجے شام سے دو بجے رات تک اور عریاں حسیناؤں کی سرتاج مس میریلین اپولو کو سرتاپا لباسِ برنگی میں جلوہ نُما دیکھئے۔

(۳)

پریز کلب ۵۴۶ براڈوے ایٹ کولمبس۔ یہ آپ کا اپنا نائٹ کلب ہے۔ کالج کی ننگی

لڑکیوں کو پیش کرتا ہے۔ لڑکیاں جو مُلک کے مختلف کالجوں سے مُنتخب کی گئی ہیں۔ پروگرام شام سے شروع۔ اس میں آپ مس للّی اور پاشی والیو کو دیکھ سکتے ہیں۔ بالکل مادرزاد حالت میں۔ کپڑے کی کسی دھجّی کے بغیر فون ۳۶۲-۷۷۶۳۔

توگویا ہم نے امریکہ دریافت کر لیا۔ کُچھ لوگ اِس باب میں کولمبس نامی کسی شخص کا نام بھی لیتے ہیں۔ خیر وہ بھی ہو گا۔ تو پھر دونوں کو کریڈٹ دے لیجئے۔ کہ فرق صرف تھوڑا آگے پیچھے یعنی زمانے کا ہے۔ کولمبس کے ساتھ تو جانے کیا گزری ہو گی۔ لیکن اس چکاچوند کو دیکھ کر ہم چکنم میں پڑ گئے ہیں۔ یہ ساقی بہ جلوہ دُشمنِ ایمان آگہی اور یہ مطرب بہ نغمہ رہزن و ہوش۔ اور یہ گوگو معاملے۔ لو گو یہ ہم امریکہ کو دریافت کر رہے ہیں۔ یا امریکہ ہمیں دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خُدا خیر کرے۔

ہاں عشرتوں کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

تھینکس گیونگ ڈے یا یوم شکرانہ، ایک طرح سے امریکہ کی عید ہے، ہم عین اس عید کے روز سان فرانسسکو پہنچے تھے۔ جہاز میں بھی ٹرکی کھائی۔ آپ سمجھ لیجیے کہ اس روز کا خالص کھانا ہے۔ جس طرح ہم چھوٹی عید پر سوّیاں کھاتے ہیں۔ شام کو بازار میں بھی ٹرکی ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا عمر بھر کے لیے ٹرکی سے جی بھر گیا۔ اِن دِنوں ہر شخص تفریح کے لیے گھر سے نکل جاتا ہے۔ صرف سان فرانسسکو میں اِس روز اکیس آدمی ٹریفک میں مرے۔ سارے امریکہ میں سینکڑوں ہزاروں مرے ہوں گے۔ اِسی ایک روز، ریڈیو کی خبروں کے مطابق اِتنے قتل ہوئے۔ اتنے ڈاکے پڑے اور اتنے کیس اغوا اور بدمعاشی کے ہوئے کہ پاکستان میں سال بھر میں ہوئے ہوں گے۔ امریکہ ایسا مُلک ہے کہ یہاں ہر چیز دُنیا میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اِس شام تو ہم آدھی رات بعد تک تنہا گھومتے پھرے۔ دوسری دِن خیر

خواہوں نے ہمیں منع کر دیا۔ دیکھنے کی چیزیں دِکھانے والا کوئی دوست نہیں تھا۔ ہم تینوں پاکستانیوں نے پانچ پانچ ڈالر میں گرے لائن بس میں ایک چکّر شہر اور نواحات کا کر لیا۔ تین پھیرے تو گولڈن گیٹ برج ہی کے ہوئے جو دُنیا کے طویل ترین پُلوں میں سمجھا جاتا ہے۔ صرف پُل کی لمبائی پون میل سے زیادہ ہو گی۔ تصویر تو دیکھی تھی لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یُوں دو منزلہ ہے۔ نیچے ایک طرف کو سواریاں جاتی ہیں اور دوسری طرف سے آتی ہیں۔ ایک پرانا گرجا مِشن ڈولور بھی دِکھاتے ہیں جو ۱۷۷۶ء میں بنا تھا۔ یہاں کے لحاظ سے پرانی عمارت ہے اور اس میں قطعی کوئی خاص بات نہیں لیکن امریکہ کی ساری آبادی ہی نئی ہے۔ یہاں انگلستان، سپین، فرانس، جرمنی وغیرہ کے سے آثارِ قدیمہ تلاش نہ کیجیے۔ گولڈن گیٹ پارک مصنوعی ہے لیکن بہت ہرا بھرا اور پھیلا ہوا، جس میں ایک پارٹی گارڈن بھی ہے۔ اِس میں جاپانی طرز کے درخت لگے ہیں اور چند محرابیں بھی۔ جن لوگوں نے چین اور جاپان نہیں دیکھے وہ یہاں آکر مشرق کی فضا میں زور زور کے سانس لیتے ہیں اور تحفوں کی دُکان سے جاپان کی مصنُوعات خرید لے جاتے ہیں۔ کلف ہاؤس، سیل راک اور کئی دوسرے مقامات دیکھتا ہوا ہمارا قافلہ مچھیروں کے گھاٹ پر پہنچا۔ مچھیروں کا گھاٹ یعنی فشر منز وہارف بھی یہاں کی خاص جگہ ہے۔ جا بجا ریستوران ہیں جو تازہ مچھلی اور

کیکڑے بھون کر کھلاتے ہیں۔ اِن چیزوں سے تو ہمیں رغبت نہ تھی لیکن عین اِس ہجوم میں دو میوزیم ہیں۔ اِن میں سے ایک ہم ضرور دیکھنا چاہتے تھے۔ رپلے Ripley کی کتابیں آپ نے پڑھی ہیں۔ یہ شخص یہاں کا متوطن تھا اور جرنلسٹ تھا۔ صحیح معنوں میں آوارہ گرد تھا۔ دیس دیس گھومتا پھرا اور عجائبات جمع کرتا رہا۔ اُس نے کل ملا کر ۱۹۸ مُلکوں کی سیاحت کی۔ ہندوستان بھی آیا تھا اور لاہور بھی۔ اُس کا سِلسِلۂ عجائبات رسالوں اور کتابوں میں Believe it or not کے نام سے چھپتا رہا۔ اب تو آپ گئے ہوں گے۔ اُس کے انتقال کے بعد اُس کے جمع کردہ نوادر کے میوزیم بنا دیئے گئے جن میں سب سے اچھّا اور بڑا یہ سان فرانسسکو کا میوزیم ہے۔ ٹکٹ ظالموں نے پونے دو ڈالر رکھا ہے اِس لئے زیادہ لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ شروع میں تو بے چارا محض کارٹونسٹ تھا لیکن اِس کا سِلسِلہ مانئے نہ مانئے مقبول ہوا تو سینکڑوں اخباروں میں چھپنے لگا اور پھر اِسے درجنوں سیکریٹری اور اسسٹنٹ رکھنے پڑے جو معلومات جمع کرتے تھے اور رپلے کے نام سے چھپا کرتی تھیں۔

ہمارے ہاں ٹیلی ویژن پر عین پروگرام کے بیچ میں جو اشتہار دیے جاتے ہیں اُن پر ہمیشہ ہماری طبیعت خراب ہوتی ہے کہ یہ کیا شرافت ہے کہ فلم ہو رہی ہے۔ دیکھنے والے دم سادھے دیکھ رہے ہیں اور بیچ میں لوگ تیل بیچنے لگتے ہیں۔ اِس بات کا

خیال کئے بغیر کہ ہمارے پاس نہ ٹرک ہے نہ ٹریکٹر لیکن یہ نُسخہ یہاں سے لیا گیا ہے۔ یہاں ہمارے کمرے میں ٹیلی ویژن ہے اور اُس پر ہم قریب قریب ہر روز فلمیں دیکھتے ہیں۔ اِس وقت بھی کہ رات کے ڈھائی کے ہیں Horizon West ہو رہی ہے۔ اِس سے پہلے Seven Years Itch دیکھی جو ایک بجے ختم ہوئی تھی۔ فلم تو بہت اچھّی تھی لیکن اُس کے بیچ میں اشتہارات بہت دیکھنے پڑے۔ عین اِس وقت بھی ایک گنجا چرب زبان دلال سیکنڈ ہینڈ موٹر بیچ رہا ہے۔ اِن میں بعض ۱۹۶۹ء کے ماڈل بھی ہیں۔ ۱۹۶۸ء تو ردّی کے بھاؤ مل جائے گا۔ تیس پینتیس ڈالر نقد، باقی اتنے ہی کی قسطیں۔ اور زیادہ پرانی ہو جائے تو لوگ چُپکے سے اِسے کوڑے کے ڈھیر پر چھوڑ آتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ زبیری صاحب ۱۹۲۹ء کی فورڈ میں ہمیں حقارت سے پیدل چلتے دیکھتے گزر جاتے ہیں۔ ہاں تو یہ صاحب کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ کاریں گھاٹا کھا کر بیچ رہے ہیں کیونکہ ہم اپنی موجودہ جگہ کو چھوڑ کر شہر ہی میں دوسری جگہ جا رہے ہیں۔ اس جھوٹے سے پوچھا جائے کہ کار میں کوئی کھڑکیاں دروازے نہیں۔ نہ الماریاں ہیں۔ جہاں جا رہے ہو اُنہیں بھی لے جاؤ۔ گھاٹا کیوں کھاؤ۔ خلقِ خُدا کا فائدہ ہی کیوں دیکھو، ایک میرا ہی بھلا ہو۔ مُجھے منظور نہیں۔ ایک اشتہار سُن جو الیکٹرک ٹوتھ برش کا تھا جس کے متعلّق دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ دوسرے ٹوتھ

برش کے مُقابلے میں دانت ۴۲ فیصدی زیادہ صاف کرتا ہے۔ چالیس یا پچاس نہیں تاکہ آپ اِسے محض اندازہ نہ سمجھیں بلکہ ۴۲ فیصدی۔ ایک کُلّی کرنے کے محلول کا اشتہار بھی تھا۔ اِس سے کُلّی کرنے سے مُنہ سے خوشبودار ہو جاتا ہے کہ محبوب قدموں میں آن گرتا ہے۔ لیکن یہاں کے رواج کے مطابق لب بہ لب۔۔۔ ایک تو کُتّوں کی خوراک کے بارے میں تھا۔ دوسرے پروگراموں میں تو ٹھیک یہاں خبروں کے بیچوں بیچ اشتہار دیے جاتے ہیں۔ ابھی اِس ہفتے یہاں کا ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ نیوز ریڈر اعلان کر رہا تھا کہ ستّر آدمی ملبے میں دب گئے ہیں اور تازہ اِطّلاع کے مطابق یہاں کٹ اور اشتہار شروع کہ۔۔۔ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ پام آلیو شیمپو کے استعمال کے بعد آپ ناچ میں جائیں گے تو سبھی پروانہ وار آپ پر پر گریں گے۔۔۔۔ نیز ریڈر پھر نمودار ہو کر خبر مکمّل کرتا ہے کہ۔۔۔ خیال کیا جاتا ہے وہ سب کے سب مر گئے ہیں لہٰذا تلاش ختم کی جارہی ہے۔

آج یہاں کی زندگی کے دو تجربے اور ہوئے۔ باری صاحب کو اپنے بچّے کے پراجیکٹ کے لئے ۸ ملی میٹر کی فلمیں چاہیئے تھیں۔ یہاں آس پاس کئی دُکانیں ہیں جن کے باہر آرٹ فِلمز لکھا تھا۔ دُکاندار نے فوراً ایک نکال کر دکھائی۔ خالص عریاں۔ عریاں بھی ایسی کہ۔۔۔۔۔ باری صاحب نے کہا نہیں نہیں۔ دوسری

طرح کی۔ اب وہ بھلامانس دوسری نکال لایا جس میں صرف عورتیں ہی ننگی نہ تھیں بلکہ مرد بھی اور اِس فلم میں ظاہر ہے وہ خالی دھوپ نہیں تاپ رہے تھے۔ باری صاحب بولے۔ بابا عُریاں اور جنسی تصویریں نہیں چاہیں۔ ایسی فلمیں کہ گھر میں سبھی دیکھ سکیں۔ بچّے بھی، عورتیں بھی۔ دُکاندار بولا اور بولا اچھّا۔ وہ بچّوں والی جس میں مناظر ہوتے ہیں۔ ہوائی جہاز وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ملتیں۔ ہم نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ ایسی ہی دیدہ زیب تصویریں، رسالے اور کتابیں ہر طرف بھرے تھے اور اور اس قسم کی دُکانوں سے یہ سارا علاقہ پٹا پڑا ہے۔

صبح ہمیں خط پوسٹ کرنے کے لئے ٹکٹ چاہیں تھے۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر پوچھا تو اُنہوں نے کہا وہ مشین دھری ہے اُس میں سِکّے ڈالو نکال لو۔ پچیس سنٹ کا سِکّہ ڈالا۔ مشین نے دس دس سنٹ کے دو ٹکٹ دے دیئے۔ ہم نے سوچا باقی پانچ واپس کرے گی لیکن نہیں۔ پھر دوسرے خانے میں پچیس سنٹ ڈالے تو چھ چھ سنٹ کے تین دے کر چُپ ہو گئی۔ ہم نے ہوٹل کاؤنٹر پر شکایت کی کہ مشین خراب ہے۔ وہ شخص مُسکرایا۔ بولا مشین خراب نہیں ہے۔ یہاں یہی دستور ہے۔ یہ خدمتِ خلق کے لئے نہیں ہے، پیسے بنانے کے لئے رکھی گئی ہے۔ ہمیں اپنا کالم پوسٹ کرنے پر

پچھتّر سنٹ کے ٹکٹ لگانے تھے اِس چکّر میں پورا ایک ڈالر لگا۔

وقت پہیّہ ہے، سُنتے تو تھے۔ یہاں اس قدر معلوم ہوئی۔ دُکاندار سے آپ کوئی چیز نہ خریدیں تو راستہ تک نہیں بتائے گا۔ فیروز سنز کے ڈاکٹر وحید نے ایک بار بتایا کہ ایک شخص سے میری بڑی اچھّی خط و کتابت تھی۔ اُس نے مُجھے ایک روز کھانا کھلایا، پھر میں خالی ہوتا تو اُس کے دفتر میں جا کر بیٹھنے لگا۔ ایک دو خط بھی اُس کی سیکرٹری سے ٹائپ کرالئے۔ ایک روز اُس نے مُجھے خاصی رقم کا بِل دے دیا کہ آپ کے روزانہ یہاں آنے اور مُجھ سے باتیں کرنے سے میرے کاروبار میں اتنی رقم کا نقصان ہوا ہے۔ براہِ کرم ادا کر دیجیے۔ باقی رہی دوستی وہ اپنی جگہ ہے اور کھانا جو میں نے کھلایا تھا وہ کاروبار کا حصّہ ہے۔

قصّہ بریگیڈ صاحب کی جادُو شراب کا

جادُو شراب۔۔ ایک لطیف خوش رنگ جاں بخش مشروب جس میں مشرق کے تصوّف و روحانیت کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے اِس کا نُسخہ سکندرِ اعظم کے زمانے قریباً ۱۹۰ق م سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہ نسخہ سکندرِ اعظم نے ایک ہندوستانی راجہ کو عطا کیا تھا جس نے دریائے سندھ کے بھرے ہوئے پانیوں سے نکال کر اسے نئی زندگی بخشی تھی۔ یہ نسخہ اُس راجا کے خاندان میں کوئی بائیس سو برس رہا۔ وہیں سے یہ آپ کے میزبان خاکسار بریگیڈیر اِنگل کے ہاتھ آیا۔ اِن غیر معمولی اور خُفیہ خدمات کے صِلے میں جو ہندوستان کی تقسیم کے وقت اُس نے سرانجام دیں یہ لازوال نعمت کہ اب تک کسی خزانے کے مول بھی دستیاب نہ تھی اور پینے والے کے حُسن اور طاقت میں ترقّی کی ضامن ہے اب آپ کی خدمت میں پیش ہے ۷۵ سینٹ فی گلاس۔

ہم نے بریگیڈیر صاحب سے یہ نُسخۂ کیمیا کا اشتہار لیا اور تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کہا آپ کی عنایت لیکن ہم تو خود مشرقی تصوّف اور روحانیت کے نیل کے ماٹ میں سے نکل کر آئے ہیں اور پوری طرح وجودی اور شہودی رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور پھر ہمارے شہر میں طاقت کی ترقّی کے لیے اکسیری دوا خانے بہت بلکہ سبزے کی طرح روئے آب پر کائی بن کر جم گئے ہیں۔ یعنی ہوٹلوں میں جب جگہ نہ ملی تو فُٹ پاتھوں کو گھیر لیا ہے۔

JHADU SHARAB

(Magic Wine)

A delicate green tinted ambrosia, the perfume of which conjures up the mysticism of the East. It is believed that the recipe dates back to Alexander the Great and the Grecian invasion of India, circa 190 B.C. Said to have been given by Alexander to an Indian warrior Prince for saving his life in the swirling waters of the Indus River, the secret remained in the princely family, passing from father to son, for nearly 2200 years. It came into the possession of your host, Brigadier Ingall, for very special and confidential services rendered to the family on the Partition of India.

Jhadu Sharab has never been sold commercially before It is said to enhance the beauty and fecundity of the drinker.

per glass

$.75

اب رہی حُسن کی ترقّی سو اِس کی ہم میں گنجائش نہیں ہے۔ ہوتی تو کراچی والوں کی گورا کرنے کی کریمیں استعمال کر چُکے ہوتے۔ آپ تو بس ہمیں دال روٹی کھلوایئے اور ٹھنڈا پانی پلوایئے۔

بریگیڈیر اِنگل مشہور ہستی ہے۔ انگریز ہیں، ہماری فوج میں ہوتے تھے۔ ہمارے اعلیٰ فوجی افسروں میں سے اکثر اُن کی یاد اللہ ہے۔ کاکول اکیڈمی کے کمانڈنٹ رہے ہیں۔ آج کل سان فرانسسکو میں ایک ریستوران چلاتے اور ساتھ جادُو شراب بھی بیچتے ہیں۔ بہت خوش خلق توانا اور تندرست ہیں۔ اپنی جادُو شراب کا چلتا پھِرتا اشتہار۔ اپنے ریستوران کا نام اُنہوں نے "دی بنگال لانسر" رکھا ہے اور اندر باہر بنگال لانسر کے پرچم بھی لہرا رکھے ہیں۔ نیم تاریک ریستوران کے موم بتّیوں کے اُجالے میں دیواروں پر جا بجا تصویریں لگی ہیں، اِن کی فوجی خدمات کے دِنوں کی۔ ایک دو ہندوستانی خدمت گار بھی راجستھانی پگڑیاں باندھے یس سر یس سر کرتے پھر رہے تھے۔ یہاں میں پاکستانی قونصل جنرل انور صاحب از راہِ مسافر نوازی کھانا کھلانے لے گئے تھے اور اِس میں کُچھ شک نہیں کہ کھانا اچھّا خاصا تھا۔ یہی قورمہ پلاؤ وغیرہ۔ بریگیڈیر صاحب بھی تھوڑی دیر کو ہمارے پاس آ کر بیٹھے۔ ہم تین آدمی تھے۔ بیگم وجیہہ ہاشمی، اپوا کی کارکن۔ مشرق پاکستان کے وزیرِ صحت سماجی امور اور

لیبر۔ بریگیڈیر صاحب کی مردم شناس نظروں نے فوراً تاڑ لیا کہ کام کا آدمی کون ہے اور تابع مہمل کون؟ چنانچہ باری صاحب سے کہا آپ براہِ کرم مہمانوں کے رجسٹر میں دستخط ثبت فرما دیجئے۔ ساری عُمر میرے لئے یہ سرمایۂ افتخار رہے گا۔ ہم بریگیڈیر صاحب سے پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ خُفیہ اور قابلِ قدر خدمات کیا تھیں جِن کے صلے میں اُس راجا کے خاندان نے ۲۲ سو سال پُرانا نُسخہ نکال کر اُن کے قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن اِتنے میں اُنہیں کوئی اور وی آئی پی، غالباً کسی اور مُلک کا وزیرِ صحت سماجی بہبود لیبر دروازے میں داخل ہوتا نظر آ گیا اور وہ ہمیں چھوڑ اپنی خیر سگالی کا پاندان اُٹھا دروازے پر پہنچ گئے۔ سان فرانسسکو میں ایک طرح کا سحر اور جاذبیت واقعی ہے۔ اِس کے کوچے نیارے اور اِس کے خوباں پیارے ہیں لیکن مسافر کوچ کے گھڑیال سے کیسے کان بند کرے۔ پھر کب کون اِن گلیوں میں آئے۔ براڈوے میں گھومے۔ ساحل کی گشت کرے۔ یہ شہر ہے جہاں اقوامِ متحدہ نے جنم لیا اور جنم لے کر دوسرے ساحل پر نیویارک میں گھر جا بنایا۔ اِس سے کُچھ دور لاس اینجلز ہے لیکن ہمیں اُدھر جانے کا اذن نہیں۔ اِس کے پاس بالی ووڈ ہے کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرو سکندر را۔۔۔ ڈزنی لینڈ بھی کہیں انہی نواحات میں ہے۔ کُچھ نہیں دیکھا۔ کُچھ بھی تو نہیں دیکھا۔ خیر جاتے جاتے ایک چکّر کوچہ پُرپیچ

Crooked Lane کا اور ایک آخری سیر مچھیروں کے گھاٹ کی۔ ایک ڈُبکی اور رپلے کے بحرِ عجائبات میں جس کا ذکر ہم نے اُس روز کیا تھا۔ میوزیم ابھی کھلا ہے۔ کوئی یہ تو نہ کہے کہ اِس مخزنِ اسرار کو خود دیکھ لیا۔ ہمیں نہیں دکھایا۔

اے صاحبو چیزیں تو ڈھیروں ہیں اور نا قابلِ یقین داستانیں بھی جو رپلے نے جمع کی تھیں۔ بے شمار۔۔ اِن میں سے ایک سُنو کہ عجیب ہے۔ والٹر انگرم (۱۸۵۵۔ ۱۸۸۸ء) اسٹرینڈ لنڈن نیوز کا پبلشر مشہور آدمی تھا۔ ۱۸۸۴ء میں لارڈ ولزلے جو مُہم لے کر خرطوم گیا اُس میں یہ بھی تھا۔ پورٹ سعید میں اِسے ایک عرب گداگر ملا جس سے اِس نے ایک قدیم مصری شہزادی کا ممّی شُدہ ہاتھ خریدا۔ اِس ہاتھ کی ایک انگشت میں ایک انگوٹھی بھی تھی اور کلائی کے ارد گرد ایک بازو بند جس پر ہیرو غلافی حروف میں یہ بد دُعا رقم تھی۔

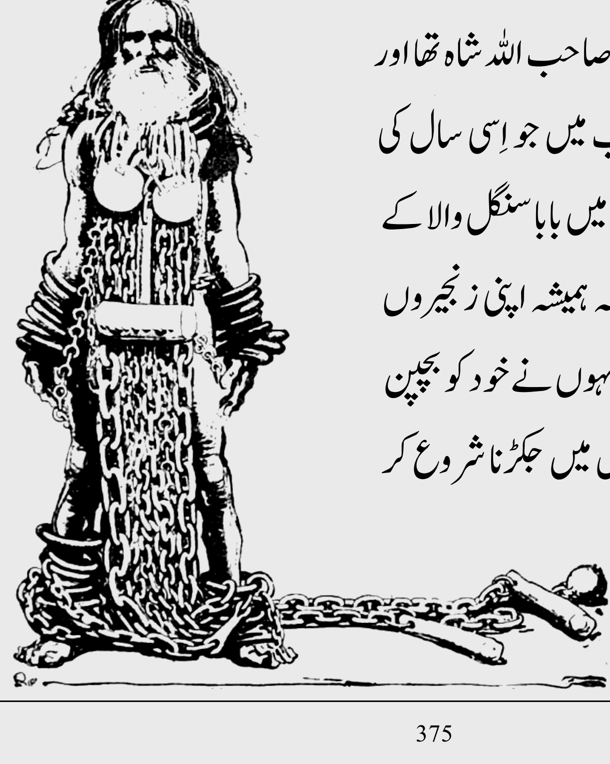
”جو شخص اِس لاش کو چھیڑنے کی جرأت کرے گا اور اِس کی ہڈّیاں کسی دُور دیس لے جائے گا، اُس پر تین لعنتیں، تین تباہیاں نازل ہوں گی۔ آگ۔ سیلاب۔ اور کشت و خون۔۔۔ آخر میں وہ اذیّت ناک موت مرے گا۔ اُس کی ہڈّیاں کہیں نہ ملیں گی اور وہ ہوا کی طرح چار کوٹ میں بِکھر جائیں گی۔“

چند ہفتے کے اندر ہی انگرم کا گھر سیلاب میں تباہ ہو گیا۔ اُس نے پھر تعمیر کیا تو سال بھر بعد آگ نے اُسے پیوندِ زمین کر دیا۔ اِس کے تیسرے گھر میں اِس کے ایک جِگری دوست کا قتل ہوا۔ اُس کی پُشت میں قاتل کا چاقو ترازو پایا گیا۔ اُس کا اپنا انجام یہ ہوا کہ افریقہ میں شکار کھیلتے ہوئے ایک خونی ہاتھی نے اُسے آلیا اور اس کی ہڈّیوں کو سُرمہ کر دیا۔ داستان یہاں آویزاں ہے اور اُس بازو کا ایک مثنیٰ برٹش میوزیم میں۔ آخر فنا آخر فنا۔

نہ صبر در دِل عاشق نہ آب در غربال۔ لیکن یہاں ایک ایسی چھلنی بھی دیکھی جس میں سے پانی نہیں گِرتا۔ ایک دھات دیکھی ایسی نرم کہ اُبلے پانی میں ڈالنے سے پگھل جائے۔ ایک لوہا دیکھا کہ پانی پر تیرتا ہے۔ آپ نے جل پری یعنی مرمیڈ کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہو گا، یہاں ایک نمونۃً رکھی ہے۔ اُوپر کا دھڑ انسان نما بلکہ بندر نُما، نیچے مچھلی۔ لکھا ہے کہ ایک بحری کپتان نے اِسے ۱۸۱۷ء میں کلکتہ میں خریدا تھا۔ لیکن پرکھنے والوں نے حکم لگایا کہ جزائر فجی کی یہ آبی مخلوق محض ڈھکوسلا ہے۔ کسی شاطر نے کسی بندر کا دھڑ لے کر مچھلی کے پائیں سے اِس طور جوڑا تھا کہ ٹانکے نہ نظر آتے۔ تھے آگے چلئے تو چارلس ورتھ کا مومی پیکر کھڑا نظر آئے گا جس کے چار سال کی عُمر میں داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ پانچ سال کی عمر میں چہرے پر

جھُرّیاں پڑ گئیں اور چھٹے سال میں اُس کی آواز چال ڈھال میں بُڑھاپے کی لرزش نمایاں ہو گئی۔ سات سال کی عُمر میں ہی جواں پیر مرد سال خوردگی کے ضعف سے دوسری دُنیا کو سدھار گیا۔ اِس پر لیبل ہے، ”وہ طفل خورد سال جو بڑھاپے کی موت مرا۔“

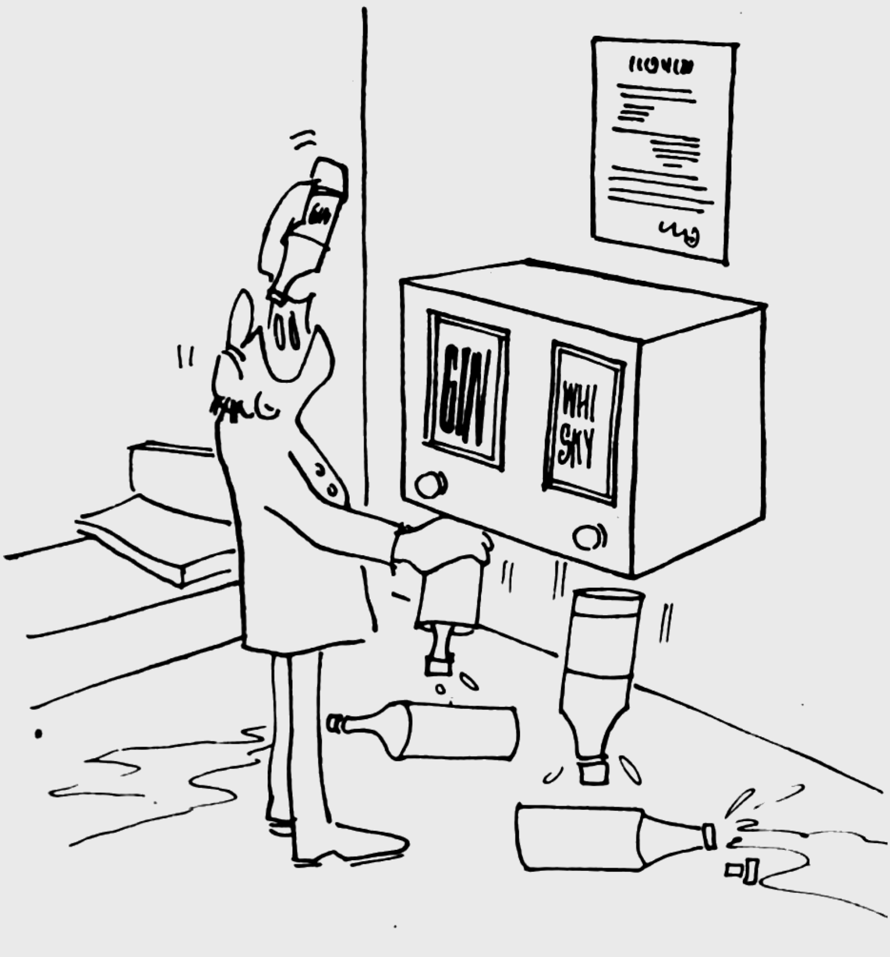
عقوبت و اذیّت کے آلات اور دوسرے قابلِ یقین عجائب کے پاس سے گزرتے ہوئے جو رپلے صاحب نے ۱۹۸ مُلکوں کی سیاحت میں جمع کئے تھے آپ ”بابا سنگل والا“ کی شبیہہ کے پاس جا کر رُکتے ہیں۔ گائیڈ بُک کی عبارت



کے مطابق اِن کا نامِ نامی صاحب اللہ شاہ تھا اور یہ لاہور واقع انڈیا (کتاب میں جو اِسی سال کی مطبوعہ ہے یہی لکھا ہے) میں بابا سنگل والا کے نام سے مشہور تھے کیونکہ ہمیشہ اپنی زنجیروں میں ملبوس رہتے تھے۔ اُنہوں نے خود کو بچپن ہی سے زنجیروں کے جال میں جکڑنا شروع کر دیا تھا اور اضافے پر اضافہ کرتے ہوئے

آخر میں اِس بوجھ کو آٹھ من تک پہنچا دیا تھا۔ پنجاب پولیس اِن کے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔ اب یہ کہنا مُشکل ہے کہ اِس بیان میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ کتنا۔ آخر رپلے تھا تو ہماری طرح جرنلسٹ۔۔۔وہ بھی امریکہ کا۔

۱۹۷۰ء کا سفر


GIN
WHI
SKY

آوارہ گرد کی ڈائری

اِن تین سال میں کہ لندن نہیں آئے لوگوں نے ہماری غیر حاضری کا بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ نئی نسل تو بالکل ہی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور ہمارا خیال ہے اِسے راہِ راست پر لانے کے لئے ہمیں بہت کوشش کرنی پڑے گی۔ بلکہ آسان تر راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود ہی راہِ راست پر آ جائیں۔ خود اِسی ہجوم میں شامل ہو جائیں۔ طبیعت میں ہماری شاعری اور وارستگی جوگ اور بجوگ پہلے سے وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ایک فقط گل مُچھے بڑھانے، بال بکھرانے اور لانبا چوغہ زیبِ تن کرنے کی بات ہے۔ ایسی سج دھج ہم نے پہلے نہ دیکھی تھی جو کبھی کسی شخص کا نقشہ آپ تصوّر میں لاسکتے ہیں وہ تو موجود ہے اور اِس کے علاوہ بھی عجب عجب سے اور طرح طرح کے ملبوس دیکھنے میں آئیں گے۔ پہلے لوگ نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے اب

دیکھتے بھی نہیں۔ منی اسکرٹ وغیرہ اب پرانے زمانے کی چیزیں ہیں۔ ڈراموں میں عُریانی کا دخل، اور سوہو کے نواحات عُریاں تصویروں والے رسالوں اور کتابوں کی فروخت جن کا اب تک شکاگو اور سان فرانسسکو میں چلن تھا بے شک اِن دو تین سال کی پیداوار ہے۔ لیکن تصویروں پر رال پکانے کی اب حاجت نہیں۔ آب آمد تیمم برخاست۔ لباس بھی ڈھیلے ڈھالے ہیں اور وہ جامہ بھی جسے ہم اخلاق کہتے ہیں۔ اچھّی بات یہ ہے کہ یہ جوڑے جو طرح طرح کے تھیلے لئے اور مونچھیں لٹکائے اور لمبی لمبی عبائیں قبائیں پہنے گھومتے ہیں، کسی کا کُچھ نہیں لیتے۔ اِن میں امریکہ والی سر شوری قطعی نہیں ہے۔ پھول اور منکے بھی اب کہیں کہیں ہیں۔ اب تو وارستگی صحیح معنوں میں طبیعتوں میں رچ گئی ہے۔ لباس تک محدود نہیں رہی۔ ان لوگوں کے چہرے مُہرے دیکھئے۔ کہیں نمائش و نمود کی رمق نہ ملے گی۔ یہ پرانی روایتوں کے خلاف بغاوت ہے۔ کسی کو خیال نہ تھا کہ یہ اتنی جلد پھیلے گی اور اتنی دور تک سرایت کر جائے گی۔ سرِ بازار چوما چاٹی کو جانے دیجئے کہ سوائے ہمارے مُلک کے اور سب جگہ رواج ہے۔ بس ہمارے مُلک میں خبریں چھپتی ہیں کہ ایمپریس مارکیٹ پر مسمّی فلاں اور مسماۃ فلاں بوس و کنار کرتے یا دعوتِ گناہ دیتے ہوئے پکڑے گئے۔ یہاں

یہ معمولات میں داخل ہے۔ آپ سامنے بیٹھے رہیے۔ آپ سے کیا پردہ۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہ سوٹ بوٹ جو ہم ڈانٹتے پھرتے ہیں اور جو انگریز کے لئے اٹھارویں صدی سے اب تک بمنزلہ ایمان رہا ہے کوئی دِن کی بات ہے کہ لوگ گھروں میں پہنا کریں گے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ پر گائی والوں کی دُکان ٹائیوں کے لئے مشہور رہے۔ اب کے ہم ساری دُکان بھی گھوم گئے۔ کہیں اِس قسم کی ٹائیاں نہ ملیں جیسی ہم پہنتے ہیں یا ہمارے مُلک والے پہنتے ہیں۔ اب تو پھولدار قمیصیں اور پھولی پھولی موٹی گانٹھوں والی پھولدار ٹائیوں کا رواج ہے۔ وہ بھی اگر آپ کو ضرور ہی ٹائی پہننی ہے۔ قمیصیں بھی اب گلابی اور نارنجی زیادہ ملیں گی۔ دیسی قمیصیں چاہئیں جیسی ہم ۱۹۶۷ء میں لے گئے تھے تو چراغ رُخ زیبا لے کر ڈھونڈیے۔ بہت سے آزاد منشوں کو تو ہم نے دیکھا کہ جوتا پہننا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میلے میلے پاؤں گھسیٹتے جا رہے ہیں۔ مستانہ بھی اور مستانی بھی۔

اے صاحبو جہاں قدامت زیادہ ہو جاتی ہے وہاں بغاوت کے اکھوے بھی زیادہ پھوٹتے ہیں کیونکہ یہ انگریز بہادر ہی تھا کہ تنہا جنگل میں خیمے میں بھی کھانا ڈنر جیکٹ زیبِ تن کئے بغیر نہ کھاتا تھا۔ اور اُس کی برکت ہے کہ ایک بار ہم کراچی کے مِڈ

وے ہاؤس میں بغیر ٹائی کے کھانا کھانے چلے گئے تھے تو نہایت نرمی اور اخلاق سے نکال دیئے گئے تھے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ اِس سج دھج کے لوگ ہمیں اب اچھّے لگنے لگے ہیں۔ اِن کے چہروں پر سادگی اور خلوص زیادہ ہے۔ رنگین پاجامے، کالے اسکرٹ ٹخنوں کو چھوتے ہوئے بستر بستے ایک سے ایک گُل پیرہن۔ ایک سے ایک کج کلاہ۔ اگر کوئی لڑکی یا لڑکا اس لباس میں نظر آئے جسے ہمارے ہاں بھلے مانسوں کا لباس کہا جاتا ہے تو لوگ اُنگلیاں اٹھاتے ہیں۔ دیوانے اِتنے ہو گئے ہیں کہ فرزانے کونوں کھدروں میں چھپے جا رہے ہیں۔ ہم ایک بار پھر کہیں گے کہ یہ اچھّا ہی ہے۔ رسوم و قیود کے خُمار کی سرکشتگی کے ڈانڈے منافقت سے ملے رہے ہیں۔

اور مہنگائی۔۔۔ اے دوستو! یہ غریب پرور شہر اب غریب پرور نہیں رہا۔ انڈر گراؤنڈ یعنی ٹیوب کا ٹکٹ جو چار پینس یا چھ پینس میں آتا تھا، اب دو شلنگ اوت تین شلنگ میں آتا ہے۔ کپڑوں اور جوتوں کے دام دُگنے ہو گئے ہیں۔ کمروں کے کرائے بھی چڑھ گئے ہیں۔ پچھلی بار ہم آٹھ پونڈ ہفتے کے کمرے میں رہتے تھے جس کے کونے میں شاور بھی تھا۔ اب کے پندرہ پونڈ ہفتے کے کمرے کا احوال ہے کہ کبھی بت کدے میں کریں بیاں تو کہے صنم بھی ہری ہری۔

دُنیا جہان کے ٹورسٹوں نے لندن پر دھاوا بول دیا ہے۔ سُنا ہے کہ آج کل کرائے اسی لئے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ہم جیسے بے استطاعتوں کے لئے یہ بہت ہے۔ حالانکہ اِسی شہر میں ایسے پاکستانی بھی آئے ہوئے ہیں جو سو پونڈ ہفتے فلیٹ کا کرایہ دیتے ہیں۔ عیش کوشی میں بابر کی قبر پر لات مارتے ہیں اور پھر پاکستان چلے جاتے ہیں۔ خُدا اِن کو یہ سب مبارک کرے لیکن حلال کی کمائی میں تو یہ اللّے تللّے نہ ہو سکتے ہیں۔

اب کُچھ میرے گھر کا حال بھی سنتے جایئے۔ ارل کورٹ کے ٹیوب اسٹیشن کے عقبی راستے سے نکلی تو نیم دائرے میں فِل بیچ گارڈنز کا محلّہ ہے۔ انگریز بھی خوب آدمی ہیں۔ جہاں دو پتّیاں گھاس کی ملیں اُسے گارڈرز کا نام دے دیا۔ اتّفاق سے یہاں وہ بھی نہیں۔ اِس نیم دائرے کے بیچ جا کر فِل بیچ ہوٹل ہے اور اِس فل بیچ ہوٹل کو آج ہمارا دولت خانہ یا غریب خانہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہمارا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب ہم نے اِس کے سامنے سامان جا کر اُتارا اور کاؤنٹر پر جا کر کہا کہ ذرا پورٹر کو کہیئے سامان اُٹھا لائے اور کمرے تک پہنچا دے۔ جواب ملا ہمارے ہاں کوئی پورٹر نہیں ہے۔ اِس کے بعد مینجر صاحب ہمیں کمرہ دکھانے کے لئے کھٹ کھٹ

سیڑھیاں نیچے اُتر گئے۔ یہ تہہ خانہ تھا اور اِس میں دھوبیوں کی گٹھڑیاں بکھری ہوئی تھیں اور کوئی شخص لکڑی چیر رہا تھا اور ایک کمرے پر نمبر ۳ لکھا تھا کہ ایک کو لگی ہے کوئی چھ فٹ عرض کی طول اس سے دو فِٹ زیادہ۔ اس میں ایک طرف کو مسہری پڑی ہے اور کونے میں مُنہ ہاتھ دھونے کے لیے بیسن کا انتظام ہے۔ کرسی بھی اِس کمرے میں ضرور ہوتی بشرطیکہ رکھنے کی گنجائش ہوتی۔ ہم نے مینجر صاحب سے کہا حضرت اِس حُجرے میں تو ہم نہیں رہ سکتے۔ بولا جناب یہاں تو یہی ہے گر قبول افتد زہے عزوشرف۔ چونکہ تنخواہ نہ بڑھائے جانے کی صورت میں ہم اِسی تنخواہ پر کام کرنے والے آدمی ہیں لہٰذا اپنے کروفر اور عالی دماغی سمیت وہیں فروکش ہو گئے۔ دیکھا کہ ایک کھڑکی بھی ہے۔ یہ ایک پچھواڑے میں کھلتی تھی اور اُس کے اندر ہمیں کوڑے کے ڈرم نظر آئے۔ آخر ہم نے کھڑکی کو بند کیا اور پردہ ڈال دیا اور اُدھر سے بالکل ہی آنکھیں پھیر لیں۔ آخر ہمارے پیر و مُرشد حضرت میر تقی میرؔ بھی یہی کرتے تھے۔ اُن کے لئے کھڑکی اور دریچے کا مصرف نہ تھا۔ ہم اُسے کھول کر کیا کرتے؟

ہم نے دروازہ بند کیا اور کھڑے ہو کر کمرہ کا جائزہ لیا۔ تولیہ تھا لیکن تولیہ ٹانگنے کی جگہ نہ تھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دیوار پر ایک ریڈیو نما چیز نصب ہے اور اُس میں طرح طرح کے بٹن لگے ہیں۔ پہلے ہم سمجھے کہ ہماری حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کے لئے کمپیوٹر کا انتظام کیا گیا ہے۔ حالانکہ اِس کمرے میں سکنات ہی کی گنجائش تھی۔ کسی قسم کی حرکات کا سوال نہ تھا۔ غور سے دیکھنے پر ایک تحریر بھی نظر آئی۔

> ”سرپرستوں سے گزارش کی جاتی ہے کہ اِن کو اسکاچ وہسکی کی طلب ہو تو دہنی طرف کی دراز کو دبا کر اپنی طرف کھینچیں۔ فوراً وہسکی کی بوتل حاضر ہو جائے گی۔ جن صاحبوں کو جِن (Gin) مطلوب ہو وہ بائیں ہاتھ کی دراز سے یہ خدمت لے سکتے ہیں۔ کمرے سے باہر نہیں جانا پڑے گا اور قیمت خود بخود اُوپر دفتر میں آپ کے بل پر درج ہو جائے گی۔“

ہم نے کہا: ”یہ تو بڑی مُفید ایجاد ہے۔ آپ مسافروں کے آرام کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کوئی ایسا بٹن بھی ہے جسے دبانے سے پانی نکلتا ہو کیونکہ پانی پینے میں ہم بلانوش مشہور ہیں۔ خم کے خم لنڈھاتے ہیں۔“

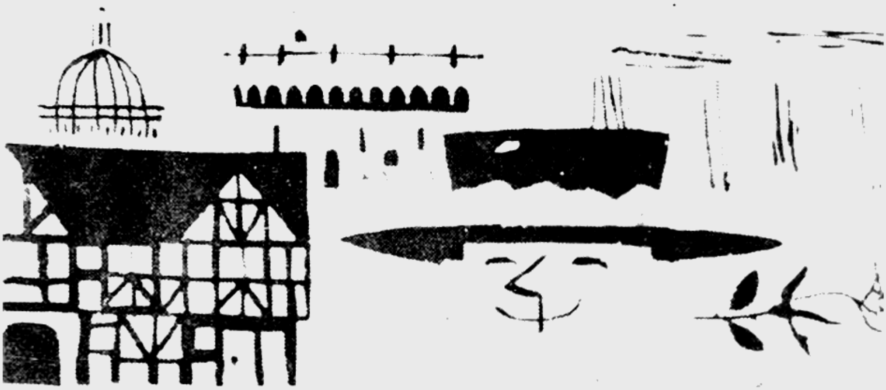
مینجر نے کہا۔ ”جی نہیں۔ پانی اِس میں سے نہیں نکلتا۔ اِس کے لئے نلکا موجود ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”باتھ روم ہمارا کیا ہے؟“

مینجر نے کہا۔ ”باتھ روم؟“ اور پھر ہنسا یعنی یہ مُنہ اور مسور کی دال!

لندن میں کوئی شخص نہانے کی بات کرے تو سمجھو کہ لندن کا نہیں۔ لندن کے باہر کا ہے۔ یُوں تو لندن میں اب لندن کا رہ کون گیا ہے۔ راستہ پوچھو تو مخاطب یہی کہیں گے کہ معاف فرمایئے۔ میں بھی اجنبی ہوں کیا آپ مُجھے فلاں روڈ کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ کوئی دِن میں لندن میں انگریزوں کا وہی حال ہو گا جو امریکہ میں قدیم باشندوں کا اور ہندوستان میں دراوڑوں کا ہوا۔ باہر دھکیل دیئے جائیں گے۔ ہاں تو ذکر نہانے کا تھا۔ ولایت والے یہ آزار کم پالتے ہیں۔ ابھی کل ہی فلیٹ اسٹریٹ جاتے ہوئے ڈاکٹر جانسن کے مکان پر جا نکلے۔ ڈاکٹر جانسن کو آپ جانتے ہیں۔ مصنّف کتبِ کثیرہ، جس کی ڈکشنری بھی مشہور ہے۔ ہم نے سارا مکان دیکھ ڈالا۔ واقعی بہت آرام دہ ہے۔ اُس زمانے میں تیس پونڈ سالانہ کرایہ تھا جو ہمارے مذکورہ بالا کمرے کے دو ہفتے کے کرائے کے برابر ہے۔ باقی تمام انتظامات تو تھے لیکن پورے مکان میں غُسل خانہ کوئی نہ تھا۔ ہم نے مکان کی نگران صاحب سے پوچھا کہ غُسل خانے کے

بغیر گھر؟ بولیں اُس زمانے کے لوگ نہاتے کہاں تھے۔۔۔ بس پوڈر چھڑک لیتے تھے۔ دیگر حاجاتِ ضروریہ کا پوچھا تو معلوم ہوا پردہ لگا کر برتن رکھ لیتے ہوں گے۔ قرونِ وسطےٰ میں تو سچّے عیسائی کی نشانی یہ تھی کہ کبھی نہ نہاتا ہو۔ اگر کوئی ہفتے کے ہفتے باقاعدگی سے نہانے والا ہو تو اُسے مسلمان سے تشبیہ دیتے تھے اور موقع ملے تو پکڑا کر ایذا کی مشین سے بھی باندھ دیتے تھے۔



ڈاکٹر جانسن کے ایک کمرے میں ارل آف چیسٹر فیلڈ کی تصویر بھی لگی ہے۔ اِن رئیس صاحب سے جانسن کو بہت توقعات تھیں کہ ڈکشنری کے سِلسلے میں مالی مدد دیں گے۔ اُنھوں نے کوئی اعتنا نہ کی۔ تا آنکہ یہ کام اختتام کو پہنچا اور اُس کی شہرت ہوئی۔ اب یہ صاحب متمنّی ہوئے کہ کچھ داد و ہش کریں اور ڈکشنری کا انتساب

اپنے نام کرائیں۔ جانسن نے اُس پر ۷ فروری ۱۷۸۸ء کو جو خط جناب ممدوح کو لکھا وہ مشہور ہے:

”مائی لارڈ! سات سال تک میں آپ کی عنایات کا متمنّی رہا۔ جاتا تھا اور آپ کی ڈیوڑھی سے محرومِ ملاقات واپس آجاتا تھا۔ آپ کے درِ دولت کے بے شمار پھیرے کئے۔ اِس دوران میں اپنے کام میں جٹا رہا اور اُس کی مشکلات کا بیان لا حاصل سمجھتا ہوں۔ اب میرا سفینہ کنارے پر لگا ہے۔ اِس دوران میں تو آپ نے مدد کے لئے اُنگلی تک نہ اُٹھائی۔ حوصلہ افزائی کا ایک بول نہ بولا۔ التفات کی ایک نظر نہ کی اور اب۔۔۔۔؟ معلوم ہوتا ہے پیسے والوں اور علم والوں کے درمیان ہمیشہ اور ہر جگہ اِسی قسم کا رشتہ رہا ہے۔ یہ تحریر پڑھ کر ہمیں فرہنگِ آصفیہ والے سیّد احمد دہلوی بہت یاد آئے۔ وہ لغّت نگاری میں اُردُو کے ڈاکٹر جانسن ہی تو تھے۔ اُن کی لُغّت صرف لفظوں کی کہانی نہیں اُن کی اپنی روداد بھی ہے۔



لندن میں ہرے رام۔ وغیرہ

آج جو آکسفورڈ اسٹریٹ سے ہمارا گزر ہوا تو کانوں نے ایک عجیب آواز سُنی اور آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک انگریزی بہادر، سر منڈا ہوا، بیچ میں لانبی اور مرے ہوئے چوہے کی طرح پھولی ہوئی چوٹی، گیروا دھوتی زیبِ تن جس کا پلّو ہر دوار کے پنڈتوں کی طرح پیچھے اڑسا ہوا۔ ڈھولکی بجاتے اور جھومتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے دوسرے انگریزی عینک پوش، اِسی ہئیت یا بد ہئیتی میں جھانجھ بجاتے اور مٹکتے ہوئے گھٹنوں کو خم دیئے کبھی دہنی طرف بوجھ ڈالتے ہوئے کبھی بائیں رُخ جھکتے ہوئے۔ دونوں ہرے رام ہرے رام اور نہ جانے کیا کیا اپنی دانست میں سنسکرت کے اشلوک جاپتے ہوئے۔ اِن کے پیچھے اور آگے ایک ایک آدمی اسی وضع قطع کا پمفلٹ بانٹتا جا رہا۔ تھا لوگ ایک نظر دیکھتے اور مُسکرا کر گزر جاتے۔

ایک پمفلٹ ہماری طرف بھی بڑھایا۔ ہم نے کہا یہ کیا ہے؟ بولے اوم شانتی شانتی۔ ہم نے کہا کتنے کی ہے اوم شانتی؟ بولے قیمت کچھ بھی نہیں لیکن قدر دانوں سے چندے اور دان کی توقّع کی جاتی ہے۔ ہم نے لے کے دیکھا کچھ بھی نہیں تھا۔ اُوپر ایک سوامی جی کی تصویر تھی۔ ننگی توند لئے آلتی پالتی مارے، آنکھوں میں خمار جو روحانیت کا تھا یا پھر پُرخوری کا تھا۔ کچھ اور اوراق پند و نصائح کے سائیکلو سٹائل کئے ہوئے۔ یہ تماشا اور ایسے تماشے یہاں بہت ہیں۔ جو چیز اِن لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے اُس سے یہ رُعب کھا جاتے ہیں۔ یہاں بہت سے سوامی اور ہڑ پو پو اڈے جمائے اور مٹھ بنائے بیٹھے ہیں۔ بنکوں میں پونڈوں کی تھیلیاں جمع کئے جا رہے ہیں۔ یوگا کا کاروبار تو ایسا پھیلایا ہے کہ انگریز اپنے نصاب شامل کر رہے ہیں۔ ہرے رام ہرے رام۔ روٹی کھائے شکر سے، دُنیا کھایئے مکر سے۔

اب سردی چمک رہی ہے۔ کئی دِن سے بارش ہو رہی ہے۔ بارش یہاں موسلا دھار نہیں دیکھی۔ بوندا باندی، کبھی اِس سے کچھ زیادہ۔ یاد رہے کہ ہم نے کمرہ بدل لیا ہے۔ اُس ہوٹل میں دوسری منزل پر چلے گئے۔ بہت غنیمت ہے۔ یہاں آکر ہم پر بھی انگریزوں کا رنگ چڑھ گیا۔ مثلاً کئی کئی دِن نہ نہانا۔ چھاتا لے کر چلنا، اخبار خرید

کر پڑھنا۔ وہ تو ہمارا رنگ ذرا سا میلا نکل گیا ورنہ انگریز مجبور کرتے کہ یہیں رہ جاؤ۔ رین کوٹ اور چھتری یہاں کے لوگوں کا لازمۂ طبیعت بن گیا ہے۔ گھر میں ایک سے دوسرے کمرے میں بلکہ غُسل خانے میں بھی جائیں تو برساتی اور چھتری کے بغیر نہیں جاتے۔ اور نہ پڑھنا ہو تب بھی اخبار خریدتے ضرور ہیں۔

پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ برطانوی اخبارات سے آپ نہیں جان سکتے۔ اِن دو ہفتوں میں ہم سارے اخبار دیکھتے رہے۔ کہیں ہمارے مُلک کا ذکر بہ بدی بھی نہیں آیا۔ پچھلا ہفتہ تو ہائی جیکنگ کی خبروں میں گزر گیا۔ اب ایک مقدمہ ہے جس کی روداد صفحے کے صفحے گھیر رہی ہے۔ گزشتہ جنوری کی بات ہے، ہفتہ وار اخبار نیوز آف دی ورلڈ کے ڈپٹی چیئر مین مسٹر میکی کی بیگم غائب ہو گئیں۔ بعد میں اُن کو نامعلوم لوگوں کی طرف سے دھمکیاں موصول ہوئی کہ دس لاکھ پونڈ ادا کرو تو چھوڑیں گے۔ پولیس کو اِطّلاع دی گئی۔ حسب ہِدایت دو سوٹ کیسوں میں نوٹ بھر کر (اُوپر اصل نوٹ باقی گڈّی میں خالی کاغذ) مقرّرہ جگہ پر رکھے بھی گئے لیکن کوئی لینے نہ آیا۔ پولیس نے بڑی روڈ دھوپ کے بعد دو آدمیوں کو گرفتار کیا۔ ایک کا نام اخبارات آرتھر حسین لکھتے ہیں۔ غالباً اظہر حسین ہو گا اور دوسرا اس کا چھوٹا بھائی

نظام دین۔ ٹرینی داد (جزائر غرب الہند) کے رہنے والے۔ اِس برِّصغیر سے گئے ہوں گے اِس لئے اخبارات اِن کو انڈین لکھتے ہیں۔ یہ لوگ جلد از جلد لکھ پتی بننا چاہتے تھے اور یہ سُن کر کہ نیوز آف دی ورلڈ کا چیئر مین مرڈوک بہت امیر آدمی ہے اپنی دانست میں اُس کی بیوی کو اغوا کیا تھا۔ شومئ قسمت کہ مرڈوک آسٹریلیا چھٹّی چلا گیا تھا اور کار جس کی نشانی اِن بھائیوں نے رکھی تھی مسز میکی کے استعمال میں تھی۔ معلوم ہوتا ہے مایوس ہو کر اِن لوگوں نے مسز میکی کو قتل کر دیا۔ اس قسم کے واقعات ہی سے تارکینِ وطن کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکتی ہے۔ خُدا کا شکر ہے اخباروں نے ملزموں کو پاکستانی نہیں لکھا۔ یہاں وطن عزیز کی خبروں کی بڑی طلب رہتی ہے۔ کبھی کہیں جنگ اخبار مل جاتا ہے لیکن دو تین دِن کی تاخیر سے۔ آج پڑھا تو معلوم ہوا کہ قیامت خیز بارشوں کا سِلسِلہ جاری ہے۔ ہم اسے اپنی تر دامنی کا شاخسانہ جانتے تھے۔ لیکن اب تو ہم کو کراچی چھوڑے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے حصّے کی بارش یہیں بہت ہو رہی ہے۔ یہاں سے جو ہفتہ وار اخبارات نکلتے ہیں وہ پاکستان کی خبروں کا خلاصہ دیتے ہیں اور چونکہ اِن سے وطن کی مٹّی کی خوشبو آتی ہے اِس لئے جہاں مل جائیں لوگ خریدتے ہیں۔ مشرق اِن میں

سب سے پرانا ہفتہ وار ہے۔ یہ لندن سے نکلتا ہے۔ ایشیا بھی جو برمنگھم سے نکلتا ہے خاصا پرانا ہے۔ اخبارِ وطن اِسی انداز کا ہے لیکن نسبتاً حال کی پیداوار۔ اِن کے علاوہ نوٹنگھم سے آفاق نام کا ماہوار رسالہ اور برمنگھم سے تصویر نکلتا ہے۔ ایک رسالہ جدید اردو ڈائجسٹ کے نام سے بھی نکلتا ہے۔ سُنا ہے ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ بعض جگہوں پر پاکستان کے کُچھ رسالے بھی آتے ہیں اور کتابیں بھی جن کے اشتہارات ان پرچوں میں چھپتے ہیں۔ اب لندن سے اُردُو کا ایک روزنامہ جنگ نکلنے والا ہے۔

برطانیہ کا شیر بُڈّھا ہو کر اور سیّاس ہو گیا ہے۔ لیکن سیانا کوّا کبھی کبھی وہ چیز بھی کھاتا ہے۔۔۔ عربوں اور لیلیٰ خالد کے معاملے میں یہی ہو رہا ہے۔ لیلیٰ خالد کو چھوڑنے میں لیت و لعل کی اور جہاز گنوایا۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پچاس جوتے کھالئے۔ اب پچاس پیاز بھی کھائے گا تو اِس کو چین آئے گا۔

پچھلے دنوں یہاں کامن ویلتھ کی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ بلکہ نام کتاب میلے کا تھا۔ ہم کو بھی بُلایا تھا۔ ہم بھی گئے۔ دیکھا کہ پاکستان کے نام سے فقط پانچ کتابیں رکھی ہیں۔ اِن میں ایک ہیکٹر بولتیھو کی سوانح قائد اعظم، ایک آئن اسٹیفنز کی کتاب، ایک دو کتابچے زراعت وغیرہ پر کسی سرکاری محلے کے چھاپے ہوئے اور ایک کتاب عارف

حسین صاحب کی پاکستان کی آئیڈیالوجی اور خارجہ پالیسی کے موضوع پر۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ہندوستان کی کتابیں اِس سے دس گناہ زیادہ تھیں۔ لیکن زیادہ زور اب افریقہ پر ہے۔ ہم تو اب کامن ویلتھ کے پانچویں سوار ہیں۔ زیادہ تیل افریقہ کے تِلوں ہی میں ہے۔ نہ صرف نیا لٹریچر افریقہ پر ڈھیروں ہے بلکہ پچھلی صدی کی لکھی ہوئی کتابیں بھی دوبارہ چھاپ دی ہیں۔ زیادہ تر غُلامی کے موضوع پر۔ اِن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح افریقہ ظلمات کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ کس طرح انگریز آئے اور اِسے غُلامی سے نجات دلائی، انفرادی غُلامی سے۔

شاہی لُٹ گئی تو کیا ہوا۔ ابھی اِس کے ادب آداب باقی ہیں۔ ہم جو کامن ویلتھ انسٹیٹیوٹ کی رفیع الشّان عمارت میں داخل ہوئے تو دس دس گز پر روایتی وردیوں والے انگریز چاؤش کھڑے تھے۔ ایک نے آہستگی سے نام پوچھا اور پھر باآوازِ بُلند پکارا۔ ”مسٹر انشا فرام پاکستان۔“ اِس پر ایک صاحب بہادر آگے بڑھے اور بڑے اخلاق سے ہمارا پنجہ چھُو کر ہاؤڈو یوڈو کیا۔ ہم نے بھی کیا۔ ہاؤڈو ہوڈو مسٹر جان بُل، راضی باضی، بیوی بچّے تو خیریت سے ہیں۔ ہور کی حال اے۔

موم بتّی کی تلاش

لندن میں چاندنی راتیں نہیں ہوتیں۔ یہاں ایسی ضرورت نہیں ہوتی۔ چاند اور چاندنی کو تو مجبوری اور رنجوری والے دیکھا کرتے ہیں۔ چاند بے شک یہاں بھی نکلتا ہے لیکن چاندنی کو یا تو بادل روکے رکھتے ہیں یا شہر کا دھواں یا بجلی کی چکاچوند۔ یہاں چاند کے ذریعے محبوب کو پیغام دینے کا رواج نہیں اور کوئی حُسنِ لب بام کو آزردگی سے تکتا ہے کہ نہ بزوری نہ بزاری نہ بزرمی آید۔۔ چوما چاٹی سرِ بازار بھی ہے اور بسوں، ٹرینوں میں بھی۔ کسے رابا، کسے کارے نہ باشد۔۔۔ عاشقی کا یہ ہے کہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ یہ نہیں کہ میاں مجنوں کی طرح محمل کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں اور سوکھ کر کانٹا ہوئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں آج بھی بحث چل رہی ہے کہ فلموں میں بوسہ بازی کی اجازت ہونی

چاہئے یا نہیں۔ پاکستان میں تو یہ بحث شروع بھی نہیں ہوئی۔ یہاں جسمانی ملاپ کے تمام مرحلے فلم میں دیکھ لیجئے اور اسٹیج پر بھی۔ آج کل فلم کام سوترا یہاں کے ایک سینما میں چل رہی ہے۔ فلم پنڈت کوکا کی بنائی معلوم ہوتی ہے اور اِس میں کام کرتے ہیں سعید جعفری اور چترا۔ کام سے مطلب کوئی ہے کام دیوتا والا کام۔ ہیروئن ایک صاحبہ ہیں چترا۔ اِس فلم کے ہیرو سعید جعفری سے ہماری اب کے تو نہیں پچھلی بار ملاقات رہی۔ ہونہار نوجوان ہیں۔ ہمیں اُنہوں نے تھیٹر بھی دکھایا تھا۔ یہ اور یہ ہیروئین دونوں ہندوستان کے متوطن ہیں۔ اِس فلم میں کام کرنا اُنہوں نے کیسے گوارا کیا۔ یہاں آکر سارے حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ سعید جعفری کو آپ لوگوں نے بھی دیکھا ہو گا۔ پچھلے دِنوں ٹیلی ویژن پر پیسیج ٹو انڈیا دکھائی گئی ہے، اُس میں وکیل بنے تھے۔ کل ہمارے ایک میزبان نے ریمی نامی کھیل بھی دکھایا۔ کھیل کیا ہے انسانی جسم کے خطوط کجدار و مریز دِکھانے کا بہانہ ہے۔ سچ یہ ہے ہمیں پسند نہیں آیا۔ مشرق کے بہت سے مسکینوں کا دِل جو مغرب میں جا اٹکتا ہے اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

یہاں لوگ برسوں سے پڑے ہوئے ہیں لیکن جس میں ذرا سی بھی صاحب دلی ہے وہ وطنِ عزیز کے لئے تڑپتا ہے۔ سوائے چند ایک کے کسی نے یہاں کی شہریت بھی لینی پسند نہیں کی۔ جو مزا چھجّو کے چوبارے میں، وہ بلخ بخارے میں نہیں۔ یوسف کہ بہ مصر تاجداری می کرد۔ می گفت گدا بودن کنعان خوش تر۔ پچھلے دنوں ایک دوست کے گھر میں پلاؤ اور قورمہ کھاتے ہوئے بحث چھڑ گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایسے احدی قسم کے لوگ ہیں کہ کلیدی انگریز نہ آتے تو ہم سائنسی علوم سے بے بہرہ بہت پیچھے رہ گئے ہوتے۔ افغانستان کا سا حال ہوتا۔ مختار زمن ہم سے شد و مد سے اختلاف کر رہے تھے۔ اِس بحث میں ہماری شاندار ہار ہوئی۔ یہاں پاکستانیوں کو آ کر یہ کوفت ہوتی ہے کہ ہندوستان کا ذکر ہر جگہ ہے۔ پاکستان کا کہیں نہیں۔ اگر ہے تو سرسری ہے۔ ہندوستان پرانی چیز ہے۔ ساری تہذیبی، نُدرتیں اور روحانی خوبیاں اُس سے منسوب چلی آ رہی ہیں۔ پاکستان کے متعلّق یہ خیال ہے کہ تعصب قسم کے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ کسی اور کو یہاں نہیں رہنے دیتے۔ اسلام اور مسلمانوں سے اہل مغرب ہمیشہ سے بِدکتے آئے ہیں۔ اِن کی برق بھی گرتی ہے تو ہر پھر کے بے چارے مسلمانوں پر۔

اکتوبر شروع ہو چکا ہے اور موسم کا حال یہ ہے کہ بُشرٹ اور ٹھنڈی پتلون میں باہر گھومنے کو دِل چاہتا ہے۔ کل اور پرسوں ایسی گرمی تھی کہ ریڈیو کے اعلان کے بموجب پچھلے گیارہ سال نہیں پڑی۔ یہاں دروازے کھڑکیاں بند رکھنے کا دستور ہے اور پنکھے ونکھے نہیں ہوتے۔ اِس گرمی میں بھی وضع کے مارے سوٹ، سوئیٹر، برساتیاں اور اوور کوٹ لئے گھومتے پھرے۔ ہمارے اِس گرم سوٹ نے کہ ذرا موٹا ہے، جان سے بیزار کر دیا۔ ایک دو بار تو اِسے اُتار کر بازو پر بھی ڈالا۔ ہمارے پاس ایک ہلکا سوٹ بھی ہے لیکن افسوس یہاں موم بتّی یا موم نہیں ملا لہٰذا اسے استعمال نہیں کر سکے۔

اب اس معمّے کا حل اور اجمال کی تفصیل سن ہی لیجئے۔ کراچی سے ہم چلے تو یہ ہلکا سوٹ زیبِ تن تھا۔ بغداد میں آدھی رات کو پہنچے۔ ہم سیٹ پر بیٹھے رہے اترے نہیں۔ کافی دیر کے بعد ذرا تازہ ہوا کے لئے اُترے پھر ٹرانزٹ میں بھی چلے گئے۔ وہاں خیال آیا ذرا باتھ روم میں جانا چاہیئے اور وہاں ہمارے ساتھ یہ ماجرا گُزرا کہ زِپ جو آج کل پتلون میں بٹنوں کی جگہ لگائی جاتی ہے کھُل گئی لیکن بند ہونے سے اُس



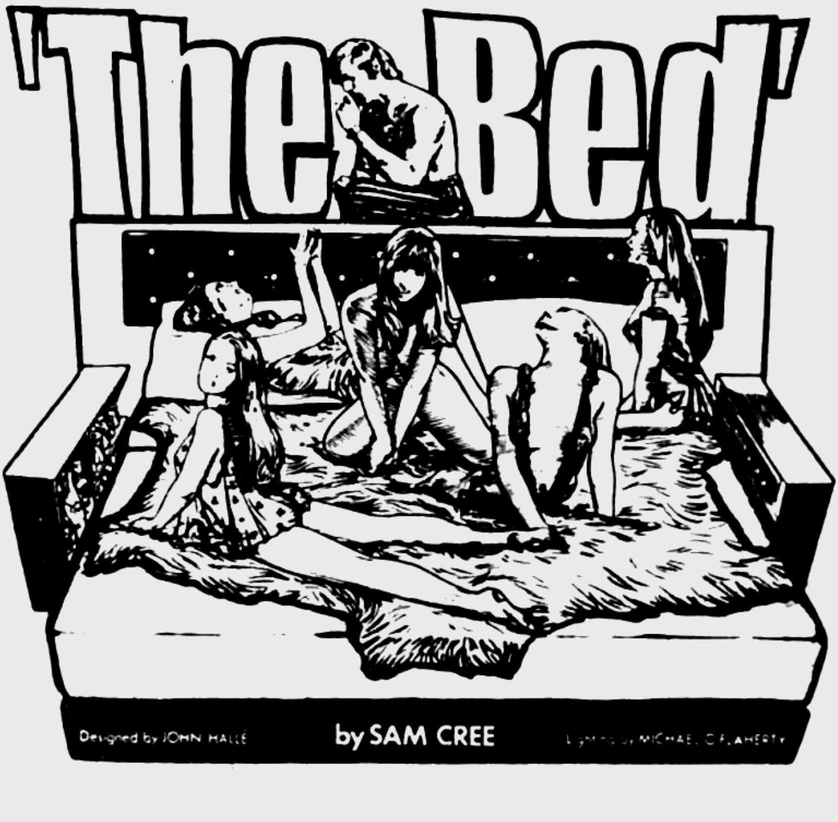
نے انکار کر دیا۔ ہم نے بہت کوشش کی۔ اِتنے میں ہانک پڑ گئی کہ پی آئی اے کا جہاز روانہ ہونے کو ہے۔ ایک شخص غُسل خانوں میں بھی آواز دیتا پھرا کہ کوئی مسافر اندر ہو تو باہر آ جائے۔ اتّفاق سے ہمارا بریف کیس ہمارے پاس تھا اُسے سامنے

لٹکائے باہر آئے اور اِس عالم میں جہاز میں جا بیٹھے بلکہ سب سے آخر میں آتے ہوئے دیکھ کر کسی صاحب نے جو ہمیں جانتے ہوں گے فقرہ بھی کسا کہ ایک منٹ کی دیر ہو جاتی ہے تو جہاز اُڑ جاتا اور آپ کا کالم بن گیا ہوتا۔ خیر سیٹ پر آئے۔ جہاز اُڑا اور بتّیاں بُجھ گئیں۔ ہمارے ساتھ کی سیٹوں پر کوئی نہ تھا لہٰذا ہم نے پھر اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ دوسرا سوٹ سامان میں نہ تھا ورنہ اسے اُتار کر اُس کو پہن لیتے۔ اب ہم نے ائیر ہوسٹس کو بتایا اور کہا بی بی تمہارے پاس موم ہے۔ موم بتّی ہے۔ فرمایا کیا کرنا ہے۔ ہم نے کہا ہم سے سوال مت پوچھو ہمارے سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دو۔ بولیں ہمارے ہاں موم کیا کیا کام۔ ہم نے کہا آپ لوگوں نے حد کر دی مسافروں کے کام کی کوئی بھی چیز نہیں رکھتے۔ اُس بی بی نے پھر جرح شروع کی کہ مسافروں کے موم کس کام آتا ہے۔ ابھی ہائی جیکنگ کا سِلسِلہ شروع نہ ہوا تھا ورنہ اِن لوگوں کو گمان ہوتا کہ ہم اِسے پگھلا کر پائلٹ کی آنکھوں پر ڈالیں گے اور اس سے کہیں گے کہ جہاز کی باگیں موڑ۔۔۔ اسے کراچی واپس لے چل۔ ہمارا جی اداس ہوا جا رہا ہے۔

موم تو نہ ملا جس کے گھِسنے سے زِپ چلنے لگتی لیکن ہماری مُشکل غُسل خانے کے صابن سے آسان ہوئی۔ پی آئی اے والے یہ کالم پڑھیں تو براہِ کرم آئندہ ہم ایسے مسافروں کی خاطر موم بتّی ضرور جہاز میں رکھ کر چلا کریں۔ یہاں آ کر زِپ چلتی رہی لیکن اُس روز ہم تھیٹر گئے تو ٹکٹ خرید کر ذرا باتھ روم چلے گئے اور پھر وہی ہوا۔ کھیل بھی بہت شمشیر برہنہ اور اشتعال انگیز قسم کا تھا۔ ابھی کھیل شروع ہونے میں وقت تھا۔ ہم دور دو فرلانگ گئے اور ایک اخبار خریدا اور اُسے بہانے بہانے سے سامنے رکھے رہے۔ خیریت ہوئی کہ رات کا وقت تھا اِسی عالم میں ٹیوب میں بیٹھ کر گھر آئے اور وہ سوٹ اُتار پھینکا۔ صاحبو یہ بٹن ہی اچھّے رہتے ہیں اور بازار سے لے آئیں گے گر ٹوٹ گیا۔ بلکہ پرانے زمانے کی گھنڈیاں اور تکمے اور اچھّے تھے۔ پاجامے اور تہمد وغیرہ بھی ہمیں اِسی لئے پسند ہیں کہ اِن میں زِپ یعنی زنجیری بلکہ بٹن وغیرہ بھی نہیں ہوتے۔

لندن کے راستوں اور ٹیوب اسٹیشنوں پر ہدایت اتنی مکمّل لکھی ہوتی ہیں کہ کوئی باہوش آدمی بھول نہیں سکتا لیکن باہوش والی شرط ہی تو ٹیڑھی ہے۔ ہم سفر میں ہوں یا حضر میں، غیب سے مضامین خیال میں آتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اکثر غَلَط گاڑی

میں سوار ہو جاتے ہیں اور اگلے اسٹیشن سے واپس آتے ہیں اور ایک یہ بات یہاں پر دیکھی کہ راستوں بازاروں میں پتہ بتانے والا کوئی نہیں ہوتا جس سے پوچھئے او خویشتن گم است۔ کہتا ہے میں تو خود پردیسی ہوں۔ کل ریجنٹ باغ کے آوٹر سرکل میں ہنودر لاج جانا تھا۔ نقشہ پر ہنودر ٹیریس تو تھا لاج نہ تھا۔ ہم نے سوچا یہیں یہ ہو گا۔ ٹیریس کے باہر آدم نہ آدم زاد۔ کس سے پوچھتے کہ مِس ڈلّوں (عمر ۷۰ سال)



کہاں ہیں؟ اُن کا پتہ تو بہت دیر میں ملا البتّہ ہنو در ٹیریس کا وہ کمرہ ہم نے دیکھ لیا جہاں
ایچ.جی ویلز رہے اور جہاں انتقال کیا۔

حکیم جی لندن بھی پہنچ گئے

ولایت والوں کو اپنے مُلک کو ولایت بنانے میں جانے کتنی صدیاں لگیں۔ ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی بھائی اِسے چند ہی سال میں اپنے ڈھب پر لے آئے ہیں۔ لندن اور برمنگھم کے اُردو اخباروں پر نظر ڈالئے۔ آپ کا جی نہال ہو جائے گا۔ بہت کُچھ جو انگریزی زبان میں چھپے تو شاید گرفت میں آ جائے، اُردو میں بخوبی چل رہا ہے۔ ڈاکٹروں کے معاملے میں ایسی سختی ہے کہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی فارغ التحصیل ڈاکٹرنیوں کو بھی فی الحال پریکٹس کرنے کا اذن نہیں۔ لیکن ہمارے عطائی بھائیوں کی راہ انگریز نہیں روک سکا۔ چنانچہ جہاں اور لوگ پُہنچے وہاں زنانہ اور مردانہ پوشیدہ بیماریوں کا مجرّب اور حکیمی علاج کرنے والے بھی پہنچ گئے۔ کل یہاں کے ایک اُردو اخبار میں اشتہار دیکھا کہ چین ہیلتھ سنٹر آرام باغ روڈ کے ممتاز ماہرِ جنسیات نے جن

کے پاس آر۔ ایم۔ پی۔ کی پُراسرار ڈگری ہے لوگوں کے پُرزور اصرار پر لندن میں اپنا مُستقل دواخانہ کھول دیا ہے جس میں خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے اشتہار کے ساتھ اپنی تصویر بھی دی ہے۔ اِدھر نکڑ پر ہندوستان کے حکیم ایس ایل بٹ ناگر صاحب بھی جو اٹھارہ میڈیکل کتابوں کے مصنّف ہیں جس میں ہوم ڈاکٹر بھی شامل ہے۔ لوگوں کے اصرار کی تاب نہ لا کر تشریف لے آئے ہیں۔ اِن کے اشتہار کے بموجب لاکھوں آدمی گزشتہ تین سال میں اِن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی ولایت میں یہ دو حکیم کافی نہ تھے لہٰذا حکیم عبد الرحمان صاحب معالج امراض مردانہ کو بھی مانچسٹر میں مطب کھولنا پڑا ہے۔ یہ اپنے کو نیچرو پیتھ اور ہربلسٹ لکھتے ہیں یعنی قدرتی طریقوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے۔ اِن کا دعویٰ حذاقت بے بنیاد نہیں ہے بلکہ اشتہار کہتا ہے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا ایک صاحب اپنے ایک ۱۹ سالہ بھتیجے اور اُس کی ۱۶ سالہ بہن کو لے کر مانچسٹر آئے اور حکیم صاحب سے بیان کیا کہ اِس لڑکے کی شادی کو دو ہفتے ہو گئے ہیں لیکن۔۔۔ اِس نے خودکشی کی کوشش بھی کی ہے۔ اِس کا کُچھ علاج کیجیئے۔ حکیم صاحب نے تسلّی دی اور دوا بھی دی۔ لڑکے نے تین ماہ دوائی

استعمال کی۔ چند ہفتے ہوئے وہ حکیم صاحب کے لئے ایک قمیص اور ٹائی اور ۱۰ پونڈ لڈّو بطور تحفہ لائے اور خوشخبری سُنائی کہ جی بابے کی کرپا اور آپ کے علاج سے سب ٹھیک ہے۔ میرے بچّے کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور ہم نے ڈھائی من لڈّو تقسیم کئے ہیں۔ لڈّو کھا لیے؟ ایک اور ہندوستانی ماہر کی طرف آیئے۔ یہ لندن میں ہیں۔۔۔ ”ایشیا کے مشہور و معروف معالج۔۔۔ ماہرِ جنسیات حکیم کے تر دیدی۔۔۔ اِن کی ڈگریاں اور زیادہ لمبی چوڑی ہیں:

”این۔ ڈی۔ ڈی۔ پی۔ اے۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایچ۔“

حیرت ہے کہ اُنھوں نے باقی کے حروفِ تہجّی کیوں چھوڑ دیئے۔ اے سے زیڈ تک استعمال کرنے میں کیا امر مانع تھا۔ یہ کھوئی ہوئی طاقت مردمی کے علاوہ کھانسی، زکام، نزلہ، گھٹیا اور پیٹ کے درد کا بھی علاج کرتے ہیں۔ البتّہ ملاقات کے لئے فون پر وقت مقرّر کرنا پڑتا ہے۔ بقول خود طاقت کی دوائیوں کے بادشاہ اور انٹر نیشنل شہرت کے مالک حکیم ہری کرشن لال صاحب ماہرِ امراضِ پوشیدہ خود تو مصروفیات کے باعث تشریف نہیں لا سکے لیکن اپنا اشتہار لندن میں چھپوا دیا ہے۔ حکیم صاحب کو جھانسی یونیورسٹی نے کئی اعزازی ڈگریاں دے رکھی ہیں مثلاً ایم۔ ایس سی اے

اور ڈی۔ ایس۔ ای۔ اے۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ ڈگری کا مطلب نہیں پوچھا جاتا ہے۔ لمبائی دیکھی جاتی ہے۔ ولایت والوں کی آسانی کے لئے اُنہوں نے اپنے ریٹ پونڈوں میں دیئے ہیں۔ شاہانہ علاج ۵۲ پونڈ۔ درمیانی علاج ۳۲ پونڈ۔ علاج ۱۸ پونڈ اور غریبانہ علاج ۱۲ پونڈ۔ حکیم صاحب نے خدمتِ خلق کے جذبے سے بھی اعلان کیا ہے کہ لاکھ روپیہ کی قیمتی کتاب پیامِ جوانی مُفت حاصل کریں اس میں لاکھ روپے کے پیغام جوانی کے علاوہ کئی لاکھ روپے کے حکیم صاحب کی دوائیوں کے اشتہار بھی ضرور ہوں گے۔ سب مریضوں کے لئے مُفت۔

پاکستانی اور ہندوستانی بھائیوں کے لئے تازہ ترین خوشخبری یہ ہے کہ حکیم جے ایم کوشل بھی جو کھوئی ہوئی قوّتوں کو بحال کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں صرف پانچ روز کے لیے بریڈ فورڈ میں درود فرما ہوئے ہیں۔ آپ کی ڈگریوں کا بھی شمار نہیں۔ ”بی اے (پنجاب) اے، بی، ایچ، ایس، (بنارس یونیورسٹی) بی اے (پی۔ یو) اے۔ بی۔ ایم، ایس (پی۔ ایچ۔ یو)۔ ڈگری ڈاکٹری کی نہ بھی ہو تب بھی لیاقت کی دلیل تو ہوتی ہے۔

حکیموں کے علاوہ سب سے زیادہ اشتہار ہمارے اُن پاکستانی ہندوستانی بھائیوں کے ہیں جو وطن واپس آنے والوں کو ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، ائیر کنڈیشنز، ٹیپ ریکارڈ، ٹائپ رائٹر، سلائی کی مشین وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک صاحب ۶۰ فیصد ڈسکاؤنٹ پر۔ دوسرے ۶۵ فیصدی اور تیسرے ستّر فیصدی ڈسکاؤنٹ پر۔ ہم نے دیکھا نہیں لیکن سُنا ہے بعض فرمیں سو فیصدی ڈسکاؤنٹ پر بھی یہ سامان فراہم کرتی ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اِن بزرگ نے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے ڈھائی من لڈّو کہاں سے لئے ہوں گے۔ یاد رہے رہے کہ "ایشیائی مٹھائیوں کا عظیم الشّان مرکز سویٹ سنٹر، جو جہلم والے مشہور و معروف پہلوان صاحب کی دُکان ہے۔۔۔ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے لئے بکفایت خالص گھی کی مٹھائیاں فراہم کرتا ہے۔ یہاں سے آپ گلاب جامن، رس ملائی، رس گُلّہ، جلیبی، برفی، لڈّو، پیڑا، بالو شاہی، پھینیاں وغیرہ وغیرہ ہی نہیں دہی بھلّے، آلو چھولے، سموسے، نمکین دالیں اور سویّاں وغیرہ بھی خرید سکتے ہیں۔"

مٹھائی سے رغبت نہ ہو تو شہ زُور محل ریسٹورنٹ میں تشریف لائیے اور تندوری مرغ، تندوری روٹی،۔ چکن اور مٹن کے قورمہ، کوفتہ وغیرہ کھائیے۔ یہ چیزیں حلال گوشت سے تیّار ہوتی ہیں جس سے آپ کا پیٹ بھر جانے اور خمار آنے لگے تو بھی مضائقہ نہیں۔۔۔ رضائی سنٹر سے آپ کو ہر قسم کی آرام دہ رضائیاں مل سکتی ہیں۔ شنیل کی ڈبل رضائی ۵ پونڈ، ساٹن ڈبل ۱ / ۳۲ پونڈ، چھینٹ ڈبل بھی ساڑھے تین پونڈ میں لیجئے اور پاؤں پسار کر سویئے۔

اگر آپ کا سونے کو جی نہیں چاہتا تو سینما دیکھئے۔ جتنی فلمیں یہاں لگی ہوئی ہیں پورے ہندوستان اور پاکستان میں نہ لگی ہوں گی۔ پلیسیم ایسولڈو (لندن) میں عندلیب (پاکستانی) ڈاکو منگل سنگھ ہے، یملا جٹ ہے جس میں چاچا سنت رام بھی کام کر رہے ہیں۔ پیام نصیحت، ہمجولی، تیسری منزل، دیو داس، اَن پڑھ وغیرہ کلاسیک سینما میں ساون آیا جھوم کے۔ پتھّر کے صنم وغیرہ۔ اوڈین میں دیور بھابھی اور زرقا۔ لکسر سینما برمنگھم میں سجّن بیلی، تیرے عشق نچایا وغیرہ۔۔۔ الائٹ سینما میں لاڈو۔ سنچری میں میرے حضور اور جی چاہتا ہے۔ مارلبرو، بریڈ فورڈ میں سپنوں کا سوداگر۔ کیمیو لندن میں آشیر داد، بمبئی کا بابو، ناز سینما لندن میں اُستادوں کے

اُستاد۔ کلاسیک میں میرے محبوب۔۔۔ ایک لمبی لسٹ ہے کوئی کہاں تک گنوائے۔ زندہ پروگرام چاہیئے تو اس کا بھی انتظام ہے۔ سردار آسا سنگھ مستانہ بھی یہاں ہیں۔ سریندر کور بھی اور پرکاش کور بھی۔ آسا سنگھ مستانہ جی پنجابی گیتوں کے شہنشاہ ہیں۔ ہیر وارث شاہ گاتے ہیں اور یہ دونوں بیبیاں ہیر کے علاوہ ٹپّے گاتی ہیں اور پنجابی لوک گیت سُناتی ہیں۔ کبھی کبھی قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔

ایک مشہور درگاہ کے گدّی نشین صاحب کا اشتہار چھپا ہے کہ عرس مبارک میں تشریف لائیں، نہ لائیں تو گھر بیٹھے اپنی نیک کمائی کا پیسہ حسبِ توفیق نذر نیاز، فاتحہ، چادر، پھوں، شیرینی، وغیرہ کے لئے بطور نذر و نیاز بذریعہ منی آرڈر، برٹش پوسٹل آرڈر، چیک وڈرافٹ کو کراس کر کے حقیر فقیر کے نام پتہ ذیل پر روانہ کریں۔

متفرقاتِ لندن

یہاں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی غارت کا حال لمحہ بہ لمحہ سناتے ہیں اور منظر بہ منظر دِکھاتے ہیں۔ ایک اخباری نمائندے نے اِسے دُنیا کا سب سے بڑا قتلام قرار دیا ہے۔ ہمارا پاکستان والوں کا احوال کسی سے چھپا نہیں۔ خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیرؔ۔ بلکہ پنجابی کا یہ ٹپّہ ہمارے جذبات کا بہتر طور پر نقشہ کھینچتا ہے۔ ”تینوں تاپ چڑھتے تے میں ہونگاں نی تیری میری اک جندڑی۔۔۔“ جتنے لوگ عمّان سے آئے ہیں سب اِس کا الزام افواجِ شاہی کو دیتے ہیں۔ جس نے اپنی توپوں کے گولوں سے عمّان میں کوئی گھر گزند سے خالی نہیں چھوڑا۔ یہ جنرل مجالی وہی بزرگ ہیں کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مُقابلے سے بھاگ آئے تھے۔ اور اِس پاداش میں برطرف کر دیئے گئے تھے۔ لیکن محض لوگوں کو دکھانے کے لئے اب جو مُقابلہ

شہریوں اور فلسطینی مجاہدوں سے ہوا تو اُنہوں نے اپنے جی کی بھڑاس نکال لی۔ ہمیں سب سے زیادہ شرم اُس وقت آئی جب پرسوں ع کسے نہ ماند کہ اُورا بہ تیغِ ناز کشی کے بعد جلالت مآب شاہ حسین کی تقریر کا ریکارڈ سُنایا گیا اور اخباری نمائندے نے بتایا۔

King Hussain looked cheerful and relaxed

اخبار ٹائمز نے لکھا ہے کہ آغاز کا الزام آپ گوریلوں کو دے لیجئے اور اِسے لمبا کھینچنے کا قصوروار شام کو ٹھہرا لیجئے لیکن اِس امر میں کوئی شُبہ نہیں کہ قتل و غارت کی ذمّہ داری شاہی فوجوں پر ہے۔ جو لوگ عمّان سے نکل کر آئے ہیں حتّیٰ کہ وہ بھی جو گوریلوں کے یرغمال میں تھے۔۔۔ سب کا بیان ہے کہ گوریلوں یعنی مجاہدوں کا طرزِ عمل اِن کے ساتھ نہایت شریفانہ اور فیّاضانہ رہا ہے۔ اِنہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اِس سے اُن لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی جو اسیروں پر ظُلم کی داستانوں سے اپنی دُکانیں چمکانا چاہتے تھے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اِس آشوب میں اِن جرنلسٹوں کا کردار بہت اچھّا رہا ہے جو عمّان میں تھے۔ اِن میں ایک سویڈن کا رہنے والا تھا۔ اُس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں اِس سے کہلوانے کی بہت کوشش کی گئی کہ گوریلے قصوروار ہیں۔ پوچھا کہ یہ گولی کیا گوریلوں نے ماری ہے۔ اِس مرد

شریف نے کہا: آپ اِس گولی کا پوچھتے ہیں۔ اُن توپوں اور ٹینکوں کی بمباری کا کیوں نہیں پوچھتے۔ تھوڑی دیر بعد انٹرویو کرنے والا پھر بات کو وہیں لایا تو سویڈن کا جرنلسٹ جھلّا کر کہنے لگا کہ عمّان میں ہزاروں لوگ مارے گئے اور بے آب و دانہ تڑپ رہے ہیں اور آپ کو میری ٹانگ کی پڑی ہے۔ یہ تو چار دِن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ اُن لوگوں کی بِپتا پوچھئے جو مر رہے ہیں اور سِسک رہے ہیں بے، خانماں ہو گئے ہیں یا بے یار و مدد گار رہ گئے ہیں۔" انگریزوں کے یرغمال سے چھوٹتے ہی برطانیہ کا بُڈّھا شیر پھر شیر ژیاں ہو گیا ہے۔ اس وقت لیلی خالد کو چھوڑنے کا سوال از حد قبل از وقت ہے اور بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں انصاف کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اُس پر مقدمہ چلانا پڑے اور وہ الزامات دوبارہ عائد کرنے پڑیں جو واپس لئے گئے تھے۔ بہر حال بعد میں اسے رہا کر دیا گیا۔ ٹیلی ویژن پر لیلیٰ خالد کے بھائی اور ماں کے انٹرویو بھی نشر ہوئے۔ یہ بیروت میں اِن کے گھر پر لئے گئے تھے۔ لیلیٰ خالد کی ماں ایسی ہی سادہ مزاج ضعیفہ ہیں جیسی مائیں ہوا کرتی ہیں۔ بھائی نے کہا "ہم اِس کھیل میں موت سے نہیں ڈرتے۔" اخباری نمائندے نے کہا "اگر وہ رہا ہو گئی تو اب بھی کسی طیارے کو ہائی جیک کرنے کی جرأت کرے گی۔" بھائی نے کہا "ضرور کرے

گی۔ اگر اسے لبریشن فرنٹ نے ہدایت کی تو! اور میں بھی کروں گا۔" ماں سے بھی گفتگو کی گئی اس نے بھی کہا۔ "میری بیٹی بہادر ہے اور وہی نہیں میں بھی وہی کُچھ کروں گی جو ہمارے لبریشن فرنٹ کا حکم ہو گا۔ ہم اپنے وطن کے لئے سب کُچھ کر گزریں گے۔"

لندن کی موجودہ مہنگائی سے ہم غریب الوطن ہی پریشان نہیں ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی چیخ اٹھے ہیں۔ ایک سروے میں یہاں گھروں کے خرچ کے جو اوسط نکالے گئے ہیں وہ کُچھ اِس طور پر ہیں:

خوراک	۲۰ فیصدی
مکان ایندھن اور روشنی	۱۷ء۵ فیصدی
آمدورفت اور تفریح وغیرہ کے اخراجات	۱۹ء۴ فیصدی
شراب اور تمباکو	۱۲ء۳ فیصدی
گھریلو سامان	۱۳ء۵ فیصدی
کپڑے اور جوتے	۸ء۴ فیصدی

کاریں اور موٹر سائیکل		۸ فیصدی

اس سروے میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں جو تنخواہوں میں ۱۷ / ۲ فیصد کا اضافہ کیا گیا تھا اس میں سے ۷ فیصدی مہنگائی اور ٹیکسوں کی نذر ہو چکا ہے۔ فقط آدھ فیصد باقی ہے۔ وہ بھی تابہ کئے۔ بازار میں نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز کا غلغلہ ہے۔ فوراً اپنا وطن یاد آیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہاں تو لشتم پشتم گزارہ ہو بھی جاتا ہے۔ بیروزگاری ہر چند کہ بڑھ رہی ہے لیکن بیروزگاری کا الاؤنس بھی ہے۔ ہمارے ہاں سب اِن فکروں سے فارغ ہیں۔ شراب تمبا کو اور تفریحات کی مدات تو جانے دیجئے فقط روٹی دال اور سر چھپانے کے ٹھکانے پر پانچ افراد کے کنبے کا جو خرچ اُٹھتا ہے۔ کیا ہمارے چپڑاسی یا کلرک کی آمدن اِس کی متحمّل ہو سکتی ہے؟

موسم کا وہی عالم ہے کہ جو تھا۔ اب کئی دِن سے بوندا باندی بھی نہیں ہوئی۔ سردی کا آغاز شاید اکتوبر میں ہو گا۔ وہ بھی اکتوبر آخر میں۔ اب یہاں سے ہمارا چل چلاؤ ہے۔ لیکن ہمارا راستہ بھولنے اور غَلَط ٹرینوں میں بیٹھنے اور غَلَط اُترنے کا معمول قائم ہے۔ گڑبڑا جاتے ہیں۔ کمپاس لے کر تو چلے نہیں کہ زمین دوز راستوں میں پورب پچھم کی پہچان کر سکیں اور اسٹیفن لیکاک کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ لیکاک کہتا ہے کسی نئے محلّے میں کسی کا گھر تلاش کرنا ہو تو آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ ایک سِرے سے مکانوں کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کر دو۔ مطلوبہ گھر انہی میں کہیں نکل آئے گا۔ ہم بھی جو گاڑی سامنے آئے اسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہوئی تو فبہا ورنہ واپس آ کر دوسری میں سہی۔ اور یہ بات واقعی سچ ہے کہ اِن میں سے کوئی نہ کوئی صحیح ضروری ہوتی ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم اپنی منزل پر نہ پُہنچے ہوں۔ بھولنے کو ہم تقاضائے بشریت سمجھ کر ہمیشہ عزیز رکھتے ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی تو ایک فرق رہ گیا ہے کہ انسان غَلَطی کرتا ہے۔ جتنا بڑا انسان ہو گا اتنی زیادہ اور بار بار غَلَطی کرے گا۔ لندن سے ہم یورپ جائیں گے تو بس ایک چیز یہاں کی ضرور یاد آئے گی۔ وہ ہے ناشتہ۔ یورپ بھر میں ناشتہ انگریز ہی کے ہاں ملتا ہے۔ ہمارے

اِس ہوٹل یا سرائے میں ہی دیکھ لیجئے۔ پہلے پھلوں کا جوس، پھر کارن فلیک جس میں چاہے پوری بوتل دودھ ڈالئے۔ پھر دو انڈے جیسے جی چاہے بنوا لیجئے۔ پھر توس، سات آٹھ مع مکھّن اور جام وغیرہ کے۔ پھر چائے یا کافی کا بڑا پاٹ۔ خواہ دس پیالیاں پیجئے۔ یورپ میں تو پاپا قسم کی ایک روٹی اور وہ بھی ٹھنڈی اور سخت۔ ذرا سے بقدر اشکِ بُلبُل مکھّن کے ساتھ دیں گے اور ایک پیالی چائے دے کر کہیں گے کہ کھاتا ہے تو کھا ورنہ اپنے گھر جا۔

یہاں کے ایک اُردُو اخبار میں کسی کا مراسلہ چھپا ہے کہ پاکستانی لڑکیوں کو انگریز یا غیر مُلکی ہیلو کہے تو مضائقہ نہیں۔ کوئی پاکستانی ہیلو کہہ دے تو سخت ناراض ہوتی ہیں۔ گھر جا کر شکایت کرتی ہیں۔ اور اُس کے والدین لاٹھیاں لے کر آجاتے ہیں کہ نکل تو سہی باہر۔ ہماری لڑکی کو ہیلو کرتا ہے۔ ایک دو پاکستانی لڑکیوں نے یہاں پر پُرزے نکال رکھے ہیں۔ اُن کی آزمائش عموماً غیر مُلکیوں پر ہوتی ہے۔

یہ اشتہار مع عنوان ہم نے ایک اُردُو کے لندنی اخبار میں دیکھا ہے:

عیسائی بوائے فرینڈ کی ضرورت ہے

تقریباً ۲۵ سالہ انگلش خاتون۔ باقاعدگی سے چرچ اور سوشل میٹنگز
میں جانتی ہے۔ شراب یا سگریٹ بالکل نہیں پیتی۔ ہندوپاک کے کسی
کرسچن سے دوستی کی خواہاں ہیں۔ پتہ ذیل پر خط لکھیں۔

مطلب یہ کہ عیسائی چاہیے تا کہ ایمان کو تقویت رہے۔ بوائے چاہئے کیونکہ کوئی عورت حقِ دوستی کماحقہ ادا نہیں کر سکتی۔ اور فرینڈ چاہیے۔ شوہر وغیرہ کی حاجت نہیں اور یہ مطالبات بایں ہمہ تقویٰ ہیں کہ موصوفہ چرچ باقاعدگی سے جاتی ہیں۔ یعنی چوری میرا پیشہ ہے، نماز میرا فرض۔



شرلک ہومز کے کوچے میں

لندن میں جب کبھی ہمارا آنا ہوتا ہے۔ شوق کے قدم کشاں کشاں بیکر اسٹریٹ لے جاتے ہیں۔

ہم کسی سمت میں نکلے ہوں وہیں جا نکلیں

ہم سے بھولی ہے رہِ کوچۂ جاناں کوئی

اِس کوچے میں اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہمارے اور ہم ایسے بے شمار لوگوں کے بچپن کا بھی ہیرو شرلک ہومز اِسی کوچے کے مکان نمبر ۲۲۱بی سے ڈاکٹر واٹسن کے ہمراہ اپنی یادگار مہموں پر نکلتا تھا۔ "۲۲۱بی بیکر اسٹریٹ شرلک ہومز کے دِلدادگان کے لئے گنجینۂ معنی کا طلِسم ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں درجنوں سوسائیٹیاں یا تو شرلک ہومز کے نام پر ہیں یا اُس کی مہمات کے

کرداروں کے نام پر لندن سے امریکہ سے کئی رسالے بھی نکلتے ہیں جو شرلک ہومز کی کہانیوں اور کرداروں کے مطالعے کے لئے مخصوص ہیں۔ ہر سال دو سال بعد ایک نہ ایک کتاب بازار میں آجاتی ہے جس میں پہلی معلومات اور اکتشافات پر اضافہ ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے سال شرلک ہومز کے تمام کارنامہ جات بڑے سائز پر باتصویر دو جِلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اور یہ سیٹ کوئی ڈیڑھ سو روپے کا ہم نے بھی خریدا تھا۔ اِس لئے کہ اُس کے مرتّب مسٹر بیرنگ گولڈ نے ہر کردار اور مقام کے متعلّق ریسرچ کا نچوڑ دیا ہے۔

شرلک ہومز حقیقت تھا یا افسانہ۔۔۔ یہ سب جانتے ہیں لیکن شرلک ہومز کے مداحین جو نکتہ چینی سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں یہی فرض کر کے اُس کی سوانح لکھتے ہیں کہ ہاں یہ ایک شخص تھا۔ فلاں سن میں پیدا ہوا اور فلاں سن میں فلاں مقام پر مرا۔۔ اپنی سُراغ رسانی کی زندگی سے ریٹائر ہو کر وہ ایک دیہاتی مقام پر جابسا تھا۔ اور وہاں شہد کی مکھّیاں پالتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے وقت زندہ تھا کیونکہ ایک بحری معاملے میں جس میں اہم دستاویزات چوری ہو گئی تھی، اس کو عقدہ کشائی کے لئے ریٹائرمنٹ کی زندگی چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ لوگوں نے شرلک ہومز ہی کی نہیں اس

کتے رفیق کے بارے میں بھی بہت کرید کی ہے اور اِن دونوں کی مستقل سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ بیکر اسٹریٹ پر جہاں موجودہ نمبر ۲۲۱ ب یعنی ایبے بلڈنگ سوسائٹی کا دفتر ہے، ہاں دس سال قبل شرلک ہومز کی باقیات اور اُس کے متعلّق اخبارات اور کتابوں کی نمائش بھی ہوئی تھی۔ بعد ازاں نار تھمبر لینڈ ایونیو کے ایک طعام خانے اور شراب خانے کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں شرلک ہومز کے مومی ماڈل کے ساتھ اِن سب چیزوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب اِس پب کا نام ہی شرلک ہومز ہے۔ سٹرینڈ سے نار تھمبر لینڈ ایونیو میں مُڑیئے تو سِرے پر آپ کو یہ پب نظر آئے گی۔ مناسبت یہ ہے کہ شرلک ہومز کے مشہور ناولٹ ''آتشی کتّا'' کا ہیرو نوّاب باسکر ویل لندن میں اِس مقام پر نار تھمبر لینڈ ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ چیئرنگ کراس کے اسٹیشن سے یہ جگہ بہت قریب پڑتی ہے۔

بیکر اسٹریٹ کے ٹیوب اسٹیشن سے باہر نکلیے تو بیکر اسٹریٹ کا کُچھ حصّہ دہنے ہاتھ پڑتا ہے۔ کچھ میری بون اسٹریٹ پار کرنے پر شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۹۰ء کے قریب بیکر اسٹریٹ کے مکانوں کی نمبر شماری دوبارہ ہوئی تھی۔ اِس لئے ۲۲۱بی کا اِس مقام

پر ہونا ضروری نہیں۔ جہاں اب یہ نمبر ہے بلکہ اصل میں یہ مقام وہاں تھا جہاں اب



شرلک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن

نمبر ۱۱۱ ہے یا نمبر ۶۱ ہے یا نمبر ۶۶ ہے یا نمبر ۲۷ ہے یا نمبر ۱۳۱ ہے۔ مختلف لوگوں کی رائیں اِس بارے میں مختلف ہیں۔ بلکہ جھگڑا۔ بعض اوقات تلخی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ہم جن نمبروں کا ذکر کیا ہے اِن کے علاوہ نمبر ۴۹، نمبر ۱۹، نمبر ۲۱ اور نمبر ۱۰۹ وغیرہ کے بھی دعویدار ہیں۔ ایک شخص دلیلوں سے اپنی بات کو ثابت کرتا ہے۔ دوسرا اِن دلیلوں کو رد کر کے نیا دعویٰ لاتا ہے۔ تازہ ترین تحقیقات کے مطابق

شرلک ہومز کے دولت خانے کو اُس جگہ پر ہونا چاہئے جہاں اب نمبر ۱۳۱ ہے۔ لیکن راہِ مضمون تازہ بند نہیں۔ اسٹریٹ کے بہت سے گھر اب بھی روایتی طرز کے ہیں لیکن بعض جگہ پُرانے گھر گِرا کر آفس بلاک تعمیر کر دیے گئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ہم نے جو کیفیّت دیکھی تھی وہ ۱۹۶۷ء میں نہ تھی اور ۱۹۶۷ء کا نقشہ آج نہیں ہے۔ جو گھر رہ گئے ہیں کیا عجب ہے چند سال بعد وہ بھی نہ رہیں۔ شرلک ہومز کے حریف مشہور بدمعاش پروفیسر موریارٹی کے آدمیوں نے شرلک ہومز پر خاموش بندوق سے گولی چلا کر اپنی دانست میں اُس کا کام تمام کر دیا تھا لیکن وہ ڈال ڈال یہ پات پات۔ شرلک ہومز نے خطرے کی پیش بینی کرتے ہوئے اپنی کُرسی پر اپنی شکل کا ایک مومی مجسّمہ بِٹھار کھا تھا اور اِس واردات کے بعد مُجرموں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ پس شرلک ہومز کی قیام گاہ کا پتہ چلانے والوں کو یہ نشاندہی بھی کرنی پڑتی ہے کہ خالی مکان کون سا تھا جس کا نام کہانی کی رو سے کیمڈن ہاؤس تھا۔ بہت برس ہوئے ایک امریکی ڈاکٹر گِرے برگس نے ساری گلی کی پیمائش کرنے کے بعد کہا تھا کہ نمبر ۱۱۱ کا مقام ہی اصل میں ۲۲۱ بی تھا۔ کیونکہ اِس کے سامنے کے خالی مکان کے عقبی احاطے میں وہ داخل ہوئے تو وہاں کیمڈن ہاؤس کا بورڈ لگا تھا۔ بعد کے محققین

نے اِس تحقیق کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ مکان توٹیوب اسٹیشن کے قریب سامنے ہے۔ اتنا نزدیک ہے کہ آدمی پیدل آنا پسند کرے گا جبکہ فلاں کہانی کا مؤکل ٹیوب پر سے اُتر کر گھوڑا گاڑی لے کر شرلک ہومز تک پہنچا تھا۔ اِس مقام پر اب پوسٹ آفس ہے۔ بر تارڈ ڈیویز اور بیر نگ گولڈ کی تحقیقات کے مطابق نمبر ۳۱ کا مکان اصل میں ۲۲۱ بی تھا۔ اب یہاں ایک آفس بلاک ہے اور اِس کے سامنے جو ”خالی مکان“ قرار پایا ہے۔ اس پر کنڈوٹ اسٹاف بیورو کا بورڈ ہے۔

ہماری نظر میں بھی شرلک ہومز کا مطلوبہ مکان موجودہ نمبر ۳۱ ہی ہے۔ اور ”خالی مکان“ ۳۴ نمبر ہے۔ لندن آنے والے صاحبان جو شرلک ہومزیات کے رسیا ہوں اُن کی پہچان کے لئے تھوڑی سی مزید تفصیل دینا نامناسب نہ ہو گا۔ ”خالی مکان“ کے عین عقب میں کینڈل پیلس ہے۔ یہاں سے احاطے کا پھاٹک پار کر کے شرلک ہومز اور واٹسن اندر داخل ہوئے تھے، اپنے دُشمنوں کو دبوچنے کے لئے اِس احاطے میں ہم بلینڈ فورڈ اسٹریٹ سے بھی داخل ہو سکتے ہیں اور جارج اسٹریٹ سے بھی زیادہ تر اِس میں گیراج ہیں۔ خالی مکان کے عقبی صحن میں بھی دو منزلہ سا کمرہ ہے اور اِس کے سامنے ایک گُم نام سے پبلشر کا دفتر RCGER SCHIESING

PUBLISHER۔ ہم بلینڈ فورڈ اسٹریٹ کی طرف سے اِس احاطے میں داخل ہوئے جسے میوز بھی کہہ سکتے ہیں تو دیکھا کہ داخلے کے دروازے کے عین سامنے "دیوانِ عام ریستوران" کے نام سے ایک ہندوستانی یا پاکستانی ریستوران ہے۔ دوسری طرف جارج اسٹریٹ کے سِرے پر نکلے۔ وہاں بھی دیوانِ عام ریستوران دیکھا۔ ہمیں شُبہ ہوا کہ ہم سِمت بھول کر اِسی راستے سے تو باہر نہیں آ گئے۔ دوبارہ دیکھا۔ یا تو اِن میں ایک ریستوران دوسرے کی برانچ ہے یا اِس کا حریف۔ غور سے دیکھا تو ایک نام سے پہلے چھوٹا سا New بھی لکھا نظر آیا۔ اِن لوگوں کو کیا معلوم ہو گا کہ وہ ایک تاریخی مقام کے دونوں ناکے دبائے ہوئے ہیں۔

Dateline computer dating

SECTION A – BASIC FACTORS

Please answer questions in this Section and in Section B by marking your answer in the appropriate box. You should make only one answer to each question.

My sex is:-
- ☐ Male
- ☐ Female

My race is:-
- ☐ Caucasian (white)
- ☐ Negro
- ☐ Asiatic
- ☐ Oriental

Most people consider me to be:-
- ☐ Unattractive
- ☐ Quite attractive
- ☐ Very attractive

I consider myself to be sexually:-
- ☐ Inexperienced
- ☐ Average
- ☐ Experienced

It is important that my dates should be:-
- ☐ Less experienced
- ☐ Equally experienced
- ☐ More experienced
- ☐ I don't mind

Physical attractiveness in a relationship is:-
- ☐ Unimportant
- ☐ Quite important
- ☐ Very important

My age is:- ☐ **yrs**

The age of my ideal date should be ☐ **yrs**

I am prepared to accept someone between the ages of ☐ **yrs and** ☐ **yrs**

My height is ☐ **ft/ins**

I am prepared to accept someone with a height between ☐ **ft/ins and** ☐ **ft/ins**

SECTION C – ATTITUDES

☐☐ Is communism a vice which should be eradicated from the face of the earth?

☐☐ Should we all be free to indulge in premarital sexual intercourse?

گلفام کو مل گئی سبز پری

آج کل تو یہاں ایک ہی موضوع ہے۔ وہ ہے ہائی جیکنگ یعنی طیاروں کا اغوا۔ لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے گھبراتے ہیں۔ لندن کے ہوائی اڈّے پر محاصرے کی سی حالت ہے۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ بعض برطانوی اخبار نویس اور رپورٹر بھی خوار ہو کر واپس آئے اور بی بی سی پر شکایتیں بیان کیں۔ بی او اے سی اور دوسری مغربی ہوائی کمپنیاں مشرق کا رُخ کرتی ہیں لیکن مجبوری اور سراسیمگی کی حالت میں پی آئی اے کو مسافر لوگ ترجیح دینے لگے ہیں ورنہ تو ہم کراچی سے لندن آئے تو جہاز میں بس گنے چُنے مسافر تھے۔ بیسیوں سیٹیں خالی تھیں۔

ہم مسافروں کے ابتلا پر خوش نہیں لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا نے جان لیا کہ ہاں گوریلے بھی وجود رکھتے ہیں۔ بہت سے تن آسانوں نے نفرین بھی کی کہ دیکھو دُنیا

کی رائے عامہ تمہارے خلاف ہوتی جا رہی ہے۔ شرافت برتو۔ اِس پر اِن لوگوں نے جواب دیا کہ دُنیا کی رائے عامہ؟ پچھلے بیس سال میں تو دُنیا کی رائے عامہ ہمیں اپنے وطن کی چپّہ بھر زمین واپس نہیں دِلا سکی۔ اِس معاملے کا اور لیلیٰ خالد کے معاملے کا تو اِس کتاب کے چھپنے تک فیصلہ ہو چکا ہو گا لیکن یہاں یہ دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ جب تک سوِس ایئر اور ٹی ڈبلیو اے کے جہازوں کا معاملہ تھا، اخباروں میں ذکر تو تھا لیکن واجبی۔ جب بی۔ او۔ اے۔ سی کے طیّارے پر یہ اُفتاد پڑی تو اخبار چنگھاڑنے لگے کہ برطانوی بچّوں کا سوال ہے۔ یہاں ہیومن سوال بالعموم اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب برطانوی جانیں خطرے میں ہوں۔ عربوں پر کُچھ گزر جائے یا کالے افریقیوں پر یا پیلے ایشیائیوں پر اُس وقت انگریز اپنی سرد مزاجی اور وضع داری کا کنٹوپ پہنے رہتا ہے۔

ماننا پڑے گا کہ ہمارا ملک ابھی بہت پسماندہ ہے۔ بوس و کنار وغیرہ تو بڑی چیزیں ہیں نگاہِ التفات تک کے لئے لائسنس مطلوب ہوتا ہے اور شادی کے لئے لڑکی کا پابندِ صَوم وصَلوٰۃ اور سگھّڑ اور قبول صورت ہونا شرط ہے اور لڑکے کے لئے ضروری ہے کہ گزیٹڈ افسر ہو۔ عالی خاندان ہو، پنجابی اور اثنا عشری کو ترجیح دی جائے گی

وغیرہ۔۔۔ یہاں طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری۔ اگلے روز آکسفورڈ اسٹریٹ پر جاتے ہوئے ہم ایک جگہ ٹھٹکے۔ بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا ”آیئے آیئے۔ نئے نئے دوست بنایئے۔“ دوستی بڑی اچھّی چیز ہے اور شاعر تک نصیحت کر گیا ہے۔ تو برائے وصل کردن آمدی پردیس میں تو یُوں بھی بے یار و مدد گاری کا سال ہوتا ہے۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو کاؤنٹر پر کھڑی دوشیزہ نے ہمیں ایک فارم تھما دیا اور ایک داڑھی والے نوجوان کا کھڑے کھڑے بوسہ لیا۔ ہم نے رشک کیا کہ کاش یہ فارم ان صاحب کو دیا جاتا اور۔۔۔ شاید جلدی میں گڑبڑ اور ردّوبدل ہو گئی ہوتی۔

یہاں کمپنیاں تو کئی ہیں جو کئی سال سے یہ کام کر رہی ہیں اور مدعی ہیں کہ یہ سِلسِلہ پڑا کامیاب رہا ہے۔ اِس عشق کو دیکھو جادُوگری گلفام کو مِل گئی سبز پری۔ طریقہ اِس کا یہ ہے کہ فارم بھر دیجئے کہ آپ کو کس قسم کی، کس ناک نقشے کی دوست چاہیے یا اگر آپ مؤنث ہیں تو مذکر میں کِن خصوصیات کی طالب ہیں۔ آپ کی یہ معلومات ایک کمپیوٹر کے سپُرد کر دی جائیں گی اور اِس سے پہلے آپ سے پانچ پونڈ لے لئے جائیں گے۔ کمپیوٹر میں ہزاروں اُمّیدواروں کے نام، پتے، ولدیت، سکونت محفوظ ہیں۔ وہ

ایسے رفیق جن میں مطلوبہ خصوصیات ہوں تلاش کر کے آپ سے ملا دے گا۔ آپ کو اُن کے نام پتے بتا اور ٹیلی فون نمبر دے دے گا۔ اور فریقِ ثانی کو آپ کا اتا پتہ بتا دے گا۔ آپ رابطہ قائم کیجئے اور مل لیجئے۔ پو بارہ یا تین کانے یہ آپ کی قسمت ہے۔

سوالات اِس فارم میں یہ ہیں:

ا۔ بال کیسے مطلوب ہیں، اور آپ کے کیسے ہیں؟

چھوٹے، درمیانے درجے کے یا لانبے؟

۲۔ عمر: ۱۷ سال؟ ۱۸ تا ۱۹ سال؟ ۲۰ تا ۲۲ سال۔۔۔۔۔۔۔ الخ

آخری خانہ ہے ۶۱ سال یا اِس سے اُوپر؟

۳۔ قد: پانچ فٹ سے کم؟ پانچ فٹ دو انچ؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الخ

آخری خانہ ہے ۶ فٹ یا اِس سے زیادہ۔

۴۔ طبقہ: مزدور طبقے کی لڑکی چاہیے؟ متوسط طبقہ؟ اونچا طبقہ؟

۵۔ تعلیم: معمولی؟ میٹرک؟ کالج کی؟ یونیورسٹی کی؟ ڈگری یافتہ؟ ۶۔ صورت و شکل: معمولی؟ قبول صورت؟ بہت خوبصورت؟

۷۔ کیسی: دوشیزہ؟ بیوہ؟ طلاق یافتہ؟

۸۔ رنگ: زرد؟ گندمی؟ سفید؟ چینی جاپانی قسم؟ ہندوستانی پاکستانی قسم کا؟ افریقی؟

۹۔ تن و توش: موٹی، درمیانہ، چھریرا بدن؟

۱۰۔ مذہب: پروٹسٹنٹ۔ رومن کیتھولک؟ یہودی؟ لامذہب؟ کوئی اور مذہب؟

۱۱۔ سیاسی خیالات: بائیں خیال کی؟ دائیں خیال کی؟ سیاست سے دلچسپی نہ رکھنے والی۔

۱۲۔ پینا پلانا: باقاعدہ پینے والی یا کبھی کبھار؟ نہ پینے والی؟

۱۳۔ سگریٹ نوشی۔ باقاعدہ؟ کبھی کبھی؟ کبھی نہیں؟

۱۴۔ پیشہ: نوکر پیشہ؟ کلرک؟ بیروزگار؟ دستکار؟ طالبِ علم؟ ڈاکٹر یا نرس؟ سیکرٹری؟ پیشہ ور؟

۱۵۔ دلچسپیاں: یہ بہت لمبا خانہ ہے۔ اِس میں پوچھا گیا ہے کہ کس مضمون یا کس کھیل سے دلچسپی ہے۔ اس لٹریچر سے گھُڑ سواری تک اور لوگ گیت سے خوش خوری، آثارِ قدیمہ سے تاش کھیلنے تک کے مضمون آ گئے ہیں۔

۱۶۔ آپ جنسی طور پر کیسے ہیں؟ ناتجربہ کار؟ متوسط؟ بہت تجربہ کار؟

۱۷۔ آپ کو کیسی رفیقہ / رفیق چاہیئے؟ ناتجربہ کار؟ متوسط؟ بہت تجربہ کار؟

۱۸۔ رویّہ۔۔۔ اس میں جن سوالات کے جواب دینے ہوتے ہیں۔ نمونہ۔

۱۔ کیا کمیونزم ایسی لعنت ہے جس کا روئے زمین سے قلع قمع کرنا ضروری ہے؟

۲۔ کیا حکومت کو نجی صنعتوں میں دخل دینا چاہیئے؟

۳۔ کیا ہمیں بڑے بڈھوں کی بات ماننی چاہیئے؟ ۴۔ کیا ہم سب کو شادی کے بغیر تعلّقات کی آزادی ہونی چاہیئے؟

۵۔ کیا آپ پارٹی میں اجنبیوں سے بے تکلّف ہو سکتی ہیں؟

۶۔ کیا آپ کو پڑھنا پسند ہے یا ٹیلی ویژن دیکھنا؟

۷۔ کیا آپ کو ابسٹریکٹ آرٹ پسند ہے ؟

۸۔ کیا آپ بائیبل کو سچّا جانتے / جانتی ہیں ؟

ڈیلی ٹیلی گراف میں ایک صاحب آئن کرچئن نے مضمون لکھا ہے۔ اُنہوں نے کمپیوٹر میں اپنا نام دیا تھا اور اُس نے دس لڑکیوں کے پتے اُن کو دیئے۔ اُنہوں نے اپنی ضروریات یہ بیان کی تھیں کہ لڑکی ۲۳ یا ۳۴ سال کے درمیان ہو۔ قد زیادہ سے زیادہ ۵ فٹ ۹ اِنچ کیونکہ خود یہ ۹ انچ تھے۔ موٹی پتلی اور رنگ وروغن کے معاملہ میں بھی خاصی وسیع النظری کا ثبوت دیا تھا۔ لکھتے ہیں:

”کمپیوٹر نے جن لوگوں کے پتے دیئے تھے اُن میں دو نے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔ میں نے فون کیا۔ دونوں باہر گئی ہوئی تھیں (اور لوگوں کو بھی اُن کے پتے اور نمبر دیئے گئے ہوں گے) دوسری دو کو میں نے خط لکھے اور ملنے کی دعوت دی۔ اُن میں سے ایک کا فون آیا۔ مس میسی نام تھا۔ میں نے کہا آج شام فلاں تھیٹر میں ملیں۔ اُس نے کہا بسر و چشم، بلکہ مجُھے آکر لے جایئے۔

میں نے کہا۔ میرے لئے کار کرائے پر لینا اور پھر آنا اور پھر تھیٹر کے وقت تک پہنچنا مُشکل ہے۔

بولیں: تو کیا آپ کے پاس اپنی کار نہیں؟ میں نے بہت معذرت کی کہ نہیں ہے۔

وہ بولیں، میرے تمام دوستوں کے پاس کاریں ہیں۔ میرے سابق شوہر کے پاس بھی کار تھی۔ میرے لئے کسی ایسے شخص سے دوستی کرنا مُشکل ہے جس کے پاس کار نہ ہو۔ معاف فرمائے۔

یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں مایوس ہو کر چلا گیا تھا کہ ایک لڑکی کا فون آ گیا۔ اُس کو میرا پتہ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا میرے پاس کار نہیں ہے۔ وہ بولیں کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے پاس ہے۔ شام کو فلاں جگہ ملیں۔ یہ فون بند کیا ہی تھا کہ ایک دوسری کا فون آیا۔ اس کے پاس بھی کار تھی۔ ان کے ساتھ ڈنر کا طے ہوا۔ وہ آئیں اور اپنی داستان بیان کی کہ میرا میاں پولیس میں ہے۔ میرے اتنے بچّے ہیں اور میں میاں سے علیحدہ ہونے والی ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ یہ۔۔۔ اور وہ۔

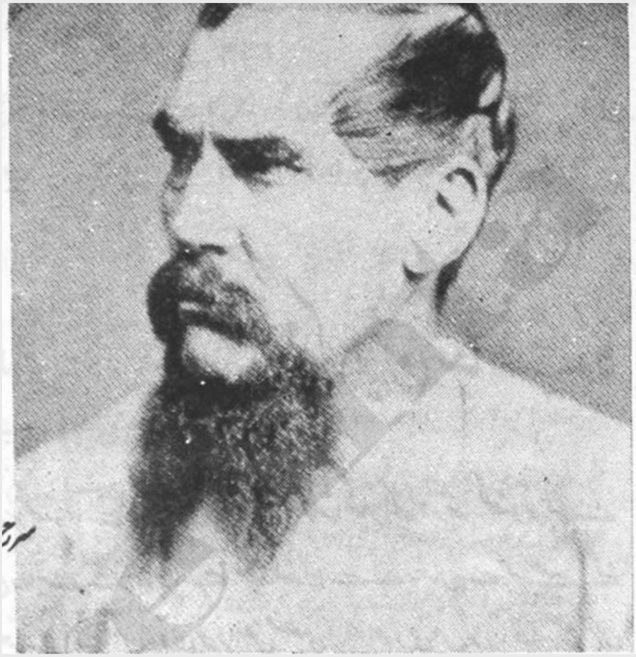
یہ بور ہو گئے۔۔۔۔۔ معاملہ ختم۔

آگے اُن کی داستان لمبی ہے۔ کسی سے ملنے کے لئے کیا نشانی مقرّر کی جاتی تھی۔ میری ٹائی فلاں رنگ کی ہو گی۔ میرے ہاتھوں میں فلاں کتاب ہو گی۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ اِن میں کوئی کسی دفتر میں سیکریٹری تھی کوئی ٹیچر تھی۔ سبھی تنہائی اور کسمپرسی کی ماری ہوئی یا عیش ولذّت کی دلدادہ۔ یہ سبھی سے ملے اور مل کر رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ بہت کم بیلیں منڈھے چڑھتی ہیں۔ لوگ اپنے کوائف غَلَط دیتے ہیں۔ عُمر کم کر دی یا رُعب جمانے کو کہہ دیا کہ مُجھے گھڑ سواری یا کوہ پیمائی کا شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ کال گرلز یعنی اوباش عورتیں بھی اپنے نام پتے کمپیوٹر میں دینے لگی ہیں۔ یہ کمپنیاں کہتی ہیں اِس کا تو ہمارے پاس کُچھ علاج نہیں۔ کمپیوٹر تو حساب کی چیز ہے۔ محتسب یا داروغہ تھوڑا ہی ہے۔

ذکر برٹن صاحب کا

ہمارے لکھنو جانے کا باعث ہوس سیر و تماشا نہیں کُچھ اور تھا۔ لکھنؤ تو ہم نے مرزا غالب کی رعایت سے لکھ دیا ہے۔ مُراد لندن سے ہے۔ جہاں سے ہم جیسے گئے ویسے ہی پھر کے آگئے ہیں۔ دِن تو فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں گزرتا تھا۔ صُبح کہیں۔ شام کہیں۔ آج لندن میں۔ کل مضافات میں۔ ویک اینڈ اور شام کی فُرصت کے لمحات لائبریریوں اور زیارتوں میں گزرتے تھے۔ خاص جستجو میں سر رچرڈ برٹن کے ذاتی کتب خانے کی تھی اور ان کا مقبرہ بھی دیکھنا مقصود تھا جو مارٹ لیک کے قبرستان میں ہے اور ماربل ٹینٹ یعنی خیمۂ مرمر کہلاتا ہے۔ بہت دنوں لوگوں سے پوچھتے پھرے کہ مارٹ لیک کہاں ہے اور اِس کا قبرستان کہاں ہے۔ کوئی نہ بتا سکا۔ بڑی مُشکل سے پتہ چلا اور ایک روز ہم ۹ نمبر کی بس میں سوار ہو کر ہیمر سمتھ روانہ

ہوئے۔ ہیمر سمتھ سے دوسری بس لی۔ اُس کا نمبر بھی یہی تھا۔ آخر اُس کی منزل بھی آگئی۔ بس گیراج میں چلی گئی اور ہم کھڑے رہ گئے۔ علاقہ یہ مارٹ لیک ہی کا تھا لیکن قبرستان ایک بھلے مانس نے بتایا کہ آپ سیدھے جائیے۔ پھر داہنے ہاتھ مڑیئے۔ ریل کا پُل آئے گا۔ اُس کو پار کر کے لائن کی دوسری طرف اُتریے اور بائیں ہاتھ چلنا شروع کر دیجئے تا آنکہ قبرستان کا پھاٹک دکھائی دے۔



سر رچرڈ برٹن

آخر قبرستان آ گیا۔ گورے قبرستان کا ماحول عجیب پُر سکون ہوتا ہے۔ درخت۔ سائے۔ چیلیں۔ کُتّے۔ آدم نہ آدم زاد۔ ہم نے نظر دوڑائی۔ جو نقشہ خیمۂ مرمر کا ہماری نظر میں تھا اور جس کی ہم نے تصویر دیکھ رکھی تھی کہیں نظر نہ آیا۔ ہم نے کتبے پڑھنے شروع کئے کہ شاید مقبرہ ۱۸۹۰ء اور آج کے درمیانی ۸۰ برسوں میں ڈھے گیا ہو گا۔ بڑی پُرانی قبریں تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع زمانے کی بھی۔ درختوں کے جھُنڈوں میں بھی جا دیکھا۔ آخر ایک شخص مشین سے گھاس کاٹتا نظر آیا۔ اُس سے ہم نے پوچھا بابا سر رچرڈ برٹن کی قبر کہاں ہے۔ اس نے یہ نام سُن رکھا تھا لیکن تلاش میں ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ آخر اُس نے کہا لائن کے پار جِدھر سے آپ آئے ہیں ذرا آگے چلئے تو گرجا کی اوٹ میں رومن کیتھولک قبرستان ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں ہو۔۔۔۔ ہمیں بھی یاد آیا کہ برٹن کی بیوہ نے جو رومن کیتھولک تھی برٹن کے دوسرے رشتہ داروں اور دوستوں کی مخالفت کے باوجود نہ صرف برٹن کی آخری رسوم رومن کیتھولک طریقے پر سر انجام دیں تھیں بلکہ اُسے دفن بھی کیتھولک قبرستان میں کیا تھا حالانکہ برٹن پیدائش سے پروٹسٹنٹ تھا اور عقیدتاً عیسائیت۔ بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ خُفیہ طور پر مسلمان ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم

بالصواب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی مذہب کا وہ قائل تھا تو وہ اسلام ہی تھا۔ میور نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے متعلّق جو زہرناک کتاب لکھی تھی (سر سیّد نے اُس کے رد میں خطباتِ احمد لکھے) برٹن نے بڑے معقول طریقے پر اُس کا رد کیا تھا اور اُس کا جو مقالہ اسلام پر اُس کی موت کے بعد شائع ہونے والی کتاب The Jew, The Gypsy And Al-Islam میں شامل ہے اس سے بھی یہی گمان ہوتا ہے۔



بیگم رچرڈ برٹن

خیر تو ذکر قبرستان کا تھا۔ ہم اُلٹے پاؤں لوٹے ریل کا پُل جو چھوٹا سا اور ٹیڑھا میڑھا نہ جانے کس زمانے کا ہے اور سیڑھیوں والا یعنی پیدل والوں کے لئے ہے۔ اُسے پار کر کے سڑک پر آئے۔ وہاں سے آگے چلے۔ بیس تیس قدم پر داہنے ہاتھ ایک گرجا دیکھا۔ ویران سا۔ اُس کے صحن میں کُچھ کاریگر لکڑی کا کام کر رہے تھے لیکن ہم چُپ چاپ اُس کے عقب سے چلے آئے۔ یہاں قبرستان تھا۔ بہت مختصر سا۔ اس میں گھٹنوں گھٹنوں گھاس جھاڑیاں اور بڑے بڑے چھتر والے درخت جانے کیا تھے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے غول پتھّر مار مار کر کُچھ جھاڑ رہے تھے۔ ہم یونہی گرجا کے عقب میں جا کر داہنے مُڑے۔ خیمۂ مرمر سامنے تھا۔ قبروں کے بیچوں بیچ گھاس سے گزر کر ہم وہاں پہنچے۔ جانے کتنے دنوں بعد وہاں کوئی شخص آیا ہو گا۔ تو یہ تھا خیمۂ مرمر۔ اُس شخص کی آخری آرام گاہ جو دُنیا بھر کی خاک چھانتا پھرا۔ صورتِ حال واقعی عرب خیمہ کی سی تھی۔ اور اِس کے حاشیے پر چاند ستارے بنے ہوئے تھے۔ اور چوٹی پر سہ پہلو ستارہ اور شکنیں بھی بنائی گئی تھی۔ لیکن خیمہ کے رنگت گلابی اور سیاہ ہے۔ مال جانے کیا ہو گا۔ مرمر تو قطعی نہیں ہے کیونکہ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ نمی سے پھول کر اُوپر کی تہہ چیخ گئی ہے۔ اور اندر سیمنٹ کا مسالہ نظر آرہا

ہے۔ اِس خیمہ کا دروازہ پہلے کھولا تھا اور برٹن کی بیوہ جس کا چھ سال بعد ۱۸۹۶ء میں انتقال ہوا، بعض اوقات اِس خیمہ میں آکر رہتی تھی۔ اونٹوں کے گلے میں ڈالنے کی گھنٹیاں اِس کے اندر لٹکی رہتی تھی۔ اب تیغہ شدہ دروازے پر سیمنٹ کی ایک کتاب رکھی ہے جس پر میاں بیوی کے نام رقم ہیں۔ اِس سے کُچھ فاصلے پر پتھّر کی ایک مستطیل لوح ہے جس کے اُبھرے ہوئے حروف میں سے کُچھ جھڑ چُکے ہیں۔ کُچھ باقی ہیں۔ گھاس کو ہٹا کر ہم نے یہ عبارت نقل کی :

رچرڈ برٹن

الوداع اے دوست، اے عزیز دوست، اور عظیم اور مرحوم ہستی!
زندگی ختم ہوئی۔ اِس کی بے پناہ مسرتیں بھی اور بے پناہ خطرات بھی۔

وہ جس کے لئے جان جوکھوں کے کام ہی کھیل تھے۔ جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیزے خنجر اور گولی کے مقابلے میں مامون ہے، اب مصافِ ہستی سے مُنہ موڑ کر یہاں چُپ چاپ آرام کر رہا ہے۔ لیکن انگلستان کی اس عظیم ہستی کی غم زدہ بیوہ کے ساتھ نوحہ کناں ہے۔

اِس دیار کے آخری اور عظیم ترین نائٹ، برطانوی سلحشور اور عرب شیخ! مشرق کے مغنّی اور الف لیلیٰ کے لازوال عجائب کے عاشق، جس کی روح ابد تک تازہ مہموں کے لئے بے تاب رہے گی۔ الوداع !

الف لیلی کا مترجم برٹن عجیب و غریب شخص تھا، اور شائد ہی کسی اور شخص میں اتنی ساری خوبیاں ایک ساتھ جمع ہوئی ہوں۔ الف لیلیٰ کا ترجمہ ہی زندگی بھر کا کام ہے، جسے اِس نے تین چار سال میں نبٹایا۔ اِس کے علاوہ بھی کوئی پچاس کے قریب تصانیف چھوڑی ہیں جن میں چار پانچ سندھ کے متعلّق ہیں۔ یہ سر چارلس نیپئر کے زمانے میں ۱۸۴۲ء میں ہندوستان آیا تھا۔ پہلے بمبئی اور بڑودہ میں رہا۔ پھر کراچی آیا۔ اس وقت وہ فوج میں لیفٹینٹ تھا۔ بعد ازاں سروے کے محکمے میں چلا گیا۔ یہ ۲۹ زبانوں کا ماہر تھا، جن میں یورپ کی قریب قریب ساری زبانوں انگریزی، فرنچ، ہسپانوی، اطالوی، جرمن، پرتگیزی، لاطینی، یونانی کے علاوہ اُردُو، ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی، گجراتی، سندھی۔ پنجابی، ملتانی (جس کی گرامر بھی اِس نے لکھی ہے) اور چینی وغیرہ شامل ہیں۔ بعض کتابیں تو برٹن کی ذاتی لائبریری میں ایسی دیکھیں جس کا رسم الخط معلوم نہیں کیا ہے۔ ہاں افریقی زبانوں کا ہم ذکر کرنا بھول

گئے اور وہ کتابی کیڑا ہی نہیں مہم باز بھی تھا۔ اس نے مسلمانوں کے بھیس میں حج کیا۔ اور تین جلدوں میں زیارت حرمین شریف کا سفر نامہ لکھا:

A Pilgrimage to Al-Medina and Meccah

افریقہ میں حرّار گیا، حبشہ کے اِس شہرِ ممنوع میں اِس سے پہلے کوئی یوروپیئن نہ گیا تھا۔ پھر دھومی کے بادشاہ کے دربار میں گیا، پھر نیل کا منبع تلاش کرتا پھرا۔ زخمی ہوا، بیمار ہوا، قید ہوا۔ اِس سیاحت اور مُہم کا احوال لکھا اور مغربی افریقہ کے ضرب الامثال جمع کئے، ایک کتاب زنجبار کے بارے میں بھی ہے۔ مصر کے صحرائے سینا میں سونے کی تلاش میں کانکنی بھی کی اور اِس کی لائبریری میں بہت سی کتابیں کیمسٹری اور اور انجنیئرنگ پر بھی ہیں، اور قریب قریب ہر کتاب پر اِس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تفصیلی حاشیے ہیں۔ پھر امریکہ گیا، ایک کتاب برازیل پر ہے، ایک یوراگوئے پر۔ ایک سالٹ لیک (امریکہ) کے مورمون فرقے کے پیغمبر کے بارے میں بھی جس سے یہ ملا تھا۔ اور ہاں دمشق کے متعلّق اِس کی تصنیف کا ذکر کرنا ہم بھول گئے جہاں یہ ۱۸۷۰ء کے قریب برطانوی قونصل تھا۔ مراکش جانے کا متمنّی تھا لیکن اِس کی اکڑ طبیعت نے دُشمن بہت بنائے تھے۔ مراکش کے بجائے اِسے

ٹریسٹ بھیجا گیا۔ الف لیلیٰ کا ترجمہ اور پرفیومڈ گارڈن وغیرہ، اِس زمانے کی تالیف ہیں۔ اس کا انتقال ٹریسٹ میں ہوا۔ اِس کی ایک معرکتہ آرا کتابِ شمشیر (A book of Sword) یعنی دُنیا جہاں کی تلواروں کے بارے میں ہے اور ایک رسالہ Bayonet سنگین کے استعمال پر بھی، جو بعد ازاں برطانوی فوجوں کے نصاب میں شامل ہوا۔ بہادر علی حسینی کی اخلاقِ ہندی فورٹ ولیم کالج میں چھاپی ہے۔ اس کا ترجمہ بھی اِس نے کیا تھا جو مسوّدے کی شکل میں رکھا اور حافظ کی غزلیات کا ترجمہ بھی۔ ہم نے دیکھا، نا صاف مسوّدے کی صورت میں جس کا اِس کے سوانح نگاروں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ جب یہ مرا ہے تو کوئی پچیس تیس کتابیں مسوّدے کی صورت میں تھیں۔ بعض قریب قریب مکمّل۔ بعض نا تمام۔ بیوی اِس کی عجیب عورت تھی۔ اُس نے گھر کے دروازے بند کئے، اور برٹن کے مسوّدے اور کاغذات جلانے شروع کئے۔ کوئی ایک ہفتہ تک وہ جلاتی رہیں۔ اِس میں اُس کا روزنامچہ یعنی جنرل بھی تھا جو وہ باقاعدگی سے چالیس سال تک لکھتا رہا اور آج موجود ہوتا تو جانے کتنے انکشافات اُس کی بدولت ہوتے۔ اُس کا کہنا کا تھا کہ برٹن نے

خواب میں آ کر مجُھے ہدایت کی۔ وہ بھی زبانی نہیں بلکہ اِس کے بشرے سے میں نے معلوم کیا کہ اُس کے مسوّدے جلا دیئے جائیں۔

اُس بی بی نے یہ کیا اور ساری دُنیا اب تک اُس کو نفرین کرتی ہے۔ اُس خاکسار نے برٹن کی سوانح لکھنے کا بیڑا اُٹھایا ہے جو بلادِ مشرق میں اُس کی زندگی پر محیط ہو گی۔ خصوصاً سندھ کے دورانِ قیام اور حج کی سرگزشت اور دریائے نیل کی دریافت کا معرکہ۔ خُدا کا شُکر ہے کہ اُس کی لائبریری کی بہت سی کتابیں چند اور مسوّدے بھی آتش زنی سے محفوظ رہ گئے اور آج لندن میں رائل اینتھروپالوجیکل سوسائیٹی کے کُتب خانے میں اُن کا ایک کمرہ ہے اور اِسی کمرے میں ہم ایک روز قید ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ کمرہ عموماً نہیں کھولا جاتا اور بیڈفورڈ سکوئر میں برٹش میوزیم سے کُچھ دور نہیں۔ عمارت کی سب سے اُوپر کی منزل پر ہے۔ صرف برٹن پر تحقیقات کرنے والوں کے لئے کھولا جاتا ہے۔ اِس میں کتابیں زمین سے چھت تک الماریوں میں لگی ہیں اور کُچھ فرش پر ڈھیر ہیں۔ ہر طرف گرد اور سیاہی کا پہرا ہے۔ ہم کئی دِن تک جاتے رہے اور گھنٹوں کتابیں دیکھا کرتے اور نوٹ لیتے۔ زیادہ جستجو اِس بات کی تھی آیا

برٹن کی کوئی تحریر کسی مشرقی زبان میں بھی ہے۔ خصوصاً اُردُو میں، فارسی میں، عربی میں، ہندی میں، سندھی میں۔ پھر کون سی کتابیں اور لُغّت اِن زبانوں کے اس کے پاس تھے اور غیر مطبوعہ مسوّدوں میں سندھ اور کراچی کا ذکر ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو لائبریری بند رہتی ہے۔ ایک روز جمعہ کو ہم قریب دوپہر جو بیٹھے تو معلوم نہیں کب شام ہوگئی۔ ہم تنہا۔ باقی سب لوگ لائبریرین وغیرہ نیچے کی منزل پر۔ کپڑے اور ہاتھ گرد اور سیاہی میں سَن گئے۔ جانے ہمارے ذہن میں یہ کیوں تھا کہ لائبریری چھ بجے تک کھُلی رہے گی۔ ہم چھ بجے کے بعد بھی رُکے رہے کیونکہ اِس لائبریری میں مطالعے کا ہمارا آخری دِن تھا۔ پیر کی صبح ہمیں پیرس روانہ ہونا تھا۔ چھ بج کر پچیس منٹ پر ہم نے دروازہ بند کیا اور چابی نیچے دینے کے لئے اُترے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہُو کا عالم ہے۔ سارے کمرے بند۔ کہیں روشنی نہیں۔ صدر دروازے بند اور ہماری چیزیں بستہ، بریف کیس، اور متفرقات بھی نیچے لائبریری کمرے میں بند رہ گئی۔ اب کیا کِیا جائے۔ نہ خادم، نہ چوکیدار، نہ گھنٹی، نہ ٹیلی فون۔ یا اللہ کل چھُٹّی، پرسوں چھُٹّی۔ یہ چابی تو ڈاک سے بھی پہنچا سکتے ہیں لیکن اپنی چیزیں کیسے بازیاب کریں۔۔۔ لائبریری پیر کی صُبح دس بجے کھُلے گی اور دس بجے ہمیں ائیر

ٹرمینل پہنچنے کا حکم ہے۔ اور ہم یہاں بند رہ گئے تو دو دِن تک بِلا کھانا کھائے پیئے کیسے گزرے گی۔ نیچے جا کر عقبی دروازہ کھولا۔ وہ بھی ایک بند اور دوران احاطے میں نکلتا تھا۔ آس پاس کی چھتوں پر کوئی آدمی نہ تھا۔ بے شک کمرے کی کھڑکی سامنے کی سڑک پر کھلتی تھی۔ اُس سے کسی کو اشارہ کیا جا سکتا تھا اور کمند کے سہارے نکلا بھی جا سکتا تھا لیکن ہماری چیزیں، کتابیں، بریف کیس، ہی میں ہمارے پیسے وغیرہ تھے۔ ایک بار پراگ میں بھی ہم پرانے یہودی قبرستان میں بند ہو گئے تھے اور چوکیدار باہر سے اچانک مقفّل کر کے چلا گیا تھا اور آج یہاں۔۔

لیکن خیر ہم نکل ہی آئے، کیسے نکلے اور کیسے پیر کی صُبح ہمیں ارل کورٹ سے بھاگ کر آنا پڑا اور کیسے محض اتّفاق سے ہماری چیزیں مل گئیں اور کیسے وکٹوریہ ائیر ٹرمینل پہنچنے میں ہم فقط آدھ گھنٹہ لیٹ ہوئے۔ یہ الگ داستان ہے۔



خیمۂ مرمر

لندن کو ٹاٹا

ہم لندن سے گرمی کھاتے چلے تھے تو بھاری سوٹ اِس خیال سے زیبِ تن کر لیا تھا کہ پیرس میں ضرور سردی ہو گی۔ یہاں بھی ایسی گرمی تھی کہ ہلکے سوٹ کو بھی گوارانہ کرتی تھی۔ بلکہ ایک روز تو قریب شام ہم قمیص ہی میں ایفل ٹاور کی طرف کو نکل گئے۔ اسی شام کچھ بوندیں پڑیں۔ رات کو خُنکی ہوئی اور صُبح ہونے تک صر صر چل رہی تھی اور خاصا ٹھنڈا موسم تھا۔ لوگوں کے لئے اوور کوٹ کا کہئے لیکن ہم یہ پالان اٹھانے کے قائل نہیں۔ اِس لئے بھی کہ ہمارے پاس نہیں۔ کراچی سے اِس لئے نہ لائے تھے کہ لندن میں دیکھا جائے گا۔ لندن میں بس ایک روز ضرورت پڑی اوور کوٹ کی تو نہیں بھاری رین کوٹ کی۔ لیکن سوچا کراچی میں ایک بیکار پڑا ہے۔ دوسرے کو کہاں رکھیں گے۔

ہمارے دوست مرزا نسیم بیگ کو اصرار ہے اب کے تمھیں پیرس کی خزاں دکھائیں گے۔ فلاں جنگل میں جائیں گے جہاں شاہ بلوط کے پیڑوں سے پتّوں کے گِرنے کا سماں عجیب ہوتا ہے۔ وہ خزاں کے اِس نظّارے کے عاشق ہیں اور ہمارا جی بہار دیکھنے کو چاہتا ہے اور اتّفاق کہیے کہ جس مُلک بھی جاتے ہیں وہاں خزاں ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ خزاں یا تو پہلے سے وہاں موجود ہوتی ہے یا ہمارے ساتھ چلی جاتی ہے۔ ہم کابل گئے تو درختوں پر ایک پتّہ نہ تھا۔ اصفہان میں بھی پتّے جھڑ رہے تھے اور شیراز لُنڈ مُنڈ تھا۔ لندن، ٹوکیو اور برلن میں خزاں کیا اور بہار کیا۔ بڑے شہروں میں لوگ برگِ درختانِ سبز کو نہیں دیکھتے۔ دوسری بہاروں کو دیکھتے ہیں۔ مرزا نسیم بیگ کے سے لوگ کم ہوتے ہیں کہ شہر میں رہیں اور جنگل کی آرزو کریں۔

کل کا دِن ہمارا بڑا بھرپور تھا۔ ہمارا کام یونیسکو ہی سے ہوتا ہے۔ سو وہ تمام ہوا۔ اب سین کے کنارے بلیمش میں آوارہ خرامی سے ہمیں کون روک سکتا ہے۔ پیرس ہم دو تین بار پہلے آ چکے ہیں لیکن لوور کے عجائب گھر کو دیکھے بِنا جاتے رہے۔ اب کے ہم نے تہیّہ کیا کہ لوور دیکھیں گے اور اس میں مونالیزا کی تصویر کو بھی دیکھیں گے ورنہ ہمارے آرٹسٹ مزاج لوگ طعنے دیں گے اور مونالیزا کو بھی شکایت رہے گی۔

پس ہم نے اٹھائے ڈھول اور تاشے اور ایک یار عزیز کی ہمراہی میں لوور کا راستہ لیا۔ لوور ایک ڈھنڈار جگہ ہے۔ یہ محل چالیس ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یعنی روم کے واٹیکن محل سے تین گُنا وُسعت رکھتا ہے۔ اِس کے مختلف حصّے مختلف بادشاہوں کے دور میں بنے اور اِس کی گیلریوں اور غُلام گردشوں کا طول سات آٹھ میل بنتا ہے۔ ہماری یعنی برِّ عظیمِ ہند کے محلوں میں کبھی وہ عظمت و شوکت نہیں رہی جو پیرس، روم، ویانہ یا یورپ کے دوسرے امصار میں دکھائی دیتی ہیں۔ محلوں کے حُجروں میں باریکی کا کام ہم جانتے ہیں۔ لیکن وہ بھی ایران اور ترکی کے مُقابلے کا نہیں۔ محل دیکھنے ہوں تو یورپ کے دیکھئے، چین کے دیکھئے، تُرکی کے دیکھئے۔ جبروت کے دیکھئے۔

لیکن خیر لوور تو اب اپنے میوزیم کی وجہ سے مشہور ہے۔ اِس کے بعض ذخیرے برٹش میوزیم سے بھی بڑے بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں میں فرق ہے۔ اِس میں آرٹ کے ذخائر یعنی تصویروں کے سِلسِلے بہت ہیں۔ برٹش میوزیم میں پُرانے آثار کی بھرمار ہے۔ آرٹ گیلریاں الگ ہیں۔ ہم نے آثارِ باقیہ بہت دیکھ لیے اور آرٹ گیلریاں بھی۔ لندن میں۔ جینوا میں۔ برلن میں۔ ایمسٹرڈم میں۔ لیڈن میں۔

پراگ میں۔ ویانا میں۔ قاہرہ میں۔ کولمبو میں۔ جاکرتا میں۔ پیکن میں۔ واشنگٹن میں۔ یہاں کا شہرہ بھی بہت سُنا تھا اور پھر مونالیزا۔۔۔ جس کی مُسکراہٹ پر ڈھیروں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔

لوور کے چاروں طرف دروازے ہیں۔ پہلے تو یہ ہوا کہ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے اور دوسرے سے نکل گئے۔ پھر دوسرے سے داخل ہوئے اور تیسرے سے نکل گئے۔ پھر تیسرے سے داخل ہوئے اور کہاں تک نکلتے رہتے۔ یہیں ٹکٹ ملتا تھا اور یہیں سے عجائب گھر شروع ہوتا تھا۔ یونانی اور رومن اور مصری آثار سے ہم جلدی فارغ ہوگئے۔ مشرقیات کو بھی بھگتایا اور آخر تصویروں کی گیلری تک پہنچ گئے۔ میلوں نہیں تو فرلانگوں دیواروں پر تصویریں لگی تھی۔ ایک سے ایک شاہکار۔۔۔ ان ان باکمالوں کے جن کے نام ہم نے سُنے تھے اور جن کے نام نہیں سُنے تھے۔

لیکن ہر کسی کو ہم نے نگہبانیوں سے یہی پوچھتے دیکھا کہ مونالیزا کس کمرے میں ہے۔ گویا کسی کو اِس کی فرصت نہ تھی کہ اپنی آنکھوں سے اِن مصوّروں کی کاوشوں کو دیکھے اور لُطف اندوز ہو اور اپنی رائے قائم کرے۔ مونالیزا کا سُنا تھا اور اُسی کی

تلاش تھی۔ صاحبو! پروپیگنڈا بڑی چیز ہے۔ ہم نے چھوٹی عُمر میں، دس بارہ سال کے سِن میں مونالیزا کا ذکر پڑھا تھا اور اُس کی تصویر نیرنگِ خیال کے سال نامے میں دیکھی تھی جو کُچھ نقّادانِ کرام نے مونالیزا کی مُسکراہٹ کے باب میں لکھا تھا انہیں پڑھ کر ہم متاثر ہوئے۔ لیکن تصویر دیکھ کر نہیں پھر سینکڑوں بار تصویر دیکھی اور آخر خیال کیا کہ یہ آخر نقلیں ہیں۔ اصل میں ضرور کوئی بات ہو گی۔



مونالزا

پس ہم لوور میں سٹیٹ روم پُہنچے تو دم بخود تھے۔۔۔ ایک تصویر کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ صرف ایک تصویر کے گرد۔ سُرخ بانات کا فریم تھا اور اُوپر شیشہ تھا۔ ہم نے اِسے دور سے دیکھا اور پاس سے دیکھا۔ بہت جی کو کڑا کیا۔ لیکن صاحبو آپ لوگوں نے بھی تصویر دیکھی ہے۔

اِس میں کون سی خاص بات ہے۔ ایک عورت ہے جس کے جسم میں کسی طرح کی موزونیت نہیں۔ ایک چہرہ ہے جس پر کسی طرح کے جذبات نہیں۔ کسی طرح کی خُوشی۔۔۔ غم کی کیفیّت نہیں۔ اور ایک مُسکراہٹ یا نیم مُسکراہٹ ہے جو آپ کسی بھی غبی شخص کے چہرے پر دیکھ سکتے ہیں۔ لیونارڈو ڈی ونشی کے ہم بہت قائل ہیں اور اُس کے شاہکار ہم نے دیکھے ہیں لیکن یہ تصویر؟ ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں۔ ایک بار اُسے کسی نے چڑھا دیا۔ باقی لوگ تقلیداً مکھّی پر مکھّی مارتے گئے۔ اگر کسی کی رائے ایسی ہوئی جیسے ہماری ہے تو مروّت کے مارے یا نقّادوں کے ڈر سے چُپ ہو گیا کہ بد ذوقی کی تہمت نہ اُٹھائے۔ مونالیزا کے دِلدادگان ہم پر نفرین بھیجنے سے پہلے ازراہِ انصاف اِس تصویر کو ایک نظر دیکھ لیں اور ایک بے ڈول غبی چہرے پر احمقانہ تاثر کو ملاحظہ فرمائیں۔ جو مُسکراہٹ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ پھر جو جی چاہے ہمارے بارے میں کہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارے جو دوست تھے وہ بھی پڑھے لکھے تھے۔ وہ بہت کُچھ آرٹ کھا پی چکے تھے لیکن اِس بارے میں اُنہوں نے ہماری تائید کی۔ اور کہا بھی کہ اِس کی تعریف اِس لئے کرتا تھا کہ دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور دوسرے لوگ بھی اِسی لیے کرتے ہوں گے کہ۔۔۔ انصاف پسند اور اہلِ نظر اور

سمجھ دار قارئین ہماری رائے سے اتّفاق کریں گے۔ صرف انہی کو ہم سے اختلاف ہو گا جو تقلید پسند، کم فہم اور متعصّب قسم کے ہیں۔

پیرس بھی کوئی شہر ہے

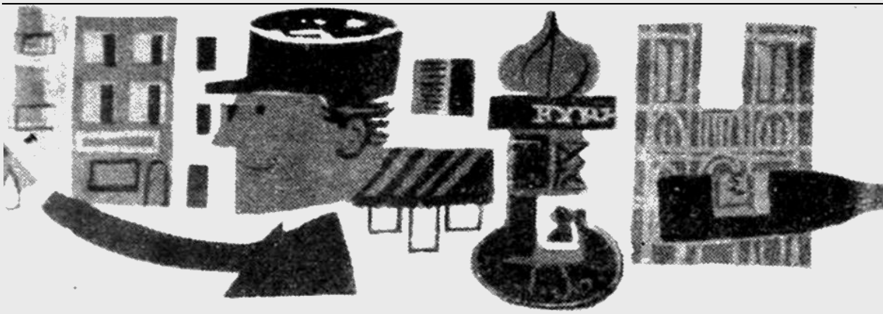
پیرس کو شہرِ خوباں کہا جاتا ہے اور اس کے نام پر لوگوں کو لہلوٹ دیکھا ہے لیکن یہ خوباں کہاں ہے۔ ہمیں تو نظر نہ آئیں۔ ہم خوباں کی دید کے لئے کسی خاص جگہ تو نہ گئے، نہ جانے کے قائل ہیں۔ کسی جگہ کے لوگوں کے حُسن اور دِلکشی کا انداز مختلف طبقوں کے اُن لوگوں ہی سے لگایا جایا ہے، جو آپ کو گلیوں بازاروں میں نظر آتے ہیں۔ یا محفلوں میں آپ سے ملتے ہیں، سچ یہ ہے کہ ہمیں ایک صورت ایسی نظر آئے گی کہ آپ اُس پر نظر جمانا یا دوسری نظر ڈالنا (اچھّی یا بُری) پسند کریں۔ پیرس میں مختلف جگہوں پر پیدل یا ٹیوب میں جاتے ہوئے (جسے یہاں میترو کہتے ہیں) ہم نے ایک دوست سے جو سال میں چار ماہ پیرس میں رہتے ہیں، اپنا یہ تاثر بیان کیا، بلکہ میترو میں بیٹھے بیٹھے کہا کہ ہمارے ڈبّے میں اِس وقت تیس چالیس

عورتیں ہو گی۔ اِن میں بیس پچیس دوشیز گان، کیا کسی کی صورت ایسی ہے جس پر ہزار جان تو ایک طرف ایک جان سے بھی قربان ہونے کو جی چاہے۔ اُنہوں نے کہا تُم سچ کہتے ہو۔ چہرے کی سفیدی اور سُرخی کا حُسن سے کچھ تعلّق نہیں۔ حُسن کا مطلب موزونی اعضا اور طرحداری ہے جو افریقہ کے کالے چہروں میں بھی کئی جگہ نظر آتی ہے۔ اور ہمارے بلادِ مشرق کی سانولی سلونی صورتوں کے تو کیا ہی کہنے۔ بعضوں کا نمک تو ایسا ہوتا ہے جیسے کھیوڑے کی کان سے نکالی ہوں۔ ان پر رنگت کی تہیں ہوتی ہیں۔ اداسی میں اور رنگت مسکراہٹ میں اور۔ سانولی سے گندمی اور گندمی سے شہابی۔ حیا اور شرماہٹ کا رنگ سارے چہرے پر جھلک جاتا ہے بلکہ چھلک جاتا ہے۔ یورپ کے سُرخ و سفید چہروں کو دیکھ جائیے۔ موم کے چہرے ہوتے ہیں۔ اور طرحداری کا تناسب بھی بہت کم۔ کچھ بات لباس کی بھی ہے۔

سب باتوں کو ملا کر دیکھئے تو ہمارے ہاں قابلِ دید صورتوں اور سراپاؤں کی فی صد تعداد یورپ کی صورتوں کے مقابلے میں پانچ گُنا ہو گی۔ انگلستان کو تو خیر ہم کسی شمار میں نہیں رکھتے۔ دم تحریر پیرس کی بات کر رہے ہیں، یورپ اور سکینڈے نیویا کے آٹھ دس مُلک اور بھی ہم نے دیکھے ہوں گے۔ یورپ ہی میں موازنہ ٹھہرے تو

سویڈن بھی اِس معاملے میں فرانس پر فائق۔ اسپین بے شک بہتر اور اٹلی اُس سے بھی اچھّا۔ مشرق کی طرف آتے جایئے۔ مشرقِ وسطیٰ میں حُسن و ملاحت خاصی اگرچہ مِصر میں آمیختہ بہ فربہی۔ مشرقِ بعید میں سانولے پن کے ساتھ نقوش کا تیکھا پن بھی بڑھتا جاتا ہے۔ لنکا اور ہندوستان کے کیا کہنے۔ ملایا میں ناک اتنی تیکھی نہیں رہی لیکن ملاحات اور نازکی بہت۔ یہی بات انڈونیشیا کی جانیے۔ فلپائن میں غنیمت۔ جاپان میں حُسن کا تناسب پچیس تیس فیصدی، کوریا میں صورتِ حال کہیں زیادہ بہتر اور تسلّی بخش، جزائر ہوائی میں جہاں جنگل اور شہر مل گئے ہیں وہاں گندمی چہرے اور کالے بال لُبھاتے ہیں۔ اِس سے آگے سمندر آجاتا ہے۔ امریکہ کے خُشک چہرگان جانے کیوں یورپ سے بہر حال شاید اچھّے۔ آب وہوا کا دخل ہو۔ لیکن پھر بھی ہائے دِلّی ہائے لاہور ۔۔۔ اپنے وطن اور اپنے برِّ عظیم کی کیا بات ہے۔ آپ نے آبِ حیات میں جانی کبابی کی ہنڈیا کا حال پڑھا ہو گا۔ بس کُچھ اِس قسم کے اسباب ہیں جو ہمیں وطن میں روکے ہوئے ہیں ورنہ ۔۔۔ خیر ورنہ ہم بھی اِسی تنخواہ پر کام کرتے۔ باہر ہمیں کون پوچھتا۔

ذکر پیرس کا تھا۔ ہم آوارگی کی ترنگ میں ایران توران کی ہانکنے لگے اور جمالیات پر عالمانہ مقالہ لکھنے لگے۔ کہنا فقط یہ تھا کہ کہ پیرس نے ہمیں بھی مایوس کیا۔ شہر میں کیا بات ہے۔ در و دیوار صدیوں کے دھوئیں سے تاریک۔ سڑکوں پر بھی صفائی نہیں، جو تصویر میں آتی ہیں۔ بس، کاروں کا ہجوم، ہر جگہ میترو یعنی انڈر گراؤنڈ سفر لندن کے مُقابلے میں خراب۔ ٹیوب اسٹیشنوں پر ایسکے لیٹر بس ایک آدھ جگہ ہے۔ پُرانا دھرانا۔۔۔ ورنہ سیڑھیاں اُترتے چڑھتے بے حال ہو جاؤ۔ بعض سڑکیں اور چوک البتّہ دیدنی ہیں۔ مثلاً شانزے لیزے کی مشہور سڑک، کنکارڈ سے اتوائیل تک جس کے دونوں طرف بڑے بڑے مغازے یعنی دُکانیں اور اسٹور اس کی فرلانگ بھر چوڑائی سے عجیب وُسعت کا احساس ہوتا ہے۔ کنکارڈ کا میدان بھی کشادگی اور سبزے سے ممتاز ہے۔ ورسائی اور نواحات کو چھوڑیئے۔ بیچ شہر کے ہم کسی کو حسین کہہ سکتے ہیں تو وہ ایفل ٹاور کے باغیچے ہیں اور فوّارے ہیں۔ اور سیر کی رَوشیں ہیں۔ یہاں بیٹھیئے اور سیر دیکھیئے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ پیرس والوں کے پاس ایفل ٹاور بھی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ایک بار تو سچ مچ اُس کو ڈھانے اور ہٹانے کی تجویز بھی ہوئی تھی لیکن اِس میں خرچ زیادہ پڑتا تھا۔ عمارتیں اور محل بعض عظیم الشّان ہیں لیکن روم



اور ویانا کی ٹکّر کے نہیں۔

دریائے سین پر بھی ہم نے کشتی کا پھیرا کیا اور اپنی مرغوب سڑک بلُمش بنی شاہراہِ سان مشل (سینٹ مائیکل) پر آوارہ گردی کرتے رہے۔ لیٹن کوارٹرز کی فضا میں عجیب لاابالیانہ پن ہے لیکن اس کا تعلّق بھی حسن اُور صفائی سے کم کم ہی سمجھیے۔ یہاں ہمیں Au Vieux Paris Cheznico کے تکّے اور اس ریستوران کی فضا بہت پسند آئی۔ چھوٹا سا گھریلو ریستوران ہے۔ جو چار سو برس کہنہ ایک عمارت میں واقع ہے۔ مشہور کیفے ڈی فلور بھی جو ایک زمانے میں سارتر کی بیٹھک کی وجہ سے مشہور تھا اس کے قریب ہی ہے۔ بے شک پیرس میں اور بھی سامان دلکشی کے ہوں گے جن میں ایک وائن ہے۔ جس سے ہم بے نصیب ہیں۔ اور وہ ٹھکانے جہاں ہماری رسائی نہیں۔ نہ ارادی، نہ غیر ارادی۔ پیرس کے چاہنے والے ہمیں کوسیں

گے۔ کم از کم اتنا کہیں گے کہ کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا۔ لیکن اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ یہ تو پیرس ہے۔ ہمارے مخدوم جناب حفیظ جالندھری نے تو اصلی جنّت کو ایک مصرع میں رد کر دیا تھا۔ ؏

کیا ہے جنّت؟ چند حوریں، اک چمن، دو ندیاں

ہم دوبارہ عرض کریں کہ شہر کی فضا بہت اچھّی ہے اور اِس کی صحبتوں اور گلیوں بازاروں میں بھی عجیب دلکشی ہے۔ فقط نسوانی حُسن کی معتدبہ کمی کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

فرانسیسیوں میں یہ بڑی خرابی ہے کہ۔۔۔

فرانسیسیوں میں یہ بڑی خرابی ہے کہ اپنی زبان کو اس لہجے میں بولتے جس میں ہم چاہتے ہیں کہ وہ بولیں تاکہ ہماری سمجھ میں بھی آئے۔ اس میں سراسر انہی کا نقصان ہے۔ ہمارا اس میں کیا جاتا ہے۔ اُس روز بکثرت پیدل چلنے کے باعث ہماری انگلیوں پر جو گٹّے گئے تھے۔ ان پر لگانے کے لئے ہمیں کارن کیپ چاہیے تھے۔ یہ ایک چیز ہوتی ہے جسے گٹھے پر چپکا دیں تو تکلیف نہیں ہوتی۔ بہت سمجھایا۔ انگریزی میں۔ اُردُو میں۔ فارسی ہمیں بہت آتی ہے اس میں بھی۔ وہ بی بی کہ کیمسٹ کے کاؤنٹر پر کھڑی تھی کُچھ نہ سمجھی۔ آخر ہم نے پاؤں کی انگلیوں کی پوروں کو ہاتھ لگایا اور مُنہ بنا کر واضح کیا کہ تکلیف ہوتی ہے۔ تب اُس نے شے مطلوبہ ہمیں تھمائی لیکن بارہ آنے کی چیز کے دو روپے پھر بھی لگائے۔ فرانس میں ہمیں کسی چیز کی خریداری میں (اگر

ہم نے کوئی خریداری کی تو) کوئی دقّت پیش نہ آئی اوّل تو قیمتیں لکھی رہتی ہیں۔ جہاں نہیں وہاں بھی دُکاندار کُچھ بھی بتائے آپ ایک بڑا سا نوٹ اندازہ کر کے اُس کے حوالے کیجیے۔ وہ باقی پیسے بھی دے دے گا اور ”مرسی بُکو“ بھی کہے گا۔ ہم نے اتنے بڑے ملک چین کی سیر محض آداب عرض اور شکریہ یعنی ”نی ہاؤ“ اور ”شے



شے“ کی مدد سے کرلی۔ فرانسیسی تو پھر چھوٹا ہے۔ اس میں اگر ہمارا کام ”بوں ژور“

(گُڈ مارننگ) اور "مری بُکو" (بہت بہت شکریہ) سے چل رہا ہے تو کُچھ تعجّب کی بات نہیں۔ ہمارے ہوٹل کی چیمبر میڈ جسے ہم اے مائی کہہ کر بلاتے ہیں ہم سے طول طویل گفتگو فرنچ زبان میں کرتی ہے۔ ہم سُنتے رہتے ہیں اور خاموشی کو اور مُسکراہٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی اے مائی تیری بات ہم سمجھ گئے۔ جو کُچھ تُو کہتی ہے ٹھیک کہتی ہے۔ لیکن ہم جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ اگر تیرا مطلب ہے آج موسم اچھّا ہے اور ہمیں سیر باغ کو جانا چاہئے، تب بھی مناسب مشورہ ہے۔ اگر تیری تقریر کا مطلب ہے کہ اِس ہوٹل میں بوٹ پالش کا انتظام ہے یا تو ہماری چادر بدلنے کے لئے ہمیں بستر سے اُٹھانا چاہتی ہے۔ تب بھی کُچھ مضائقہ نہیں۔ ہماری خاموشی کا بُرا مت مان کیونکہ ہم خاموش طبع ہیں اور مُسکرا اِس لئے رہے ہیں کہ طبعاً خوش مزاج ہیں۔

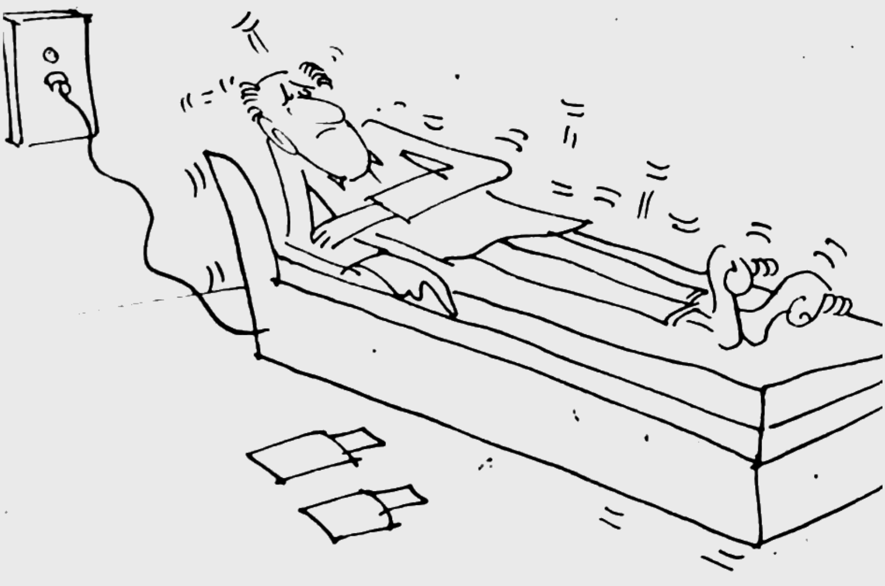
کوئی پوچھے کہ سینٹ مائیکل میں کیا خرابی ہے جو آپ St. Michael کو ساں مشل کہتے ہیں اور Champ de Elysee کو شانزالیزے کہنا کہاں کی معقولیت ہے۔ ہمارے ہوٹل کا نام Duquesne ہے۔ اوّل تو اتنا مُشکل نام رکھنے کی کیا ضرورت۔ پھر اِسے ڈوکزنے وغیرہ کہنے میں کیا خرابی ہے۔ معلوم ہوا یہ ڈوکین ہے، ویسے اچھّا

ہوٹل ہے۔ ہمارا کام یونیسکو سے ہے اور دِن بھر وہاں وقت کھو کر فقط رات کے وقت گھر پر ہوتے ہیں۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ یونیسکو سے قریب ترین ہوٹل یہی ہے اور لندن کے ہوٹل کے مُقابلے میں سہولتیں بہتر، دام آدھے سے بھی کم۔ یہ سچ ہے اِس ہوٹل کے کمرے میں ایسا ڈبّہ نہیں جیسا لندن کے فل ہیچ ہوٹل کے کمرے میں تھا جس کا ایک بٹن دبانے سے ہم نکالنا چاہتے تو وہسکی نکل سکتی تھی اور دوسرا بٹن دبانے سے جِن Gin لیکن ایک ڈبّہ اس میں بھی ہے جس کا نام مساج بوائے ہے۔ یعنی مالشیا۔ ہدایات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس ڈبّے میں ایک فرانک ڈالئے جو ہمارے روپے کے قریب قریب برابر ہے۔ اور پلنگ پر لیٹ جایئے تو یہ آپ کی مالش کرتا ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے ایک فرانک ڈالا اور پلنگ پر دراز ہوگئے۔ یک لخت اس نے تھرتھرانا شروع کر دیا۔ پلنگ کے نیچے کوئی مشین چلنی شروع ہوگئی۔ پندرہ منٹ تھرتھرانے کے بعد پیسہ ہضم تماشہ ختم۔ لیجیے مالش ہوگئی۔ ہم نے دو تین فرانک گنوائے۔ کُچھ مزا نہ آیا۔ مالش چیزے دیگر است۔ ہم نے خود کبھی نہیں کرائی۔ لیکن لاہور میں ٹی ہاؤس کے سامنے اپنے ہم عصر ادیبوں کو کُرسی پر بیٹھنے

مالش کراتے دیکھا ہے۔ مالشیا بدن کا جوڑ جوڑ اور بند بند دباتا ہے۔ ملتا ہے۔ گھِستا ہے۔ رگڑتا ہے۔ توڑتا ہے۔ جوڑتا ہے۔ چُپڑتا ہے اور گدگداتا ہے۔ بات ہوئی نہ!

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے بھلا لہو کیا ہے

فرانسیسیوں کو کھانے کا ذوق مشہور ہے لیکن ہمیں اِس کی داد دینے کا موقع زیادہ نہیں ملا کیونکہ ہمارے دوست مرزا نسیم بیگ ہمیں ہر روز نہیں تو ہر دوسرے روز اپنے ہاں لے جاتے تھے اور پاکستانی پکوان کھلاتے تھے۔ پاکستانیوں کی مدد و مدارات میں بیگ صاحب جو شائستگی اور وضع داری کا مجسّمہ ہیں، اتنی کاوش کرتے ہیں کہ عملاً



ہم اُنہیں پیرس میں پاکستان کا آنریری سفیر کہہ سکتے ہیں، البتّہ باہر کے ریستوران میں کھانے میں ایک روز غچّہ کھاگئے۔ مچھلی اور بیف اور مُرغ کو فرانسیسی میں کیا کہتے ہیں۔ اُس کی کُچھ شُد بُد ہمیں ہے اور جانتے ہیں کہ Poulet Rotl کا مطلب بھُنا مُرغ ہے۔ لیکن جس ریستوران میں ہم گئے وہاں تنہا Poulet نہیں بلکہ مینو میں Monettei Poulet لکھا تھا۔ صحیح صحیح یاد نہیں۔ یہ یا اِس سے کُچھ ملتا جلتا نام تھا۔ بھُوک بہت لگ رہی تھی اور چوزے کی تِکّہ بوٹی کرنے پر آمادہ بیٹھے تھے کہ بیرے نے میز سجانی شروع کر دی اور ہمارے آگے بڑے چمچے لا کر رکھ دیئے۔ مُرغ کو



چمچوں سے کھانے کا تجربہ نہیں۔ ہمارے دوست کو جو ہمارے ہمراہ تھے کُچھ شُبہ بھی ہوا کہ آرڈر تو غَلَط نہیں ہو گیا۔ پھر سوچا شوربے دار مُرغ ہو گا۔ اتنے میں ایک بڑا قدحہ ہماری میز پر آیا اور اُس میں کُچھ کوؤں کی چونچیں سی دِکھائی دیں اور سفید سفید شوربہ۔ بیرے نے نہایت نزاکت سے ڈوئیاں بھر بھر کر اُنہیں ہماری پلیٹوں میں ڈالا اور کہا۔

نوش فرمایئے۔ ہم نے مرسی بُکو کہہ کر دیکھنا شروع کیا کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ سمجھ میں آیا کہ یہ سیپیاں ہیں اور اِن کے اندر لجلجا سفید مادہ موتی نہیں تو گھونگے ہوں گے جسے یورپ کے لوگ رغبت سے کھاتے ہیں۔ ہمارا جی منغّض ہوا۔ پھر سوچا کہ تجربہ کرنا چاہئے۔ چمچہ بھر کر مُنہ کے قریب لائے تو اُس میں سے عجیب کھٹّی کھٹّی بُو آئی۔ آخر اُس کو وہیں رکھا اور بیروں کو حیران چھوڑ کر دام دے کر چلے آئے۔ پاس ہی دوسرا ریستوران تھا۔ اُس میں جا کر آملیٹ طلب کیا۔ اب بھی خیال آتا ہے تو جی میں جھرجھری سی اُٹھتی ہے۔ کتابیں اپنے آبا کی ہم نے یورپ میں بہت دیکھی۔ انڈیا آفس لائبریری میں جو اب بلیک فرائرز روڈ پر ایک نئ شاندار بلڈنگ میں منتقل ہو گئی ہے۔ برٹش میوزیم میں اور اسکول فار اورینٹل اسٹڈیز کے کتب خانے میں۔

لیکن ہمارا دِل سی پارہ نہ ہوا۔ یہ سوچ کر کہ ہمارے یہاں یہ خزانے ہوتے بھی تو کبھی کے لُٹ جاتے۔ کون اِن کو سینت سینت کر رکھتا اور اِن کی فہرست بندی کرتا اور دوسروں کو دیکھنے دیتا۔ اِن لوگوں نے کم از کم سلیقے سے محفوظ تو کر دیا اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے پاس تو خیر یہ تاجدار تھے لیکن جاپان اور چین کی کتابیں، نیپال اور تبّت اور کوریا کی کتابیں، افریقی زبان کی کتابیں، مخطوطے، تصاویر۔ جو یورپ جائے اِن کو دیکھ سکتا ہے ورنہ اکثر صورتوں میں اِن کی نقلیں یا عکس منگوا سکتا ہے۔ یہی حال آثار کا جانئے۔ اب تو خیر ہم بھی اپنی چیزوں کی قدر اور حفاظت کرنے لگے ہیں اور قاہرہ کا اپنا میوزیم بھی مِصری آثار سے اٹا پڑا ہے ورنہ ہم سے پہلے لوگوں کے لئے یہ چیزیں کنکر پتھر تھیں۔ مِصر میں یہ لوگ اہرام میں نقب لگا کر ممّیوں کے کفن اور زیورات کھینچ لے گئے۔ پیرس میں کنکارڈ کے میدان میں ایک پرانا مِصری نکیلا مینار نصب ہے جو محمد علی پاشا نے نپولین کو یا جانے کس کو نذر کر دیا تھا۔ لندن میں بھی ٹیمز کے کنارے پر کلوپیٹرا سوئی پڑی ہے جس کا بوجھ ایسا ہے کہ لانے والا جہاز ڈوب گیا تھا۔ بڑی مُشکل سے نکالنے والا نکال کر لایا۔ اور بھی کئی چیزیں دیکھیں جس پر لکھا تھا محمد علی پاشا نے تحفتہً دیا۔۔ ہمارے خیال میں یہ کہہ

دیتا ہو گا کہ ’’ارے میاں! لے جاؤ ہمارے کس کام کی ہیں یہ چیزیں۔۔۔ کتابوں کے بارے میں بھی ہم ایسی ہی بے نیازی برتتے ہوں گے۔



یونیسکو کی گیلری سے

یونیسکو میں ہمارا اپنا کام ختم ہو جاتا تھا تو ہم یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے جلسے میں جا بیٹھتے تھے جہاں ایک کونے میں وزیٹرز کے لئے کرسیاں رکھی ہیں اور کانوں میں لگانے والے چوگوں کا بھی انتظام ہے۔ وہ اِس لئے کہ تقریریں کئی زبانوں میں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر انگریزی اور فرانسیسی ہیں۔ لیکن ہسپانوی اور روسی میں بھی۔ جب کوئی انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں تقریر کرتا تھا تو ہم چونگا اُٹھا لیتے تھے۔ مترجم اور مترجمائیں کمال کی ہیں۔ تقریر کے ساتھ ساتھ ایسا با محاورہ رواں اور بے تکان ترجمہ نشر کرتی ہیں کہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ دو تین سال ہوئے جناب قدرت اللہ شہاب نے جو ۱۱۳ کے ایوان میں ۹۲ ووٹ حاصل کر کے چھ سال کے لئے ایگزیکٹو کے ممبر مُنتخب ہوئے، یہ قرارداد پیش کی تھی کہ عربی بھی بین الاقوامی زبان ہے۔

اِسے بھی انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ کے برابر درجہ دیا جائے اور اِس کے ترجمے کا بھی انتظام ہو۔ مغربی مُلکوں کی طرف سے بہت مخالفت ہوئی لیکن یہ عرب اور مسلمان مُلکوں کی آواز تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے مُلک بھی شہاب صاحب نے اپنے ساتھ ملا لیے اور یہ تجویز اصولی طور پر منظور ہو گئی۔ اب دقّت یہ آن پڑی ہے کہ ایسے مترجم کہاں سے لائیں جو روسی، فرانسیسی، ہسپانوی وغیرہ سے عربی میں اور عربی سے اِن زبانوں میں فرفر ترجمہ کر سکیں۔ تلاش جاری ہے۔

اِس تحریک کے بعد سے مُلکوں کے نمائندے شہاب صاحب اور پاکستان کی اور زیادہ عزّت کرنے لگے ہیں۔ بلکہ غیر رسمی طور پر اُن کو اپنا لیڈر سمجھتے ہیں۔ افریقی مُلکوں کے ممبر بے چارے مرعوب رہا کرتے تھے۔ شہاب صاحب نے انگولا، جنوبی افریقہ، روڈیشیا وغیرہ کے معاملوں میں آزادی کی تحریکوں کی ڈٹ کے حمایت کی تو اُن کو بھی حوصلہ ہوا۔ چنانچہ اِن کی ترجمانی بھی اُن کو کرنی پڑی۔ یونیسکو میں ہمارے ایک دوست پیرو کے رہنے والے ہیں۔ بہت بڑے ماہرِ معاشیات اور ماہرِ آثارِ قدیمہ ہیں۔ وہ ایک روز بتا رہے تھے کہ ہمارے لاطینی امریکہ کے نمائندے شہاب الدّین صاحب پر جان چھڑکتے ہیں۔ ہماری اکثر حکومتیں امریکہ کی کاسہ لیسی کرتی ہیں اور

نمائندے بے حوصلہ ہیں۔ شہاب الدّین صاحب جرأت کی بات کرتے ہیں تو یہ دِل میں بہت خوش ہوتے ہیں اور خود بھی ہمّت کر کے بولنے لگتے ہیں۔ ایشیائی اور عرب مُلکوں کے مسائل میں جہاں امریکہ کے ساتھ ہوا کرتے تھے یا بے تعلّق ہوا کرتے تھے اب عموماً ان کے ساتھ ووٹ دیتے ہیں۔ کئی بار تو یہ صورتِ حال ہوئی کہ امریکہ اور انگریز اور اسرائیل۔۔۔ بس یہی مخالف رہ جاتے ہیں۔ ہندوستان کا عجب حال ہے۔ پاکستان کی قرارداد کی حمایت کرے تب خرابی ہے کہ کریڈٹ پاکستان کو جاتا ہے۔۔۔ نا کرے تو ایشیائی اور افریقی مُلکوں کے سامنے شرمندگی ہوتی ہے۔ ایک دِن ہم نے دیکھا کہ شہاب صاحب نے تجویز پیش کی۔ اور تقریر کی۔ مسئلہ عربوں کا تھا۔ شہاب صاحب نے اسرائیل کے حامیوں کو خبردار کیا کہ کل کے رفیوجیوں کیمپوں کے نوخیز بچّے ہی ہیں جو آج کے کمانڈو اور گوریلے ہیں۔ جب تک فلسطین کے لوگوں کو بے وطن اور فوجیوں کیمپوں میں مجبور رکھا جائے گا گوریلے اور کمانڈو پیدا ہوتے رہیں گے۔ پہلے سے زیادہ پیدا ہوں گے۔ پہلے سے زیادہ پُر جوش ہوں گے۔ کیونکہ صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ اِس تقریر کی پُر زور حمایت مِصر کے نمائندے نے کی اور شہاب صاحب کا نام لے کر اُن کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ہندوستان کے نمائندے نے یہ کیا کہ مِصر کے تائیدی تقریر کی تائید اور تعریف کی۔ پاکستان یعنی اصل محرّک کا نام گول کر دیا۔

شہاب صاحب جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر عربوں کے مقبوضہ علاقوں میں گئے تھے اور اسرائیل کی دراز دستیوں کی شہادتیں فراہم کر کے لائے تھے، اس کا بڑا مُفید پہلو یہ نکلا ہے۔ مقبوضہ علاقوں اور ریفیوجی کیمپوں میں یونیسکو اور اقوامِ متحدّہ کے ادارہ UNRWA کی طرف سے عرب بچّوں کے بہت سے اسکول قائم ہیں۔ اِن میں جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں وہ یونیسکو کی منظور شُدہ ہیں۔ اسرائیل نے یہ کیا کہ اُن کو ہٹا کر اپنی ریڈریں لگا دیں جن میں اُن کا اپنا پراپیگنڈا اور اسلام کے بارے میں دل آزار باتیں تھیں۔ یونیسکو میں شکایت کی گئی تو اسرائیلی نمائندہ نے کہا یہ سب جھوٹ ہے۔ اب شہاب صاحب نے اُن کا پلندہ پیش کیا۔ اسرائیلی نمائندے نے کہا۔ یہ آپ کو کہاں سے ملیں؟ تب شہاب صاحب نے کہا کہ میں خود گیا تھا۔۔۔ کیسے گیا تھا؟ اِس سے آپ کو کیا مطلب ہے؟ بھیس بدل کر گیا تھا۔ اِس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ لیکن بات ثابت ہو گی اور ڈائریکٹر جنرل خود اسرائیل جا کر تصدیق کر کے آئے کہ شہاب صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ پھر ایک کمیشن کتابوں کو چھانٹے کے

لیے بیٹھا اور اسرائیل کی سو سے زیادہ کتابوں میں سے نوّے سے زیادہ کو رد کر دیا۔ اِن کی جگہ مِصر کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھانے کی ہدایت کی گئی۔ جس روز اب کے یہ مسئلہ یونیسکو بورڈ میں آیا اتّفاق سے ہم بھی موجود تھے۔ قرارداد پاکستان کی طرف سے تھی جس میں اُس کے شریک سیلون، افغانستان اور ہنگری بھی تھے۔ اور جس میں اسرائیل کی مذمّت کی گئی تھی کہ وہ بھی مِصری زبانوں کی کتابوں میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ اس پر وہ ترمیم اور اسرائیل کے نمائندے اور ڈاکٹر موشے اوی دار نے پیش کی تھی اور وہ ترمیم یہ تھی کہ اسرائیل کے بجائے شام کی مذمّت کی جائے۔ اِس پر لوگ بہت ہنسے۔ ترمیم بھی قرارداد کی صورت میں ہوتی ہے اور اِس کی تائید کسی نہ کسی کو کرنی پڑتی ہے لیکن یہ ترمیم ایسی مضحکہ خیز تھی کہ کوئی تائید میں ہاتھ اُٹھانے والا نہ تھا۔ صدر صاحب نے ایک بار دریافت کیا۔ کسی نے ہاتھ نہ اٹھایا۔۔۔ دوسری بار دریافت کیا۔ سب چُپ۔ آخر صدر صاحب نے کہا کہ تیسری بار پوچھ رہا ہوں۔ اِس کی تائید نہ ہوئی تو خود بخود مُسترد سمجھی جائے گی۔ آخر امریکی نمائندے نے بے دِلی سے ہاتھ کھڑا کیا۔ آخر اپنے حلیف کا اتنا تو خیال کرنا چاہئے تھا لیکن جب اُس پر رائے شماری ہوئی تو وہ بھی غیر جانب دار ہو گیا۔ اِس کے مُقابلے میں پاکستان

اور سیلون وغیرہ کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظوری ہوئی۔ برطانیہ، ہالینڈ وغیرہ مخالفت تو نہ کر سکے، غیر جانبدار رہ گئے۔

شہاب صاحب خود تو اپنے بارے میں بہت کم بتاتے ہیں لیکن خارجی ذریعے سے معلوم ہوا کہ اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں کی مُہم پر جاتے ہوئے جس میں بچنے کا امکان دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ یہ ایک وصیّت یونیسکو کے خزانچی کے پاس جمع کرا گئے تھے کہ میرا امکان بیچ کر پیسے الفتح کو بھیج دیے جائیں اور میرے بیٹے کو مِصر کے کسی اسکول میں داخل کر دیا جائے:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے

ختم شد